رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
PDFBOOKSFREE.PK

عنوان	صفحہ	مصنف
دستک	8	مشتاق احمد قریشی
گفتگو	10	عمران احمد
اقراء	22	طاہر احمد قریشی
بیت المقدس	22	الماس ایم اے
تحفہ خاص	58	محمد بشیر بشیر
نامکمل ہستی	63	راحیلہ تاج
پشیمان	68	اقبال بھٹی
بازی گر	74	حُسام بٹ
قصوروار	108	شہناز بانو
فلاپ ڈرامہ	118	انور فرہاد
انوکھا بندھن	128	مہتاب خان
گردش	144	
فرض	180	شعیب شیخ
سفر ہدایت	190	ناز سلو فرذی
اپنا جال	206	انجم فاروق ساحلی
بزم سخن	212	روبینہ احمد
خوشبوئے سخن	215	سیما بنت عاصم
ذوق آگہی	219	عثمان احمد
خطروں کا کھلاڑی	222	اے حمید
کترنیں		ادارہ

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ہر کمال کو زوال ہے......!

اللہ تعالیٰ کا یہ عدل کا نظام ہے کہ ہر کمال کو زوال ہے۔ ہر بلندی کے بعد پستی کا آنا لازمی ہے۔ جیسے رات کی تاریکی کے بعد دن کے اجالے کا آنا لازمی ہے۔ ایسے ہی ہر بدی برائی کے بعد اچھائی اور نیکی کا آنا بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا پیدا فرمایا ہے۔ اب شاید بدی کی تاریکی چھٹنے اور اجالا پھیلنے کا وقت قریب آنے کو ہے۔ کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو اس کا رخ شہر کی طرف ہو جاتا ہے۔

وطن عزیز کی تاریخ ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ گواہ ہے۔ جب جب حکمران وقت اقتدار کے نشے میں مدہوش ہونے لگتے ہیں تو ان کے زوال کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ وطن عزیز کی سیاسی تاریخ ایک شفاف آئینے کی مانند ہمارے سامنے ہے۔ جب جب جس جس حکمران کو یہ گمان ہوا کہ اس کی کرسی مضبوط ہے اسے کوئی نہیں ہلا سکتا تب تب وہ منہ کے بل گرا ہے۔ جب جنرل ایوب خان کو یہ گمان ہوا کہ اسے اور اس کے اقتدار کو کوئی ہلا نہیں سکتا اور انہوں نے من مانی کرنا شروع کی آئین و قانون کی دھجیاں اڑانا شروع کیں۔ اپنے لاڈلے بیٹے گوہر ایوب کو کھلی چھٹی دے دی کہ جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ قانون تمہارے گھر کی لونڈی ہے بالآخر انہیں منہ کی کھانی پڑی اور ذلت و رسوائی کے ساتھ رخصت ہونا ہی پڑا یہی حشر جنرل یحییٰ کا ہوا انہوں نے بھی قانون کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھا پھر وہی ہوا جو ہونا تھا انہیں بھی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پھر سونے کی چڑیا ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ لگی جب تک انہوں نے قانون کو قانون سمجھا اس کا احترام ملحوظ رکھا انہوں نے ملک پر ہی نہیں بلکہ عوام کے دلوں پر راج کیا اور جب انہوں نے اقتدار کی کرسی کو مضبوط سمجھا اور خود کو قانون سے بالاتر سمجھا تو انہیں بھی قانون نے ہی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور ساری قانون دانی دھری کی دھری رہ گئی۔ کہتے ہیں کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جب چلتی ہے تو وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصور تک انسان نہیں کر سکتا۔ جنرل ضیاالحق نے اقتدار اپنی بندوق کے زور پر حاصل کیا تھا اور تاثر دیا کہ اللہ کی مضبوط رسی کو پکڑ رکھا ہے جب انہوں نے اللہ کی رسی کو چھوڑ کر امریکی رسی کو مضبوطی سے تھاما تو ان کے دماغ بھی آسمان سے باتیں کرنے لگے وہ سمجھنے لگے کہ وہ خود ہی قانون ہیں سفید و سیاہ کے مالک ہیں' جو چاہیں کریں اللہ کے بجائے انہوں نے اپنے سر پر امریکا کا ہاتھ مضبوط جانا اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر قانون نے ان کے نیچے سے ہی نہیں بلکہ اوپر ہی اوپر ان کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ اللہ کی بے آواز لاٹھی کام کر گئی۔ جب میاں نواز شریف کو اللہ نے اقتدار نصیب کیا تو وہ بھی بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ان کی کرسی مضبوط ہے۔ انہیں کوئی ہلا نہیں سکتا اور انہوں نے بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کوشش کی تو ان کے ہاتھ بھی جل گئے اور تخت ان کے نیچے سے سرک گیا۔ پھر ایک نیا دور شروع ہوا پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی کو اقتدار نصیب ہوا جب تک وہ قانون اور آئین کی پاسداری کرتی رہیں حکومت کرتی رہیں لیکن جیسے ہی انہیں یہ گمان ہوا کہ ان کی کرسی ان کا اقتدار مضبوط ہے خود کو قانون سے ماورا جانا تب ان کا تختہ بھی الٹ دیا گیا۔ پھر دوبارہ میاں نواز شریف کی لاٹری لگ گئی اور اقتدار انہیں نصیب ہو گیا۔ چونکہ انہوں نے اس سارے عرصے میں اپنی بے تختی اور بے توقیری قیدی سے کچھ سبق حاصل نہیں کیا تھا۔ اب ان میں اپنے سرپرست ضیاالحق کی خودسری خودمختاری کی خوبو خوب بس چکی تھی۔ انہوں نے اب زیادہ کھل کر اقتدار کے تخت پر

بیٹھتے ہی خود کو ماورائے قانون سمجھا اور جو جی میں آیا جیسا چاہا کرنا شروع کر دیا۔ قانون کو تو ہر حکمران اپنے گھر کی لونڈی سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ خود قانون ساز ادارے کا رکن ہونے کے باعث سمجھتا ہے کہ قانون کا کیا ہے یہ تو ہم نے خود ہی بنایا ہے۔ اس کا اطلاق عوام پر ہوتا ہے۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں اور قانون سازوں پر نہیں ہوتا ہاں اگر کسی طرح ہوتا ہے تو حکومت مخالفین پر ہوتا ہے۔ دوسری بار بھی میاں نواز شریف کو قانون سے کھیلنے اور خود کو ماورائے قانون سمجھنے کی سزا ملی۔ اب کے انہیں کڑی سزا ملی جلاوطنی بھی جھیلنی پڑی بدنامی کا داغ بھی سہنا پڑا اور ان کی حماقت یا کم فہمی یا خود کو قانون و آئین سے ماورا سمجھنے کی خوب سزا ملی اور اس کے نتیجے میں ایک بار پھر حکومت پر فوج قابض ہوگی اور جنرل پرویز مشرف اپنی دونوں بغلوں میں دو کتے کے پلے دبائے نمودار ہوا۔ اس کا سارا دور حکومت ان ہی لوگوں کے عیش کا دور رہا۔ جنہوں نے ان سے ان کے کتے کے پلوں کی طرح وفاداری نبھائی اور جتائی اور جب انہوں نے بھی خود کو قانون سے ماورا جانا اور خود ہی قانون بن گئے۔ جو انہوں نے کیا وہی درست مانا جانے لگا۔ قانون ساز ادارے تو ادارے خود قانون اور عدل کرنے والے اداروں کو وہ اپنی انگلیوں پر نچانے لگا لیکن کب تک پھر اس کے کمال کو بھی زوال نے آ پکڑا اور اس نے اپنے مشیروں کی حماقت انگیز مشوروں پر اور خود کو قانون سے ماورا سمجھنے پر قانون سے براہ راست ٹکر لیتے ہوئے چیف جسٹس آف پاکستان پر اپنا مکروہ ہاتھ ڈال دیا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ صاحب اقتدار و اختیار ہوتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بے بس و مجبور کر دیا۔ اقتدار چھوڑنے پر اس کے چہرے پر جو سیاہی مل جا چکی ہے جو بدنامی بے عزتی اسے نصیب ہو رہی ہے تو ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اب موجودہ حکمرانوں نے تقریباً ساڑھے تین سال کی طویل مدت جیسے تیسے تو گزاری ہے لیکن اس طویل مدت اقتدار نے انہیں بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ان کی کرسی ان کا اقتدار مضبوط تر ہے۔ انہیں کوئی کسی طرح ہٹا نہیں سکتا۔ قانون کی کیا اہمیت ہے۔ قانون ساز ادارہ تو ہمارا اپنا ہے جب چاہیں جو چاہیں قانون بنایا جا سکتا ہے۔ حکمران وقت کے حواریوں مشیروں نے ان کے دائیں بائیں موجود کو شادیوں نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں ہیں اور انہیں سب اچھا ہے سب قابو میں ہیں کی نوید در نوید سناتے رہتے ہیں۔ یہاں ہمیں وہ قصہ یاد آ رہا ہے جب ایک اندھے حافظ جی کو ان کے ایک معتقد نے رات کو کھانے پر بلایا تو وہ اپنے ایک شاگرد کو ساتھ لے گئے کھانا کھا کر جب واپس لوٹنے لگے تو راستے میں ایک گہری کھائی پڑتی تھی جب حافظ جی اس کھائی کے قریب پہنچے تو شاگرد نے انہیں اطلاع دی حافظ جی کھائی حافظ جی جو بے چارے نابینا تھے۔ بولے ہاں بیٹا خوب کھائی۔ لڑکا بار بار کہتا رہا لیکن حافظ جی شاگرد سے یہی کہتے رہے کہ خوب کھائی۔ اور یہ کہتے کہتے وہ کھائی میں گر گئے۔ ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ موجودہ حکمرانوں کے کمال کے زوال کا وقت شروع ہو رہا ہے۔ ان کی بلندی پستی میں بدلنے کو ہے یہ بھی وہی حماقت اور نادانی کر رہے ہیں جو ان کے پیش رو حکمران کر چکے ہیں۔ قانون سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے اب یہ قانون سے ٹکرانے جا رہے ہیں بلکہ ٹکرا چکے۔ عدالت عظمیٰ کے احکام کو رد کیا جا رہا ہے اور اپنے من مانے احکام کی تعمیل کرائی جا رہی ہے۔ جس حکام کے لیے عدالت عظمیٰ نے حکم صادر کر دیا حکمرانوں نے اس حکم سے سرتابی کرتے ہوئے ان حکام کی ہی چھٹی کر دی۔ اللہ خیر کرے ملک و قوم کی حفاظت کرے۔ دیکھیے کہ آسمان کیا رنگ دکھاتا ہے۔

گفتگو

عمران احمد

دنیا وآخرت کی بھلائی کا ذریعہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چار چیزیں ایسی ہیں جسے میسر آ گئیں اسے دنیا وآخرت کی بھلائی حاصل ہوگئی۔ (۱) شکر گزار دل (۲) خدا کو یاد کرنے والی زبان (۳) مصیبت پر صبر کرنے والا بدن (۴) ایسی بیوی جو اپنی جان اور شوہر کے مال میں خیانت نہیں کرتی۔'' (بیہقی، مشکوٰۃ)

عزیزان محترم...... سلامت باشند

یہ عید قرباں کا مہینہ ہے جو سنت ابراہیمی کی یاد دلاتا ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں اپنے لخت جگر نورِ نظر کو قربان کر کے دی۔ امتِ مسلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر آج تک اس روز جانور ذبح کر کے اس قربانی کی یاد تازہ کر رہی ہے اور رہتی دنیا تک کرتی رہے گی۔ یہ قربانی ہے کیا اس کا فلسفہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیوں خلیل اللہ علیہ السلام سے ان کی سب سے پیاری چیز کی قربانی مانگی آج ہم سب کچھ فراموش کر چکے ہیں، ہمارا مقصد اب مہنگے سے مہنگا جانور خرید کر اپنے ڈیپ فریزر اور فریج بھرنا رہ گیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق عید کی رات صرف کراچی الیکٹرونک مارکیٹ میں ڈیپ فریزر کی ریکارڈ فروخت ہوئی۔ سہراب گوٹھ کی مویشی منڈی میں اربوں روپے کے جانور فروخت ہوئے سرکاری اداروں جائز اور ناجائز طریقے سے صرف ایک منڈی سے 15 کروڑ روپے روزانہ کمائے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف ایک سال کے اندر سیکڑوں افراد نے غربت کے باعث اجتماعی خودکشیاں کیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس کی سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ ایک اللہ کے ولی کا واقعہ ہے کہ وہ حج پر گئے طواف کعبہ کے بعد جب وہ رات سونے کے لیے لیٹے تو انہوں نے اپنی چھت پر دو فرشتوں کو گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ ایک فرشتہ دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ اس بار کتنے مسلمان حج کے لیے آئے تو دوسرے نے تعداد بتاتے ہوئے کہا کہ اس بار اللہ تعالیٰ نے کسی کا حج قبول نہیں کیا البتہ بغداد کا ایک موچی جو حج پر نہیں آیا اس کی وجہ سے سب کے حج قبول ہو گئے۔ وہ بزرگ خود بغداد کے رہائشی تھے انہیں اشتیاق پیدا ہوا تو وہ بغداد پہنچے اور موچی کو تلاش کیا۔ موچی بڑی کمپرسی کی حالت میں تھا بزرگ نے ان سے حج کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ زمانے سے پیسے جوڑ رہا تھا اس سال اتنی رقم پس انداز ہو گئی تھی کہ وہ حج پر جا سکے۔ ایک روز جب وہ شام گھر گیا تو پڑوس سے سالن کی اشتہا انگیز خوش بُو آئی اس نے بچے کو پیالہ دے کر پڑوس میں بھیجا کہ تھوڑا سا سالن لے آؤ۔ پڑوسیوں نے بچے کو انکار کر دیا پھر وہ خود گیا اور کہا کہ آپ نے پڑوس کا حق ادا نہیں کیا جس پر پڑوسی نے کہا کہ یہ کھانا آپ کے لیے حرام ہے تو میں نے پوچھا ایسا کیا ہے جو میرے لیے تو حرام تمہارے لیے حلال ہے۔ تب پڑوسی نے کہا کہ میرے گھر چار دن کا فاقہ تھا آج میں نے ایک مردار جانور کا گوشت پکایا ہے تاکہ میرے بچے پیٹ بھر کھانا کھا سکیں۔ حدیث ہے کہ جب بھوک سے زندگی کے لالے پڑ جائیں تو مردار حلال

ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا میں نے سوچا جب میرا پڑوسی بھوکا مر رہا ہے میں خانہ خدا میں کیا منہ لے کر جاؤں گا میرا حج کیسے قبول ہوگا۔ سو میں نے حج کے لیے رکھی رقم پڑوسی کو دے دی۔ اگر اللہ نے چاہا تو دوبارہ رقم جمع کر کے حج پر جاؤں گا۔ بزرگ نے اسے مبارک باد دی کہ اس کا حج بغداد میں رہتے ہوئے قبول ہو گیا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں کا حج قبول ہو گیا ہے۔

فرصت کی چند گھڑیوں میں سے کچھ لمحے کشید کر کے اس واقعہ پر ضرور غور کیجیے گا کہ کیا ہم نے واقعی سنت ابراہیمی علیہ السلام پر عمل کیا ہے؟

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب! السّلام علیکم' بک اسٹال پر ماہ نومبر کا تازہ پرچہ دیکھ کر میرے دل کو بڑی خوشی ہوئی ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر دلی مبارک باد قبول کریں۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے یہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ''نئے افق'' دن بدن ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی قابل تحسین ہے۔ یہی بات ہمیں خط لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر ہمیں پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے یہی ایک واحد رسالہ ہے جو زندہ اور دل کش تحریریں پیش کرتا ہے۔ میں نئے افق کا ایک بہت ہی پرانا پرستار ہوں۔ پرچے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں ایسا جاذب نظر پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ آپ مجھ سے ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود میرے دل کی دھڑکنوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ ہر عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہے۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ فٹ ہو۔ خدا نے آپ کو محنت کا ثمر عطا کیا ہے۔ جس انداز سے آپ نئے افق کے لیے محنت کرتے ہیں۔ اقراء' دستک' گفتگو' بزم سخن اور خوش بو سخن اچھے سلسلے ہیں تحریروں میں بیت المقدس اچھی تحریر تھی۔ کہانیوں میں غلط راستہ' کالی عورت' افتاد رات کے راہی' خوش بو موسم' ذوق آگہی اور سستی زندگی ان تحریروں سے میں بے حد متاثر ہوا۔ قلم کاروں کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کچھ غزلیں ارسال خدمت ہیں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں بشرطِ آپ کا تعاون ساتھ رہے امید ہے کہ آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ آپ کے گلشن کے پھول ہمیشہ مسکراتے رہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی۔ محترم عمران بھائی' السّلام علیکم۔ امید قوی ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے اور یقیناً ہمیں فراموش کیے بیٹھے ہوں گے۔ ہم آپ کے ذہن کو جھنجوڑنے کے لیے دوبارہ آن دھمکے ہیں۔ حالانکہ لحظہ لحظہ کروٹ بدلتے خونخوار حالات کے عفریت نے دل و دماغ کو بھنبھوڑ کر رکھ دیا ہے کہ ہر اچھا خیال خون خون ہو چکا ہے ہر اچھی امید ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے ہر اچھی خواہش کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اپنی ہنسی بھی کسی ویران کھنڈر میں کسی پھڑ پھڑاتی ہوئی چمگادڑ کی پیدا کردہ گونج معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں کافی مہینوں سے انسانی زندگی کی ارزانی نے دل و دماغ کی دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے کہ تخلیق کی زرخیزی جھاڑ جھنکاڑ میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک خلقت پر بیالیس سال تک طمطراق سے حکومت کرنے والے معمر قذافی کی موت کا آنکھوں دیکھا منظر جس شان سے ٹی وی اسکرین پر نشر ہو رہا ہے تو شک ہونے لگا ہے کہ کیا اس کرۂ

ں پر انسان ہی بستے ہیں یا پھر کسی اور دنیا کی مخلوق نے ہم پر قبضہ کرلیا ہے۔ یا پھر ہم نے انسانیت کو کسی تورا بورا ی پہاڑی میں دفنا کر اس کے بھی پرخچے اڑا دیے ہیں۔ اب تو جنگل ہی جائے امان معلوم ہوتے ہیں کہ وہاں نے والا کوئی درندہ اگر درندگی دکھاتا ہے تو وہ اس کی فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ انسان کے اندر سے تو نسانیت بھاپ بن کر پتا نہیں کون سی خلا میں تحلیل ہوگئی ہے۔ عمران بھائی آپ بھی شاید پریشان ہوگئے ہوں گے کہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ہمیں ایک ہی پلیٹ فارم میسر ہے اس لیے دل کی بھڑاس نکال بیٹھے۔ پچھلے کئی ماہ سے غیر حاضری کے باعث بہت سی باتیں کرنے سے رہ گئیں اور بہت سی باتیں بتانے سے رہ گئیں جو دماغ کی سلیٹ سے اب مٹ چکی ہیں۔ اس لیے اب کچھ نئی باتیں کرلیں گے۔ بہت سے دوستوں کی یکار پر انہیں جواب دینے سے قاصر رہی۔ جس کے لیے دست بستہ معافی کی خواستگار ہوں کہ کچھ حالات کی سنگینیاں تھیں جو روڑے بن کر راہ میں اٹکتی رہیں لیکن آپ چاہنے والوں کی دعائیں تھیں جواب ایک بار پھر قلم تھامے حاضرِ خدمت ہوں۔ شہناز باجی کی محبت میرے لیے سرمایہ بن چکی ہے۔ شہناز باجی میں ضرور آپ سے فون پر بات کروں گی۔ بس ابھی کچھ افراتفری کی کیفیت ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے گھر کی تبدیلی کا کچھ ایسا جان لیوا چکر چل رہا ہے کہ سامان کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ شفٹ ہو رہا ہوتا ہے۔ مسائل سے نمٹنے میں ابھی تھوڑا وقت اور باقی ہے چیزیں بھی اپنے ٹھکانے پر آجائیں اور فراغت نصیب ہوجائے تو بات بھی ضرور ہوجائے گی۔ نئے افق کا سرورق اب کافی ٹائم سے قابلِ تبصرہ نہیں رہا۔ ماڈلز اور فنکاراؤں کی تصاویر پر ہم کیا تبصرہ کریں۔ کوئی تاثر دیتا ہوا کوئی خیال اجاگر کرتا ہوا سرورق دیکھے ہوئے تو مدت گزر گئی۔ دستک میں مشتاق انکل کی تشویش اللہ خیر کرے آج ہر پاکستانی کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں کی بالکل درست نشاندہی اور صحیح ترجمانی معلوم ہو رہی ہے۔ روزانہ نئے نئے حالات، نئی نئی ریشہ دوانیاں، بین الاقوامی سطح پر تنہا ہوتا اپنا وجود، انفرادی طور پر تہس نہس ہوتی قدریں، قومی سطح پر دست و گریباں ہوتی کیفیت، بدعنوانیوں کا بول بالا ہے۔ جبھی ترقی کی ہر سطح پر ہمارا منہ کالا ہے۔ تنزلی کی سطح کا معیار انتہائی اعلیٰ ہے۔ ہر طرح کی خوش فہمی سے جینے کا لطف دوبالا ہے۔ ورنہ حقیقت میں دیکھا تو لگتا ہے کہ کس عفریت نما مکڑی کا جالا ہے جس نے قوم کو پھنسا ڈالا ہے۔ ”گفتگو“ میں خطوط رونقیں بڑھا رہے تھے۔ نازش میری جان اللہ تمہیں صحت اور ہمت دونوں عطا کرے۔ کاش میں بھی اپنی زندگی میں تمہاری طرح فعال ہوتی۔ رات سونے کے لیے آنکھیں بند کرنے سے پہلے دل کو تسلی چاہیے ہوتی ہے کہ دن رائیگاں تو نہیں چلا گیا۔ انسان کسی مقصد میں جتا ہوا ہو تو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔ تگ و دو اور جدوجہد زندگی میں لازمی شامل ہونی چاہیے۔ ورنہ بے چینی اور بے ایمانی کا غبار دل کی فضا کو آلودہ کرکے بے چینیوں کے سونامی قلب کے ساحلوں سے ٹکراتے رہتے ہیں اور زندگی سے سکون کا وجود مٹ کر رہ جاتا ہے۔ بخش انکل بھی بڑی محبت سے یاد کرتے رہے ہیں۔ ان کی ذاتی پریشانیوں سے پچھلے دنوں آگاہی ہوئی تھی اللہ کرے ان کے مسائل جلد حل ہوجائیں۔ ان جیسے نیک اور سادہ دل لوگوں کے لیے ایسے مسائل بس اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ جس سے وہ یقیناً اپنی سادہ لوحی کے ہتھیار سے بخوبی نمٹ لیں گے۔ ان شاء اللہ۔ عبداللہ شاہد صاحب کو خواتین کی گفتگو میں کمزور ہوتی حقیقت پر تشویش ہے۔ یہ بات کافی مزے دار ہے اور خوش آئند بھی کہ تعصب کے بجائے وسعتِ دل کا یہ مظاہرہ ہمارا دل بڑا کر گیا۔ لگے رہو بھائی ہماری خیر خواہی میں کہ نیکیوں میں شمار ہوتا آپ کا یہ عمل اجر کا

باعث بنے گا۔ اقراء ہمارے لیے ایک ایسے پھولوں کے گلدستے کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی خوش بو سے ہم اپنی ذاتی زندگی کو معطر کرسکتے ہیں جس کی آب و تاب سے ہم اپنی معاشرتی زندگی کو رونق افروز کرسکتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں زندگی کو سنوارنے کا فارمولا موجود ہے جو اوپر بیٹھے اس سائنس دان نے ہمارے لیے وضع کرکے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے کہ۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

ہماری بدنصیبی ہے کہ سب سے زیادہ نوازی گئی قوم ہونے کے باوجود بھی بحیثیت مسلمان خود کو منوانے کے بجائے رسوا کر رہے ہیں۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین۔ ”بیت المقدس“ تاریخ کا وہ آئینہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے، ہمیں اپنی شبیہ اس آئینے میں اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ حیرت اور تاسف کی اک لہر سی دل میں اٹھتی ہے کہ اسلاف کی ایسی شاندار اقدار کے امین بننے کے باوجود ہم خود کو ذلت کے کن گڑھوں کے حوالے کرچکے ہیں۔ ہم ہیروں کی طرح جگمگاتے اصولوں کے وارث اپنی بے اصولیوں کے ہاتھ ہی برباد ہوچکے ہیں۔ اللہ ہمیں ہر انفرادی اور ہر اجتماعی سطح پر سنبھلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ ”رات کے راہی“ ایسی شاندار تحریروں میں شمار ہوتی ہے جن کی اصل خوب صورتی ان کے اختتام میں پنہاں ہوتی ہے۔ جو پڑھنے والے کے ذہن کو اچانک سے جھنجوڑ دیتی ہیں۔ سیدھے سادے سے لفظ فقط عقل کی کرشمہ سازی سے جادو اثر بن جایا کرتے ہیں۔ ”خوشبو موسم“ ایک انتہائی سنگین فیصلے کی داستان تھی لیکن جو ذرا جلد بازی سے کرلیا گیا ورنہ ہیلن جان سے نہ جاتی۔ ”غلط راستہ“ بھی عقل کی جادوگری کا شاخسانہ تھی۔ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔ ایسے مصرعے ایسی ہی سچویشن پر فٹ آکر بیٹھتے ہیں۔ قتل جیسے مشکل فعل کے لیے مشکل راہ اختیار کرکے خود کو بچانے کی قاتل کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی یہ تحریر بھی دلچسپ رہی۔ ”آزادی پسند“ ایک ایسے مغرور شخص کی کہانی تھی جو اپنے سے کسی کم تر کے ہاتھوں بلیک میل ہونا قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر تقدیر نے اس کی ہر تدبیر کو الٹ کرکے اسے پھر سے بلیک میلنگ کے شکنجے میں لا پھنسایا اور وہ بھی ایک کمزور عورت کے ہاتھوں افسوس! ”خطروں کا کھلاڑی“ اپنے عنوان کے برعکس اے حمید کا شاندار سفرنامہ ثابت ہوئی جس میں معلومات کا قیمتی خزانہ ہی چھپا ہوا نہیں تھا بلکہ احساسات کا سمندر بھی موجزن تھا۔ موسموں کو محسوس کرنے کا ایسا لطیف ڈھنگ پڑھنے کو ملا کہ طبیعت سرشار ہوگئی۔ لوگوں سے تعلقات کو ایسے لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا کہ دل جھوم اٹھا۔ پرانے دور کی سادگی اور پاکیزگی کے خوش نما قصے۔ احساس محرومی کو بے دار کرگئے۔ ایسی لطیف تحریریں ایک جادو سا کردیتی ہیں۔ ”پہلی بارش“ پہلی محبت سے وابستہ جذبات کی عکاس تحریر تھی۔ تقدیر کے ہاتھوں بڑی بڑی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور مٹ جایا کرتی ہیں۔ یہ تحریر بھی ایسی ہی ایک کہانی پر مبنی تھی۔ ”پرچی مافیا“ کراچی کے امن اور سکون کو گھن کی طرح کھاتی بھتہ خوری کی دیمک کے حوالے سے سادہ مگر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی تحریر تھی۔ اللہ ہم سب کو بری گھڑی سے بچائے رکھے۔ شہناز باجی کی تحریریں سادگی اور اثر انگیزی کا مرقع ہوتی ہیں۔ کردار کے احساسات کو قلم کے ذریعے مجسم کردینے کا گر انہیں آتا ہے کہ سطر سطر بکھری ہر جذباتی کیفیت کو ہم صرف پڑھ نہیں رہے ہوتے بلکہ خود اس کا حصہ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ مظلومیت اور بربادی کی یہ داستان دل کو واقعتاً رلا گئی۔ ایک لمحے کی لغزش نے زندگی تہس نہس کرکے رکھ

دی۔

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم۔ عمران بھائی اور اراکین نئے افق کی خدمت میں سلام۔ میں گفتگو کے اجلاس کی روداد لے کر آپ سب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ اتفاق سے اس مرتبہ کورم تقریباً پورا تھا کارروائی کا آغاز حدیث پاک سے ہوا۔ سب سے پہلے عمران صاحب نے اسپیکر کی حیثیت سے شرکاء کو ملکی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ان کی اجازت سے سب سے پہلے این شاہین صاحبہ اجلاس سے مخاطب ہوئیں۔ پہلے انہوں نے اپنی غیر حاضری کی وجوہات بیان کیں وجوہات ایسی تھیں کہ دل ہی دل میں سب لوگوں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعد میں این شاہین نے مختلف تحریروں پر اپنی رائے دی ان کے بعد جناب ریاض حسین قمر صاحب مخاطب ہوئے اور اپنی قیمتی آراء سے سب کو مستفید کیا انہوں نے بھی اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے اجلاس میں شرکت نہ کرنے پر معذرت کی (جو قبول کرلی گی) پھر انہوں نے فرداً فرداً تمام ارکان اسمبلی کی خیریت دریافت کی تعریفی کلمات کہے ملکی صورتِ حال پر مختصراً روشنی ڈالی۔ پھر عبدالحکیم ساجد صاحب نے اسپیکر صاحب کی مزاج پرسی سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے محکمہ ڈاک کو آڑے ہاتھوں لیا مگر جلد ہی بات ختم کردی اس ڈر سے کہیں اسمبلی کا کوئی ممبر محکمہ ڈاک سے تعلق رکھتا ہو اور انہوں نے سابقہ تبصروں پر تبصرہ کیا اور آخر میں تمام ارکان کی کارکردگی کو سراہا۔ یہ کیا؟ انہوں نے آخری سلام دے ڈالا۔ بھائی آپ سے کس نے کہا کہ اسمبلی ختم ہو رہی ہے خدا آپ کو بھی زندگی دے اور ہماری اسمبلی کو بھی۔ اب باری تھی ناز سلوش ذشے کی (اللہ اتنا مشکل نام لیتے ہوئے کچھ حرف منہ میں رہ گئے) انہوں نے غیر حاضری کی وجہ اپنی تعلیم کو بتایا۔ بھئی اس اسمبلی کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ تمام ارکان پڑھے لکھے اور اصلی ڈگری والے ہیں۔ وقفہ سوالات میں انہوں نے ریاض بٹ صاحب سے اختلاف کے باوجود قیمتی مشورہ بھی دیا۔ آخر میں اجلاس کی کارکردگی کو سراہا اور ممبران کو دعا کے لیے کہا۔ این شاہین ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا تعالیٰ تمہیں اپنے ہر مقصد میں کامیاب کرے۔ ان کے بعد محمد اسلم جاوید صاحب نے بھی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ آگے ریاض بٹ صاحب موجود تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار میں تحمل کا مظاہرہ کیا اور اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے خوب صورت تبصرہ پیش کیا۔ محترمہ شہناز بانو پہلے تو ملکی حالات پر جذباتی نظر آئیں۔ ذرا سنبھلیں تو ساتھی ممبران کی خیریت دریافت کرنے میں مصروف ہوگئیں۔ مجاہد ناز عباسی صاحب نے مختصر تبصرہ کیا آپ بھی شاید میری طرح نئے ہیں ناں! آگے تشریف فرما تھے عبدالمالک کیف صاحب جو ملکی حالات پر پیچ و تاب کھاتے نظر آئے اور کہا میرا بس چلے تو ایسی صورت حال تک پہنچانے والوں کو لمحہ ضائع کیے بغیر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دوں۔ ارے بھائی اس طرح کی باتیں سب کے سامنے نہیں کرتے جیل انتظامیہ کے ناراض ہونے کا ڈر ہے ان کا کہنا ہے پہلے ہی ہمارے پاس اتنے قیدی ہیں خدا جانے ہم ان کا کھانا کیسے پورا کرتے ہیں آپ اور قیدیوں کی آفر کر رہے ہیں۔ آگے چل کر ریاض صاحب نے عین غین سے حروفِ تہجی شروع کی لیکن یہ کیا وہ آگے بھول گئے آئندہ پوری حروفِ تہجی یاد کر کے آنی ہے۔ اب میری باری تھی میں تو اس ڈر سے کہ میری کسی بات سے اراکین اسمبلی واک آؤٹ نہ کر جائیں اختصار پر اکتفا کیا۔ سید عبداللہ شاہد نے تمام تحریروں پر کھل کر اور بھرپور طریقے سے دلائل دیے اور دو لکھاری خواتین کی تحریروں کا جس طرح تقابلی جائزہ پیش کیا۔ یقیناً ان کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا۔ اب باری تھی محترم فقیر محمد بخش صاحب کی انہوں نے حسبِ عادت تمام اراکین کے لیے ڈھیروں دعاؤں سے آغاز کیا اور تمام تحریروں کا مفصل جائزہ پیش کیا۔ آخری ممبر محمد عبداللہ صاحب تھے انہوں نے ملکی سلامتی کے لیے دعائیں کی اور غیر حاضر اراکین سے گلے شکوے۔ یہ تھا گفتگو میں ہونے والے اجلاس کا حال۔ اس کے ساتھ ہی اجلاس اگلے ماہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ (کوئی بات کسی کو ناگوار گزری ہو اس کے لیے معذرت)۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السّلام علیکم! ماہ نومبر 2011ء کا تازہ شمارہ اس بار جلدی یعنی 20 اکتوبر کو مل گیا۔ سرورق دیکھ کر بے اختیار یہ شعر نوک قلم پر مچل گیا۔

چمن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
تمہارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا

آگے بڑھے تو لسٹ پر نظر پڑی۔ اس بار بھی میری کہانی غائب ہے۔ لگتا ہے ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب امریکہ سے نجات کا راستہ بتا رہے ہیں لیکن ہمارے ناعاقبت اندیش حکمرانوں کو کون سمجھائے کہ پہلے انہیں چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے پڑیں گے۔ اپنے بے جا اور شترِ بے مہار اخراجات کو نکیل دینی پڑے گی۔ امریکہ صرف اپنے مفاد کی خاطر سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ ہمارا دوست کبھی نہیں رہا اور نہ کبھی دوست بن سکتا ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے ہمارے کاندھے استعمال کر رہا ہے اور ہمیں دھمکیاں بھی دے رہا ہے۔ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اس بات یا مقولے پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد قدم رکھا اپنی محفل میں۔ یہ آپ کی مہربانی ہے کہ مجھے ہر ماہ شامل محفل کرتے ہیں۔ میری پڑوسن این شاہین بہن کافی عرصے بعد آئیں اور اچھا تبصرہ لکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کامل عطا فرمائے آمین۔ ریاض حسین قمر جہلم بھی کافی عرصے بعد نظر آئے۔ بھائی میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ عبدالحکیم ساجد آپ کا بھی شکریہ۔ اس بار آپ کا تبصرہ بھی قابل تعریف ہے۔ بہن شہناز بانو آپ کا طویل اور جامع تبصرہ بھی اچھا لگا۔ آپ کی کہانی کڑی مسافت بھی پسند آئی۔ آپ کے لکھنے کا انداز دل موہ لیتا ہے۔ سید عبداللہ شاہد آپ کا خط اور کہانی کالی عورت کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ واقعی آپ بھی ڈوب کر لکھتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ فقیر محمد بخش انگاہ صاحب دعاؤں میں یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کا تحریر کردہ شعر بھی سیدھا دل میں اتر گیا۔ جواب میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ باقاعدگی سے آتے رہیے۔ آپ کے دم قدم سے محفل میں رونق اور برکت ہے۔ ناز سلوش ذشے! ارے میں نے تو آپ کی بات پر کافی عرصے سے عمل شروع کردیا ہے۔ یعنی ایک ہی بار کہانی پوری کر رہا ہوں۔ ویسے تو میں بالکل سادہ لفظوں میں کہانی بیان کرتا ہوں آئندہ اور بھی خیال رکھوں گا۔ آپ نے اپنی غیر حاضری کی بڑی معقول وجہ بیان کردی۔ اب بات ہو جائے باقی کہانیوں کی۔ "بیت المقدس" الماس ایم اے کی اصل اسلام سے روشناس کرائی ہوئی تحریر ہے۔ خاص کر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا "تم میری لغزش درگزر کرنا اللہ پاک تمہاری لغزش درگزر کرے گا۔ کیونکہ اس لباس میں اور اس سواری پر بیٹھ کر جس غرور اور نخوت نے میرے دل میں راہ پائی ہے۔ وہ شاید تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتی۔ آج ہمارے حکمران کس طرف جا رہے ہیں؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سید احتشام کی تحریر "خوش بو موسم" ایک حساس تحریر ہے اور انجام کے لحاظ سے منفرد۔ "غلط راستہ"

زاہد حسین‘ کی حسد اور رقابت کے گرد گھومتی ایک اچھی کاوش ثابت ہوئی۔ اے حمید کی کہانی ’’خطروں کے کھلاڑی‘‘ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ’’سود وزیاں‘‘ ڈاکٹر سید سعید نقوی‘ ’’پرچی مافیا‘‘ عارف شیخ‘ ’’افتاد‘‘ ناز سلوش ذیشے اور ’’سستی زندگی‘‘ انجم فاروق ساحلی‘ کی تحریریں بھی پسند آئیں۔ اب بات کرتے ہیں باقی سلسلوں کی بزم سخن میں رانا محمد صفدر‘ صائمہ خان کے اشعار اچھے لگے۔ خوش بو سخن میں تمام کلام اور انتخاب اچھا ہے لیکن محمد شفاعت حسین صابر لنگاہ‘ محمد اسلم جاوید‘ ریحانہ سعیدہ‘ فقیر محمد بخش لنگاہ اور طاہرہ جبیں تارا نمبر لے گئے۔ ذوق آگہی میں ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کا انتخاب (تم کون ہو) محمد شفاعت کی (محبت اور امن) عبدالمالک کیف کی تحریر (ذرا سوچیے) اور محمد معاویہ کا انتخاب (دس صورتوں کے دس عجیب خواص) میری ڈائری کی زینت بن گئے۔ کترنیں بھی اس بار کم از کم آٹے میں نمک کے برابر تھیں۔ آخر میں تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ واپس آ کر محفل کی رونق بڑھائیں۔ اب اجازت۔ یار زندہ صحبت باقی۔

شہناز بانو...... کراچی۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ بزم کے سارے ساتھی کیسے ہیں۔ سب کے لیے دعا گو ہوں۔ پیارے ساتھیوں کو شکایت ہے کہ میں کم کم آتی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے میں تنہا تھی بہت سارا ٹائم تھا لکھنے اور پڑھنے میں گزر جاتا تھا۔ اب میری بیٹی (بہو) آ گئی ہے۔ اس سے باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا اور دن گزر جاتا ہے۔ اب وہ مجھے یاد دلاتی ہے کہ آپ کو لکھنا ہے بلکہ میں تو سوچ رہی تھی کہ لکھنا چھوڑ دوں مگر اس نے منع کیا کہ آپ ایسا مت کریں۔ لکھنے والے انسان کو ڈیپریشن نہیں ہوتا۔ خیر چلیں باتیں تو بہت سی ہیں۔ اب ان شاء اللہ پابندی سے آؤں گی۔ بہت سے ساتھیوں کی فرمائش بھی پوری کرنی ہے آپ سب کا اتنا پیار ملا ہے کہ میں اپنے ربّ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ اس مرتبہ نئے افق لیٹ ملا ہے اس لیے مکمل تبصرہ نہ کر سکوں گی لیکن سب سے پہلے عبداللہ شاہد کی ’’کالی عورت‘‘ پڑھی۔ شاہد آپ نے موضوع اچھا چنا ہے۔ آپ برا نہ مانیے گا انداز تحریر میں مجھے تھوڑی کمی لگی۔ پختگی نہیں ملی۔ ویسے کہانی اچھی لگی۔ آپ اپنے انداز میں کہانی لکھا کریں مجھے کچھ تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ میرے تبصرے سے ناراض تو نہیں ہیں ناں۔ اب آتے ہیں گفتگو کی محفل میں سب سے پہلا خط این شاہین کا ہے۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ چندا اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا ٹائیفائڈ سارے جسم کو کمزور کر دیتا ہے۔ محفل میں آتی رہا کرو اچھا لگتا ہے۔ ویسے بھی یہاں خواتین کی تعداد کم ہے۔ ریاض قمر صاحب آپ کا خط اور تبصرہ بھی اچھا لگا۔ عبدالحکیم ساجد یاد کرنے کا بہت شکریہ میری جانب سے وعلیکم السلام ہمیشہ خوش اور آباد رہیں۔ نازش میری گڑیا کیسی ہو ناراضگی دور ہوئی یا نہیں‘ لگتا ہے تمہیں ٹھیک طریقے سے منانا ہی پڑے گا۔ ننھی سی جان پہ اتنے سارے کام لے لیے تمہاری اتنی طبیعت خراب ہوئی تم نے مجھے بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا اب اگر میں ناراض ہو گئی تو؟ بھائی ریاض بٹ آپ ہمیں بھول گئے۔ ٹھیک ہے بھئی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ایک دو مہینے گفتگو میں حاضر نہیں ہوئے تو سب بھول گئے۔ آپ کی اسٹوری کہاں ہے۔ نئے افق ادھورا لگ رہا ہے۔ اللہ آپ کو صحت مند رکھے۔ مجاہد عباسی آپ آتے رہنا اچھا لگا ہے۔ عبدالمالک کیف زبردست تبصرہ ہے جو تم نے لکھا ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔ عصمت اقبال صاحب آپ کیسی ہیں۔ کسی زمانے میں ہمیں بھی پینٹنگ کا جنون تھا پھر وہ ختم ہوا اب صرف لکھنا رہ گیا ہے۔ اتنا مختصر تبصرہ کیوں؟ عبداللہ شاہد اپنی تحریروں کے لیے آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ آپ کی تحریر بھی بھلا ریجکٹ ہو سکتی ہے۔

بھیج کر مطمئن ہو جایا کریں۔ باری آنے پر ضرور چھپے گی دیکھ لیں آپ کی ’’کالی عورت‘‘ موجود ہے۔ آپ کی کہانی کے بجائے ارشد کا نام غلطی سے چھپ گیا۔ انہوں نے تو نہیں البتہ ان کی بیگم نے بہت انجوائے کیا۔ ویسے کہانی پر آپ ہی کا نام تحریر تھا۔ فقیر لنگاہ بھائی آپ کیسے ہیں۔ طبیعت کیسی ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر اپنا خیال رکھا کریں۔ ابھی تو آپ کو بہت سی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ پچھلے دنوں آپ کے ہاں کچھ مسائل تھے لیکن آپ ماشاء اللہ بہت ہمت والے ہیں۔ گفتگو میں آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بچوں کی بے پناہ خوشیاں دکھائے۔ آپ نے دل سے یاد کیا تو ہم حاضر ہو گئے۔ تبصرہ بہت خوب تھا جاوید مقبول صدیقی‘ عالیہ انعام الٰہی‘ طاہرہ جبیں سب کہاں غائب ہیں۔ ارشاد قریشی صاحب بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ سب فٹافٹ آئیں۔ جاتے جاتے سب کو عید قربان کی ڈھیر ساری مبارک باد۔ مہنگائی اتنی ہے کہ لگتا ہے گائے اور بکروں کے کم از کم سینگ تو ضرور سونے کے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے سب خوش رہیں پاکستان سلامت رہے۔

شہنی ارشاد...... کراچی۔ محترم عمران بھائی‘ السلام علیکم! تمام قارئین نئے افق کو عید کی مبارک بار اور اپنی طویل غیر حاضری پر بہت بہت معذرت۔ بس مصروفیات ہی ایسی رہیں کہ بالکل بھی ٹائم نہیں مل سکا۔ عید کا موقع تھا بھائی اور بھابیاں آئے ہوئے تھے۔ خوب مہمان داری رہی۔ ان دنوں کراچی بھی خوب ہنگاموں کی زد میں رہا۔ مگر پھر بھی ہم گھومے پھرے ان حالات سے اتنے زیادہ خوف زدہ ہوئے کہ خوف ہی مٹ گیا۔ بہر حال اب سب مہمان واپس چلے گئے ہیں تو ہماری پرانی روٹین لوٹ آئی ہے۔ امی اور میں پچھلے دنوں کافی اداس رہے ہیں۔ پھر بھی رات کو سوتے وقت موقع نکال کر نئے افق کا مطالعہ ضرور کرتی تھی۔ پچھلے دو ماہ سے نئے افق اپنے پورے جوبن پر دکھائی دیا تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ لکھاریوں کو ڈھیر ساری مبارک باد۔ اس مرتبہ بھی تمام ہی کہانیاں بہترین ہیں۔ خاص طور پر بھائی عبداللہ شاہد کی ’’کالی عورت‘‘ وہ واقعی ’’کالی عورت‘‘ ہی تھی۔ ایک عورت ایسی ہوگی پڑھ کر بے حد شرم آئی۔ ناز سلوش کی کہانی بھی زبردست تھی۔ ناز اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ بہت معذرت اس بات کی کہ میں اپنی مصروفیات کے سبب تم سے فون پر تفصیلی بات نہ کر سکی۔ میسج پر ہی عید مبارک کہہ دی۔ اپنی امی کو میرا اسلام کہنا۔ ریاض انکل آپ کیسے ہیں۔ آپ کی تفتیشی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور بھی دلچسپ کہانیاں لے کر آئیں۔ فقیر لنگاہ انکل آپ کیسے ہیں۔ طبیعت کیسی ہے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ تمام برادران کو سلام۔ جاوید انکل کہاں غائب ہیں۔ ارشاد قریشی صاحب‘ عالیہ انعام‘ طاہرہ جبیں آپ سب پر فائن لگ گیا ہے۔ بتائیے تو کیا؟ ارشاد قریشی خوش بو سخن میں آپ کا انتخاب پسند آیا اور کیا لکھوں سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ سب اپنا اپنا خیال رکھیں دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ اللہ ہم سب کا حامی اور ناصر ہو۔

انجم فاروق ساحلی...... لاہور۔ آداب! امید ہے آپ اہلِ خانہ و ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے کراچی کے حالات بگڑتے ہی فکر سی لاحق ہو جاتی ہے۔ نومبر 2011ء کا نئے افق گہرے اور شوخ رنگوں کے امتزاج سے انتہائی خوب صورت اور جاذب نظر ہے اتنے خوش نما ٹائٹل کم ہی نظروں سے گزرتے ہیں۔ اداریہ گفتگو اس بار سچے پاکستانی کی پکار تھی۔ جو دل کی گہرائیوں سے ابھری۔ ہم واقعی دن بدن انحطاط اور تباہی کی طرف جا رہے ہیں اور خود احتسابی ایک ایسا عمل ہے جسے اپنایا جائے تو آہستہ آہستہ تباہی کے مزید اثرات

سے بچا جاسکتا ہے۔ گفتگو کی محفل خوب ہری بھری تھی۔ البتہ سیدآ کاش بخاری ارسلان علی، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی وغیرہ کی کمی محسوس ہوئی۔ محترم بزرگ محمد بخش صابر لنگاہ اور محترمہ شہناز بانو صاحبہ کے خطوط اچھے رہے۔ کہانیوں میں بیت المقدس، رات کے راہی، خوش بو موسم، آزادی پسند اچھی تھیں۔ غلط راستہ بھی خوب تھی لیکن جاسوس کی کارکردگی کچھ خاص نہیں تھی۔ سب باتیں کہانی کے کرداروں نے خود بخود ہی انہیں بتا دیں۔ خطروں کا کھلاڑی سفری انداز مقامات اور منظر نگاری کے لحاظ سے خوب ہے۔ کڑی مسافت، پرچی مافیا، افتاد اچھی آپ بیتیاں تھی۔ کالی عورت کچھ یکسانیت کا شکار معلوم ہوئی۔ سستی زندگی شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ نئے افق نے کہانیوں کے بہت سے نئے منفرد اور مختلف زاویے متعارف کروائے اس سلسلے میں مدیر نئے افق مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جب کہ دوسرے جرائد نے چند مخصوص خانے اور سانچے بنا رکھے ہیں جہاں کہانی کی وسعت گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ والسّلام

عبدالحکیم ساجد...... منچن آباد۔ محترم اور پیارے بھائی جان! السّلام علیکم اور عیدالضحیٰ مبارک اور ربّ کریم سے دعا ہے کہ ہمارے وطن کو سدا اسلامت رکھے آمین۔ شمارہ بروقت ملا اور اپنا نامہ شامل محفل دیکھ کر دل کچھ مطمئن ہوا۔ ٹائٹل جاذب نظر تھا۔ اگر حسینہ کے لبوں کی مسکان کے ساتھ سر پر دوپٹہ بھی ہوتا تو اچھا لگتا۔ حدیث نبوی پڑھی تو تربیت واخلاق میں اضافہ ہوا۔ ''دستک'' میں حاجی مشتاق احمد قریشی نے حالات حاضرہ پر خوب تبصرہ کیا اور بقول ان کے واقعی ہی پاکستان کا اللہ حافظ ہے اور اللہ خیر کرے گا۔ پیاروں کی محفل میں صدارت کی کرسی پر بہن این شاہین براجمان تھیں اچھا لگا۔ مبارک ہو۔ ریاض حسین قمر بھی جہلم سے تشریف لائے۔ جی آیاں نوں جی! ذشے جی بھی بہت دنوں بعد حاضر ہوئی ہیں اچھا لگا۔ آپ کی علالت کا سنا افسوس ہوا۔ ہم دعا کریں گے کہ آپ جلد سے جلد صحت یاب ہوں اور ایم اے اردو کی اپلائی میں آپ کامیاب ہوں آمین۔ محمد اسلم جاوید بھائی آپ کا مختصر تبصرہ اچھا لگا۔ ریاض بٹ صاحب جی ان شاءاللہ جی اگلی دفعہ آپ کی اسٹوری ضرور شامل ہوگی صبر کریں۔ آپا شہناز بانو کا جامع اور بھرپور تبصرہ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ آپ کا قلم ایسا ہی چلتا رہے۔ مجاہد ناز عباسی بھائی آپ آئے اچھا لگا۔ عبدالمالک کیف بھائی آپ کا تبصرہ خوب تھا اور آپ نے ہمیں یاد بھی نہیں کیا چلو کوئی بات نہیں اور یہ آپ منچن آباد کو موردِ الزام کیوں ٹھہرا رہے ہیں؟ بھائی ہماری کوئی سازش نہیں ہے۔ عصمت اقبال عین جی آپ کا مختصر نامہ تھا لیکن خوب تھا۔ بھائی سید عبداللہ شاہد آپ نے اتنا خوب اور جاندار تبصرہ تحریر کیا پڑھ کر دل میں حسرت سی اٹھی کہ ہم بھی آپ کے جیسا لکھ سکیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے آمین۔ اگلی تحریر دل کش اور دل موہ لینے والی بزرگوار فقیر محمد بخش لنگاہ اور ان کے صاحب زادوں کی تھی۔ آپ کے لکھے اشعار بہت پسند آئے۔ ربّ تعالیٰ آپ کو کامیابی وصحت عطا فرمائے آمین۔ منگلا کینٹ سے عبداللہ عاطر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے آپ بھی اپنے تبصرے اور غزل کی مبارک باد قبول کریں۔ اقراء میں طاہر قریشی صاحب نے جھوٹی گواہی وجھوٹی قسم کے بارے میں ایمان افروز اضافہ کیا۔ اب ہو جائے کچھ کہانیوں کی بات۔ سب سے پہلی تحریر ''بیت المقدس'' الماس ایم اے کی تھی۔ جو تاریخ کی ایک روحانی سے سرشار اور بھرپور تھی۔ اچھی لگی۔ اس کے بعد عبداللہ شاہد بھائی کی تحریر پڑھی۔ ''کالی عورت'' آپ نے بہت اچھے انداز میں لفظوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا اور یہ کیا کہ عورت اتنی بھی گر سکتی ہے کہ......! اے حمید کی ''خطروں کا کھلاڑی'' جو کہ ایک سفرنامہ بھی تھا اچھی تھی۔ لیکن

''[illegible]'' کو نہ پاکر کچھ افسوس بھی ہوا۔ ناز سلوش ذشے کی ''افتاد'' شہناز بانو کی ''کڑی مسافت'' عدن قیوم کی ''[illegible]'' اور اقبال پاریکھ کی ''رات کے راہی'' پڑھی اچھی تھیں۔ باقی ابھی نہیں پڑھ سکا۔ بزم سخن میں محمد اقبال، محمد محمود، برکت اللہ، محمد اسماعیل، رانا محمد صفدر، آسیہ جبیں، منی، عابدہ انیس اور شکیلہ تبسم کے اشعار پسند آئے۔ خوش بوسخن میں حمد ونعت کے بعد محمد اسلم جاوید، محمد عبداللہ عاطر، شاہ روم ولی، ریحانہ سعیدہ، صابرہ کلثوم اور سب سے بڑھ کر طاہرہ جبیں تارا کی نظم پسند آئی۔ ذوق آگہی میں ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی محمد شفاعت، ریاض بٹ، عبدالمالک کیف، ظفر، خرم عباس اور محمد بلال پسند آئے۔ وہ تمام دوست جو شامل محفل تھے ان کو بھی اور جو نہ تھے اور قارئین و سامعین میری طرف سے عید مبارک قبول کریں۔ اس کے بعد اجازت چاہتا ہوں۔ عمران بھائی ایک عدد نظم بھیج رہا ہوں اشاعت کا موقع دیجیے گا۔

مجاہد ناز عباسی...... سجن پور۔ بھائی جب سے میں نے نئے افق کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا ہے تب سے میں بہت ہی سکون محسوس کرنے لگا ہوں۔ نئے افق سے مجھ میں ایک نئے سرے سے جینے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ اب میں اپنا زیادہ تر وقت نئے افق کو دیتا ہوں اس میں مجھے طرح طرح کے دوستوں کی دعائیں ملتی ہیں اور میں شکرگزار ہوں عبدالمالک کیف کا جس نے مجھے نئے افق گفٹ کیا تھا۔ تب سے میں نے اس کے ساتھ زندگی بھر کے لیے ناتا جوڑ لیا اور عمران میں بجن پور میں رہتا ہوں۔ رحیم یار خان ہمارا ضلع ہے آپ پلیز میرے نام کے آگے بجن پور لکھا کریں۔ اس دفعہ دستک ٹاپ پر رہی اور گفتگو کے تمام ساتھیوں کو میری طرف سے سلام اور میں ان تمام دوستوں کا مشکور ہوں جنہوں نے میری نئے افق میں شمولیت پر حوصلہ افزائی کی اور مجھے ویلکم کیا۔ این شاہین صاحبہ کیسی ہیں آپ؟ آپ کا ٹائیفائڈ بخار اترا؟ اللہ آپ کو صحت وتندرستی دے آمین۔ کہانیوں میں بیت المقدس، الماس ایم اے اور رات کے راہی، اقبال پاریکھ اچھی لگیں اور باقی زیر مطالعہ ہیں۔ بزم سخن کی ساری شاعری پسند آئی اور خوش بوسخن میں محمد اسلم جاوید، محمد عبداللہ عاطر ریحانہ سعیدہ لاہور، سمعہ منیر ملتان، ڈاکٹر واجد نگینوی، محمد ارشاد قریشی اور صابرہ کلثوم کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ذوق آگہی میں جناب عبدالمالک کیف نے بہت اچھا لکھا ہاں بھائی واقعی ہمارے سماج میں عورت کی کوئی قدر نہیں۔ آخر میں نئے افق کے اسٹاف اور تمام نئے افق میں لکھنے اور پڑھنے والوں کو میری طرف سے سلام۔

عبدالرحمان ساغر...... آزاد کشمیر! محترم جناب مدیر اعلیٰ مشتاق احمد قریشی صاحب السّلام علیکم! جناب امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور عمر دراز فرمائے۔ جناب میں آپ کا شمارہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ کشمیر بک ڈپو سے خریدا۔ سلسلہ وار کہانیوں میں ادریس آزاد کی ''بحر اسود'' ابواوصاف ایم اے کی ''گردش'' بہت اچھی ہیں۔ باقی کہانیوں میں یعقوب جمیل صاحب کی ''ماسٹر مائنڈ'' طاہرہ جبیں کی ''اندھا قانون'' بہت اچھی تھیں۔ روبین احمد صاحبہ کی ''بزم سخن'' محمد احمد شہزاد صاحب کی ''خوش بوسخن'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ میں اپنی چند غزلیں اور شعر بھیج رہا ہوں۔ امید ہے قریبی اشاعت میں شائع کریں گے جناب کی نوازش ہوگی۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

(۲۰۶)

(ترجمہ) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے ہم کلام ہوگا' نہ ان پر عنایت کی نظر کرے گا' اور نہ گناہوں اور گندگیوں سے ان کو پاک کرے گا' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ابوذر غفاریؓ نے عرض کیا:۔ یہ لوگ تو نامراد ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے' حضورؐ یہ تین کون کون ہیں؟ آپ نے فرمایا:۔ اپنا تہبند حد سے نیچے لٹکانے والا (جیسا کہ متکبروں اور مغروروں کا طریقہ ہے) اور احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا چلانے والا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) جس طرح حاکم اور گاہک کے سامنے کسی معاملہ میں جھوٹی قسم کھانا اللہ تعالیٰ کے پاک نام کا نہایت غلط اور ناپاک استعمال ہے اسی طرح اپنے سودے کو بیچنے کے لیے گاہک کے سامنے جھوٹی قسم کھا کے اس کو یقین دلانا بھی اسم الٰہی کا نہایت بے محل استعمال اور بڑی دنی حرکت ہے' اس لیے یہ بھی جھوٹ کی نہایت سنگین قسم ہے اور قیامت میں ایسے شخص کو دردناک عذاب دیا جائے گا اور اپنی اس ذلیل بدکرداری کی وجہ سے یہ کذاب تاجر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی اور اس کی نظر کرم اور گناہوں کی بخشش سے محروم رہے گا۔

جھوٹ کی بعض خفی قسمیں:۔

جھوٹ کی چند سنگین قسموں کا ذکر تو اوپر ہو چکا لیکن بعض جھوٹ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بہت سے لوگ جھوٹ ہی نہیں سمجھتے' حالانکہ وہ بھی جھوٹ ہی میں داخل ہیں' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی پرہیز کرنے کی تاکید فرمائی ہے ذیل کی حدیثوں میں جھوٹ کی بعض ایسی ہی صورتوں کا ذکر ہے:۔

(۲۰۷)

(ترجمہ) عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے' میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا بڑھ کے آ میں تجھے کچھ دوں گی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ماں سے فرمایا:۔ تم نے اس بچے کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟ میری ماں نے عرض کیا میں نے اس کو ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ یاد رکھو اگر اس کہنے کے بعد تم اس بچے کو کوئی چیز بھی نہ دیتیں' تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

(سنن ابی داؤد شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا اصل منشاء یہ ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے بھی جھوٹ کا استعمال نہ کیا جائے' کیونکہ مسلمان کی زبان جھوٹ سے آلودہ ہونی ہی نہ چاہیے علاوہ ازیں اس کی ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ماں باپ اگر بچوں سے جھوٹ بولیں گے اگرچہ ان کا مقصد صرف بہلاوا ہی ہو' پھر بھی بچے اس سے جھوٹ بولنا سیکھیں گے' اور جھوٹ بولنے میں وہ کوئی قباحت نہ سمجھیں گے۔

(۲۰۸)

(ترجمہ) بہز بن حکیم بواسطہ اپنے والد معاویہ کے اپنے دادا حیدہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لیے اپنے بیان میں جھوٹ بولے' اس پر افسوس' اس پر افسوس:۔

(مسند احمد جامع ترمذی' سنن ابی داؤد' دارمی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ صرف لطف صحبت اور ہنسنے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولنا بھی بری بات اور بری عادت ہے' اگرچہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا لیکن اولاً خود بولنے والے کی زبان جھوٹ سے آلودہ ہوتی ہے' دوسرے جھوٹی باتوں سے اہل ایمان کے دل میں جو نفرت ہونی چاہیے اس میں بھی کمی آتی ہے' اور تیسری خرابی یہ ہے کہ لوگوں میں جھوٹی باتیں کرنے کی جرأت اس سے پیدا ہوتی اور جھوٹ کے رواج کو مدد ملتی ہے۔

(۲۰۹)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔ آدمی کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا پھرے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان کرتے پھرنا بھی ایک درجہ کا جھوٹ ہے اور جس طرح جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کی عادت رکھنے والا آدمی قابل اعتبار نہیں ہوتا اسی طرح یہ آدمی بھی لائق اعتماد نہیں رہتا...... بہرحال مومن کو چاہیے کہ خفی قسم کے ان سب جھوٹوں سے بھی اپنی زبان کی حفاظت کرے۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

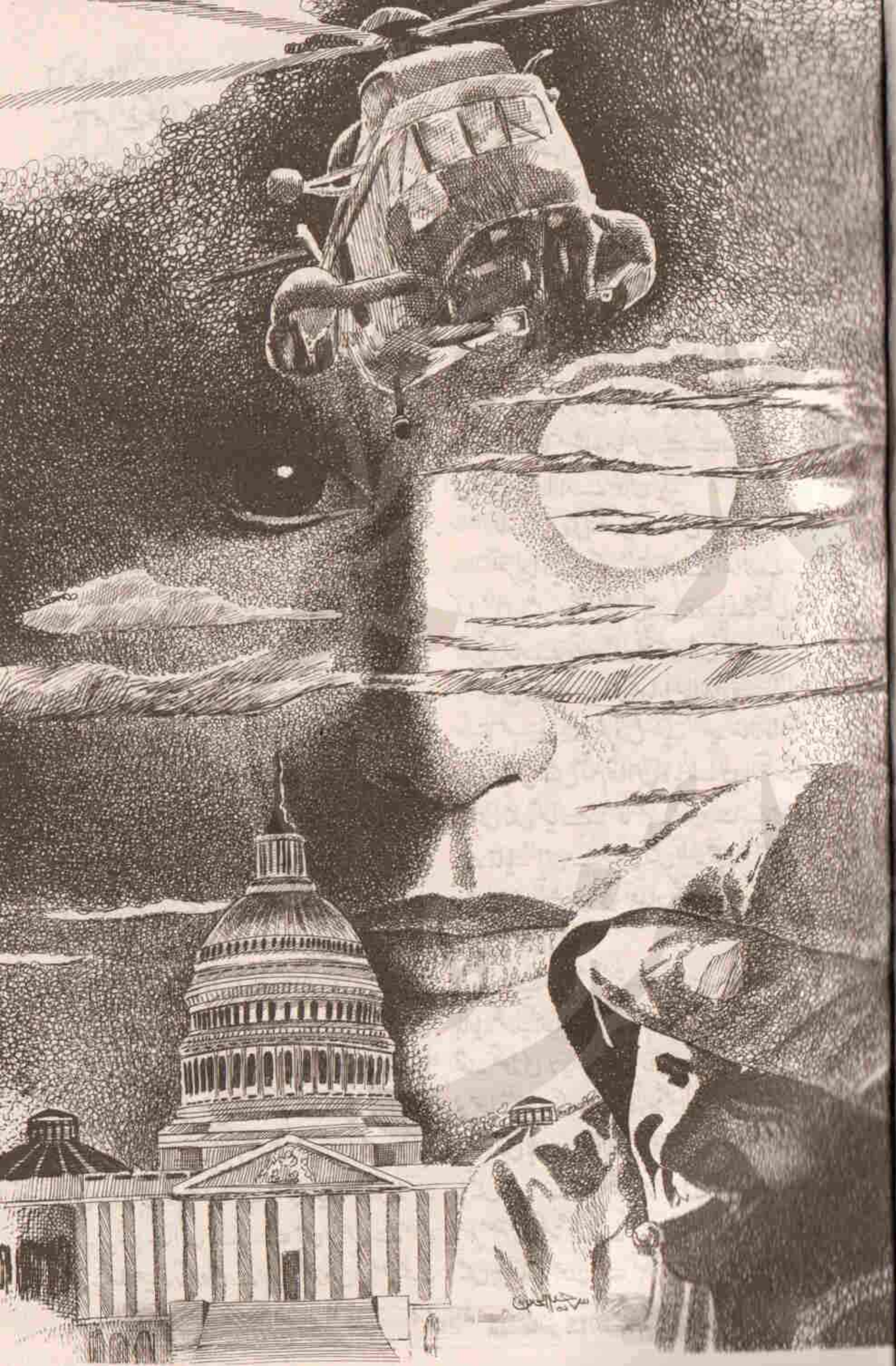

بیت المقدس

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول اور وہ شہر ہے جہاں سے مولائے کائنات پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش بریں کا سفر کیا۔ وہ شہر جو مسلمانوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہر جو نصف صدی سے یہودیوں کے زیر تسلط ہے۔ جہاں کلمہ گو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ جہاں یہودیوں کے مظالم پر دنیا نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شہر جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے جہاں متعدد پیغمبروں اور صحابہ کرام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ شہر آج بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کسی صلاح الدین ایوبی کا منتظر ہے۔ یہ شہر کیسے فتح ہوا اور کس طرح اس کا سقوط ہوا آئیے اسے ممتاز مورخ اور ادیب الماس ایم اے کی نظر سے دیکھیے۔

تاریخ کے جھروکوں سے لہو گرماتی ایمانی جذبوں کو جھنجھوڑتی تحریر

جب قاسم نے بتایا کہ وہ جب شہزادی ارمانوس کو دریا میں سیر کرتے دیکھنے کے شوق میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کی چھوٹی کشتی ایک بڑی اور بے قابو کشتی سے ٹکرا گئی تو سپہ سالار عمرو بن عاص چونکے۔ انہوں نے سوال کیا۔

"کیا وہ بڑی کشتی واقعی بے قابو ہوگئی تھی یا اس نے جان بوجھ کر تمہاری کشتی کو ٹکر ماری تھی کہ تمہاری کشتی الٹ جائے اور تم کو نقصان پہنچے؟"

"میرے خیال میں یہ محض ایک اتفاق تھا۔" قاسم نے بتایا۔ "اس بے قابو کشتی سے میری کشتی کے علاوہ کئی اور کشتیاں بھی الٹ گئی تھیں۔"

"تمہاری کشتی بھی الٹ گئی تھی کیا؟ پھر تم کیسے بچے؟" سپہ سالار نے قاسم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں تیرنا جانتا ہوں سپہ سالار۔" قاسم نے بتایا۔ "کشتی الٹنے پر بھی میں نے حواس برقرار رکھے اور تیرنے کی کوشش کی لیکن سر میں چوٹ آنے کی وجہ سے میں تیر نہ سکا اور بے ہوش ہوگیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" عمرو بن عاص نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے شہزادی ارمانوس کے ملاحوں نے بچا لیا۔" قاسم نے پرسکون لہجے میں بتایا۔ "شہزادی نے مجھے ڈوبتے دیکھ کر اپنے ملاحوں کو میری مدد کے لیے بھیجا۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر ساحل پر پہنچا دیا۔ میں اس دوران بے ہوش ہوگیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں "شہر مصر" کے قصر الشمع میں شہزادی ارمانوس کے محل میں ہوں اور شہزادی کی کنیزیں میری تیمارداری کر رہی تھیں۔

سپہ سالار عمرو بن عاص کے متفکر چہرے پر رونق سی آگئی۔ "پھر تو شہزادی سے بھی تمہاری ملاقات ہوئی ہوگی؟" عمرو بن عاص مسکرائے۔

قاسم نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں، پھر بتایا۔ "جی ہاں سالار...... میں شہزادی ارمانوس کے محل میں ایک چھوٹے کمرے میں مقیم تھا۔ میرا علاج وہیں ہوتا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد شہزادی نے اپنے خاص ملاح کے ذریعہ مجھے دریا پار کرایا تھا۔"

یکایک سپہ سالار عمرو بن عاص کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ انہوں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ "تو کیا تم شہر مصر سے صرف یہی خبر لے کر ہمارے پاس

آئے ہو؟"

قاسم نے گھبرا کے سپہ سالار کو دیکھا، پھر متانت سے جواب دیا۔ "سپہ سالار! آپ نے مجھے ایک اہم فرض پر مامور کیا تھا، میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

سپہ سالار عمروؓ بن عاص کا کھنچا ہوا چہرہ پر سکون ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ "اچھا، اب مصر اور شہرِ مصر کے حالات تفصیل سے بیان کرو؟"

قاسم نے ناف پر ہاتھ باندھ کر اپنی مترنم آواز میں شہرِ مصر اور اطراف کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا۔

"اے سپہ سالار لشکرِ اسلام! مصر کی سرزمین سرسبز اور بار آور ہے۔ وہاں کثرت سے سایہ دار درخت پائے جاتے ہیں۔ اس ملک کا طول ایک ماہ کی مسافت اور عرض دس روز کی مسافت ہے۔ اس کے وسط سے دریائے نیل گزرتا ہے۔ جس وقت نیل چڑھتا ہے اور اس کی موجیں سر اٹھاتی ہیں اس وقت تمام چشمے اور نہریں لبالب بھر جاتے ہیں اور باشندوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے کشتیوں کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے۔ پھر جب دریا کا جوش کم ہو جاتا ہے تو وہ تیزی سے پلٹا کھاتا ہے اور تیزی سے اتر کر اپنی حد پر آ جاتا ہے۔ اس وقت کاشت کار اس کے فراز اور دامنوں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں۔ دانے بوتے اور خرمن کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ جب دانے اور کھتیاں اگیں۔ نیچے زمین کی نمی اور اوپر بارش کی تری سے پرورش پا کر ان میں بالیدگی ہو تو ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت اس کے شکم سے نکل کر اس کی پشت پر آ جاتی ہے۔ مصر کی شاداب سرزمین کا کیا بیان، جو ابھی گوہر سفید ہے، ابھی سیاہ اور ابھی زمرد سبز۔ یہ قدرت الٰہی کے کرشمے ہیں، جس نے اس میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے اور باشندوں کی معیشت کے لیے اسے ایسا بنا دیا ہے۔

شہرِ مصر جسے ممفس کہا جاتا ہے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ دونوں حصوں میں دو مضبوط قلعے ہیں۔ مشرقی حصہ میں قلعہ عین الشمس ہے اور مغربی حصہ میں قصر الشمع یا بابلون ہے۔ اسی حصہ میں مصر کے حکمراں شاہ مقوقس کا محل ہے۔ قلعہ کی فصیل بہت بلند اور مضبوط ہے۔ اس کی حفاظت ایک طرف دریائے نیل کرتا ہے اور باقی اطراف میں گہری خندقیں ہیں۔"

سپہ سالار عمروؓ بن عاص گہری فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قاسم شاید سانس لینے کے لیے رکا تھا کہ اسی وقت سپہ سالار نے سوال کیا۔

"قلعہ میں رومی لشکر کی تعداد کتنی ہے؟"

"تقریباً ایک لاکھ۔" قاسم نے اندازے سے کہا۔ "اس میں وہ لشکر شامل نہیں جو دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر قلعہ عین الشمس میں مقیم ہے۔"

"اس کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے؟"

قاسم نے بتانا شروع کیا۔ "سپہ سالار! جس سرائے میں، میں مقیم تھا اس کا مالک کئی بار قلعہ عین الشمس میں گیا ہے۔" قاسم نے کیرت کے حوالے سے بتایا۔ "اس کے خیال میں قلعہ عین الشمس میں رومیوں اور قبطیوں کی تعداد پچیس تیس ہزار کے درمیان ہوگی۔"

"خوب......" کہتے ہوئے سپہ سالار نے سر ہلایا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آ سکا کہ اس کے کہنے کا مقصد کیا تھا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر سپہ سالار نے پوچھا۔ "اس کے علاوہ اور کچھ بھی کہنا ہے؟"

"جی ہاں سپہ سالار۔" قاسم نے جواب دیا۔ جو باتیں میں نے اب تک عرض کی ہیں وہ سب میں شہرِ مصر پہنچ کر بھی عرض کر سکتا تھا۔ لیکن دریائے نیل میں ہر سال جون سے ستمبر تک سیلابی کیفیت رہتی

ہے اور اس کا پانی کناروں سے نکل جاتا ہے۔ مگر اس بار یہ واقعہ پیش آیا کہ دریائے نیل میں دوبارہ سیلابی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔"

"کیا کہا تم نے......؟" سپہ سالار نے چونک کے پوچھا۔ "کیا دریا میں دوبارہ سیلاب آ گیا ہے؟"

قاسم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "سپہ سالارِ محترم...... دریائے نیل میں سیلابی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ دریا ابھی کناروں سے نہیں نکلا اس لیے ہم سیلاب نہیں کہہ سکتے۔"

سپہ سالار نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ "قاسم، صاف صاف بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"محترم سالار جس وقت میں شہرِ مصر سے روانہ ہوا تھا اُس وقت نیل کا پانی تھوڑا سا بڑھا تھا اور اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔"

"قاسم...... تم بات کو پھر الجھا رہے ہو۔" عمروؓ بن عاص خود الجھ کر رہ گئے۔ "ہمیں یہ بات معلوم تھی کہ نیل میں جون سے ستمبر تک سیلاب رہتا ہے۔ ہم نے اسی واسطے اپنے آنے کی تاریخ اس طرح مقرر کی تھی کہ جب ہم دریائے نیل کے کنارے پہنچیں تو اس کا سیلاب ختم ہو چکا ہو اور ہم مصر کے سب سے بڑے قلعہ پر آسانی سے قبضہ کر سکیں لیکن تم کچھ اور ہی بتا رہے ہو۔"

"سپہ سالار! آپ میری بات سماعت فرمایئے۔ پھر اس سے نتیجہ نکالیے۔" قاسم کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی بات اچھی طرح کیوں نہ سمجھا سکا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ ہم بعد میں فیصلہ کریں گے۔" سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے قاسم کو پریشان دیکھ کر اسے حوصلہ دیا۔

قاسم نے اچھی طرح خود پر قابو پا لیا تو بولا۔ دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب آنا ایک انہونی بات تھی۔ شہرِ مصر کے بوڑھے سے بوڑھے قبطی نے بھی ایسی انہونی بات نہ دیکھی تھی اور نہ سنی تھی۔ اس سلسلہ میں ہر جگہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ قلعہ قصر الشمع میں رومی گورنر جارج نے یہ افواہ مشہور کر کے اس نے مسلمانوں کے متوقع حملہ کے پیش نظر دریائے نیل کو دوسری بار "عروسِ نیل" کی قربانی دی ہے۔ اور اس قربانی کی ہی وجہ سے دریائے نیل میں ایک بار پھر سیلاب آ گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط اور لغو بات تھی۔"

"عروسِ نیل" کے بارے میں ہم نے بھی لوگوں سے سنا ہے۔" سپہ سالار نے کہا۔ "بحیثیت مسلمان ہم ایسی بے ہودہ باتوں پر قطعی یقین نہیں رکھتے لیکن تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب آ گیا ہے۔ کیا تم خود اپنی پہلی بات کی تردید کرنا چاہتے ہو۔"

قاسم کو اپنی عقل پر رونا آ گیا۔ وہ اب تک سپہ سالار کو اپنی بات نہیں سمجھا سکا تھا۔ جس وجہ سے طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے۔ پس قاسم نے کہا۔

"سپہ سالار! یقین کیجیے کہ دریائے نیل میں سیلاب نہیں آیا بلکہ اس کا پانی اتفاقیہ طور پر کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ میرے اس یقین کا ثبوت یہ ہے کہ اس افواہ کے گرم ہونے کے بعد میں ایک ہفتہ تک مسلسل دریائے نیل کی سطح کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ دریائے نیل کی سطح پہلے دن جس قدر بلند ہوئی تھی اس میں ایک ہفتہ گزرنے کے بعد رتی برابر اضافہ نہیں ہوا۔ اور یہی وہ بات ہے جسے کہنے کے لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ افواہ لشکرِ اسلام کے سپاہیوں کے کانوں تک پہنچے اور ان کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو۔"

بات اب کچھ صاف ہوئی تھی۔ اس لیے عمروؓ بن

عاص نے مسرت کا اظہار کیا اور قاسم کو شاباش دی۔

"میں تمہاری کارگزاری کی داد دیتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے ہمیں ان باتوں سے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔ اب تم شہر واپس جاؤ اور دشمن کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھو اور اگر کوئی خاص بات محسوس ہو تو اس کی اطلاع ہمیں بھجواؤ۔ یا خود واپس آ کر ہمیں بتاؤ۔ ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے شہر مصر پہنچ رہے ہیں۔"

قاسم سپہ سالار کے حکم کے مطابق پھر شہر مصر چلا گیا لیکن اب اس شہر کا نقشہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ دریا کے دونوں طرف پہرہ لگ گیا تھا اور مشکوک لوگوں کی کڑی نگرانی ہوتی اور تلاشی لی جاتی تھی۔ قاسم کا دل شہزادی سے ملنے کو بہت چاہتا تھا لیکن اب حالات بدل چکے تھے اور اس وقت دریا عبور کرنا تو ایک طرف رہا، دریا کے کنارے جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ پس قاسم چپ ہو کے بیٹھ گیا۔

شہر کی سرائے میں کیرات کی ایک ایسی ذات تھی جسے علم تھا کہ قاسم مسلمان ہے لیکن وہ اب تک یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ قاسم اتنے عرصہ سے شہر مصر میں کیوں ٹھہرا ہوا تھا؟ قاسم نے اسے یہی تصور دیا تھا کہ اسے مصر اور خصوصاً شہر مصر سے بچپن سے ہی بہت محبت ہے۔ اس نے اپنے باپ سے مصر کی پراسرار زمین اور ابوالہول اور دیو قامت اہرام مصر کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔

پس اس نے مصر کے بارے میں اپنی والہانہ محبت اور دلچسپی کا اس انداز میں ذکر کیا تھا کہ سرائے کے کیرات کو اس کی ذات سے ایک خاص دلچسپی بلکہ محبت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر جب شہر میں مسلمانوں کی آمد کا غلغلہ اٹھا تو کیرات نے قاسم کو مشورہ دیا۔

"قاسم! تمہارا شہر میں بے دھڑک گھومنا پھرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

قاسم خود اس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت موقع ملا تو اس نے فوراً جواب دیا۔

"میرے دوست کیرات! تمہارا خیال درست ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی آفت آئے۔ اس لیے تم مجھ کو اجازت دو کہ میں کسی اور طرف نکل جاؤں۔ پھر جب یہاں کے حالات درست ہوں گے تو میں واپس آ کر یہاں کے اہرام اور دوسرے عجائبات دیکھوں گا۔"

کیرات کو قاسم کی جدائی منظور نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے جواب میں کہا۔ "تم نے مجھے دوست کہا ہے اور میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تم شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کے تحت کہیں اور چلے جاؤ، تمہاری حفاظت کی ذمہ داری میں لیتا ہوں لیکن تمہیں خود بھی اپنی حفاظت کرنی ہو گی۔"

"میں اس پردیس میں اپنی حفاظت کس طرح کر سکوں گا؟" قاسم نے گھبرا کے پوچھا۔

کیرات مسکرایا اور بولا۔ "تمہیں کسی سے جنگ نہیں کرنا ہے قاسم! بس یہ کرو کہ دن میں باہر نکلنا چھوڑ دو۔ ہاں رات میں تم میرے کپڑے پہن کے جا سکتے ہو۔ تمہاری صورت پر تو نہیں لکھا کہ تم مسلمان ہو۔ پھر ہم قبطیوں اور مسلمانوں کا کیا جھگڑا؟ لڑائی ہو گی تو رومیوں اور مسلمانوں میں۔ اگر رومی جیت گئے تو ہماری غلامی پر دائمی مہر لگ جائے گی اور مسلمان فتح یاب ہوئے تو شاید ہمارے حالات کچھ بدل جائیں اور اناج کی یہ لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے۔"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ مصر پر رومیوں کے طویل قبضے نے اس شاداب سرزمین کے باسیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دریائے نیل کے سیلاب کی وجہ سے یہاں کثرت سے غلہ پیدا ہوتا تھا لیکن یہ

تمام غلہ مصریوں کو ملنے کی بجائے روم کے بازاروں میں بکتا تھا اور مصر والے اکثر فاقے کرتے تھے۔

قاسم نے کیرات کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے لیے یہی غنیمت تھا کہ کیرات ان بگڑے حالات میں بھی اسے پناہ دیے ہوئے تھا۔ اس نے کیرات کا مشورہ تسلیم کر لیا بلکہ اپنا لیا۔ اب وہ دن بھر سرائے کے کمرے میں دبکا بیٹھا رہتا اور رات ہوتے ہی کپڑے بدل کے سیر سپاٹے کو نکل جاتا۔ قاسم کا مقصد قلعہ عین الشمس میں فوجیوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور نیل کے دفاعی انتظامات کو دیکھنا تھا۔ رات کے وقت بھی دریا کے دونوں کناروں پر سخت پہرہ رہتا تھا لیکن دریا کی سیر کرنے والوں کی کثیر تعداد وہاں جمع ہو جاتی اور پہرے داروں کو کچھ لے دے کے کرایہ کی کشتیاں حاصل کی جاتی تھیں اور رات گئے تک دریا میں کشتیوں کی دوڑ بھاگ لگی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر قاسم بھی فائدہ اٹھاتا اور کرایہ کی کشتی کے ذریعے اکثر اس مقام تک پہنچ جاتا جہاں سے وہ شہزادی کے محل سے واپس ہوتے ہوئے کشتی پر سوار ہوا تھا۔

اس جگہ اگرچہ سخت پہرہ تھا لیکن قاسم کو سوائے پہرے داروں کے فوج کسی جگہ بھی نہ دکھائی دی۔ فوج کا پہرہ صرف قلعہ کی فصیل اور برجوں پر تھا۔ گھاٹ کی طرف کھلنے والے دروازے کے اوپر کی برجیوں میں بھی فوجیوں کے سر نظر آتے تھے۔ رات کے وقت فصیل پر خوب آگ روشن کی جاتی تھی۔ پتہ نہیں کہ یہ آگ فوجی نقطہ نظر سے جلائی جاتی تھی یا فوجی اس کی روشنی میں رنگ رلیاں مناتے تھے۔

اس زمانے میں قاسم کے لیل و نہار بڑے بے کیف گزر رہے تھے۔ گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا تھا اور وہ پورے ملک میں بکھر گئے تھے۔ انہوں نے دور دراز کے علاقوں اور محلوں میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے روپ بھی تبدیل کر لیے تھے۔ ہر رات کو جب قاسم بھیس بدل کر نکلتا تو اسے کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور ملتا جس کی ملاقات سے قاسم کو بہت سہارا مل جاتا تھا۔

اس طرح کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شہر میں یہ خبر گرم ہوئی کہ مسلمانوں کا لشکر فتح پر فتح حاصل کرتا ہوا شہر مصر کے قریب تک پہنچ گیا ہے اور ایک دو روز بعد شہر پر حملہ ہو سکتا ہے۔

اس خبر کے پھیلتے ہی سارا شہر سنسان ہو گیا۔ پتہ نہیں لوگ کدھر سے کدھر نکل گئے۔ جنگلوں اور ویرانوں میں آبادی ہو گئی تھی اور شہر کے محلے خالی ہو رہے تھے۔

ایک شام کیرات بہت افسردہ قاسم کے پاس آیا اور اس کے گلے لگ کر بولا۔

"قاسم یار...... مجھے افسوس ہے کہ اب میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دیہات جا رہا ہوں۔ سرائے میں تم اپنی ذمہ داری پر رہ سکتے ہو۔"

قاسم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ شہر بڑی تیزی کے ساتھ خالی ہو رہا تھا۔ لوگوں پر مسلمانوں کی اس قدر دہشت طاری تھی کہ انہیں شہر میں ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ پس اس نے کیرات سے پوچھا۔

"کیرات! تم تو کہتے تھے کہ قبطیوں اور مسلمانوں کا کوئی جھگڑا نہیں۔ پھر تم شہر چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔" کیرات نے جواب دیا۔ "لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ مسلمان انسان نہیں، وہ تو جن بھوت اور دیو ہیں۔ وہ نہ تو موت سے ڈرتے ہیں اور نہ تیر تلوار ان پر اثر کرتی ہے۔ لوگ تو

یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ مسلمان لشکری اپنے دشمن کو آگ میں بھون کر کھا جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے کیرات کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔

"لاحول لاقوۃ۔" قاسم کو غصہ آ گیا۔ "کس قدر بکواس ہے یہ سب۔ کیرات! مجھے دیکھو۔ کیا تم مجھے آدم خور سمجھتے ہو؟"

"نہیں نہیں قاسم......" کیرات نے فوراً کہا۔ "تم میرے ایک سچے دوست ہو۔"

"صرف سچا ہی نہیں بلکہ قابل اعتماد دوست ہوں۔" قاسم نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "وقت آنے پر میں دکھاؤں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے پورا بھی کر سکتا ہوں۔"

کیرات بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ قاسم کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پس قاسم نے اسے مطمئن کرنے کے لیے مزید کہا۔

"میری بات کا یقین کرو کیرات! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ مسلمان تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم ہی نہیں بلکہ کسی بھی قبطی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مسلم لشکر میں میرے بہت سے جاننے والے ہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ اگر ادھر کوئی آیا تو میں اس سے بات کروں گا۔ سرائے میں جس قدر لوگ پناہ لیں گے انہیں کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

کیرات اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سچ بتاؤ قاسم...... تم کون ہو؟ تمہاری باتوں میں اس قدر اعتماد ہے جیسے تم حملہ آور مسلمان لشکر کے کوئی بڑے سردار ہو۔"

قاسم نے اپنے اوپر قابو رکھا۔ وہ کیرات کو فی الحال اس سے زیادہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میرے دوست کیرات! یہ تو وقت بتائے گا کہ میں کون ہوں لیکن تمہارے لیے صرف اور صرف قاسم ہوں۔ جاؤ اطمینان سے بیٹھو اور جتنے لوگوں کو چاہو سرائے میں بلا لو۔ کیونکہ شہر مصر کی جنگ کی ہولناکیوں میں سب سے زیادہ پرامن جگہ صرف تمہاری سرائے ہوگی۔"

یہ کہہ کر قاسم سرائے سے نکل گیا۔ وہ جنگ کے اصل حالات معلوم کرنے کے لیے جلد سے جلد لشکر اسلام تک پہنچنا چاہتا تھا۔ قاسم کو کچھ زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ اس کے کئی ساتھی اسے خبر دینے کے لیے سرائے کی طرف آ رہے تھے۔ پس قاسم انہیں ساتھ لے کر سرائے میں آ گیا۔ قاسم کے ساتھیوں نے بتایا۔

"سپہ سالار لشکر اسلام عمروؓ بن عاص قلعہ پر قلعہ اور شہر پر شہر فتح کرتے ہوئے شہر مصر کے مشرقی حصہ میں داخل ہو گئے ہیں۔"

شہر حمفس کی فتح کے سلسلے میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں تاریخی حیثیت سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک مورخ کے مطابق مصر کے سرحدی شہر فرما میں بڑی خوف ناک جنگ ہوئی تھی۔ دوسرے مورخ کے مطابق بلبیس میں سخت معرکہ ہوا تھا۔ اسی طرح ایک اور مورخ کا بیان ہے کہ "اُم دینن" میں ایک ماہ تک رومیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی تب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ لشکر اسلام نے جب شہر مصر کے مشرقی حصہ میں قلعہ عین الشمس پر قبضہ کیا تو اس وقت تک مسلمانوں کے پاس وہی چار ہزار مسلمانوں کا لشکر تھا جس کے ساتھ وہ مصر جیسے عظیم اور مضبوط ملک کو فتح کرنے نکلے تھے۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کو قدم قدم پر چھوٹی بڑی لڑائیوں میں بھی الجھنا پڑا مگر اس کے باوجود ان کے جوش و جذبہ کا یہ عالم تھا کہ وہ بغیر کمک کے دریا پار کر کے قلعہ قصر الشمس پر حملہ کرنے

کے لیے آمادہ تھے۔ جبکہ انہیں یہ معلوم تھا کہ قلعہ کے اندر رومیوں کا ایک لاکھ کا لشکر موجود ہے جبکہ عمروؓ بن العاص کے چار ہزار سواروں میں سے بہت سے مسلمان شہید ہو چکے تھے۔

لشکر اسلام اور رومیوں اور قبطیوں کے سب سے بڑے قلعہ قصر الشمع کے درمیان صرف دریائے نیل حائل تھا۔ وہی دریائے نیل جس نے حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم بنی اسرائیل کو راستہ دے دیا تھا اور ان کا تعاقب کرنے والے فرعونی لشکر کو دریا میں غرق کر دیا تھا۔ وہی نیل آج مسلمانوں کا سدراہ تھا۔ دریائے نیل کا چڑھتا ہوا پانی ایک بلندی تک پہنچ کر رک گیا تھا اور اس میں روز بروز کمی واقع ہو رہی تھی۔ دریا کی طوفانی موجوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح بظاہر تمام آثار مسلمانوں کے حق میں تھے لیکن سپہ سالار اسلام عمروؓ بن عاص دریا پار کرنے میں تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ وہ رومیوں کی طاقت سے مرعوب ہو گئے تھے یا مسلمان لشکر تھکن محسوس کر رہا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسلامی لشکر کے پاس دریا پار کرنے کے لیے کشتیاں نہ تھیں اور پورے لشکر کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر اتنے چوڑے دریا کو پار کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جبکہ عمروؓ بن عاص نے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک مسلمان کو بھی بلاوجہ ضائع نہیں کریں گے۔

حضرت عمروؓ بن عاص کا مصر کے سلسلے میں یہ آخری معرکہ تھا۔ اس کے بعد اسکندریہ بھی اگرچہ ایک زبردست قلعہ تھا جسے بحری جہازوں کے ذریعہ یورپ سے مدد ملا کرتی تھی لیکن عمروؓ بن عاص خاص طور پر قلعہ قصر الشمع کو قلعہ اسکندریہ پر فوقیت دیتے تھے اور اس لیے انہوں نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو ایک خط بھجوایا تھا جس میں فوجی مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ مگر مصر سے مدینہ منورہ تک خط پہنچنا پھر وہاں سے فوجی مدد آنا، اس میں کافی وقت لگتا تھا۔

ادھر یہ کیفیت تھی کہ دریا پار قلعہ قصر الشمع اور اسکندریہ کے درمیان رابطہ قائم تھا اور اسکندریہ کا رومی جرنیل قصر الشمع کے جنرل جارج کو حتی الامکان کمک پہنچا رہا تھا مگر یہ کمک اتنی نہ تھی جتنی جارج کو ضرورت تھی۔ کیونکہ اسکندریہ کے رومیوں کو معلوم تھا کہ زیریں حصہ فتح کرنے کے بعد مسلمان اسکندریہ کا رخ ضرور کریں گے۔

سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے قاسم کو ایک بڑے دستے کے ساتھ دریائے نیل کے مشرقی ساحل کی حفاظت اور دیکھ بھال پر مقرر کیا اور خود دریا سے ہٹ کر ایک اونچی جگہ اپنے لشکر کے ساتھ مقیم تھے۔ قاسم کو کیرات کے ساتھ دوستی نبھانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ پس اس نے کیرات سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ پہلی بار جب قاسم اپنے فوجی دستے کے ساتھ سرائے میں پہنچا تو کیرات کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ مگر قاسم نے اسے تسلی دے کر مطمئن کر دیا تھا۔

اب قاسم اور کیرات کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ قاسم اکیلا یا اپنے دو ایک ساتھیوں کو لے کر کیرات کے پاس پہنچ جاتا اور اسے تسلی دے کر مطمئن کر دیتا تھا۔ ادھر قلعہ کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دریا کا پانی تیزی سے اتر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی قلعہ قصر الشمع پر حملہ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک شام قاسم تنہا کیرات سے ملنے گیا۔ کیرات نے اسے ایسی دھماکا خیز خبر سنائی کہ وہ سناٹے میں آ گیا۔ کیرات نے بڑے یقین کے ساتھ قاسم کو بتایا۔

"میرے دوست! قلعہ کے گورنر نے ایک عجیب اعلان کیا ہے۔"

"اس نے پھر کوئی نیا جھوٹ بولا ہوگا۔" قاسم نے ہنستے ہوئے کیرات کو جواب دیا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔" کیرات اب قاسم سے آپ جناب کے ساتھ بات کرتا تھا۔

"اچھا کیا جھوٹ بولا ہے اس نے؟" قاسم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"گورنر نے اعلان کیا ہے کہ وہ دریائے نیل کو "عروس نیل" کی تیسری قربانی پیش کرے گا۔"

قاسم ہنسا اور بولا۔ "وہ پاگل ہو گیا ہے۔ دوسری قربانی سے اسے کیا حاصل ہوا جو وہ تیسری قربانی سے حاصل کرے گا؟"

"لیکن دوست!" کیرات نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اس دفعہ وہ شہزادی ارمانوس کو عروس نیل بنا رہا ہے۔"

"ارے......؟" قاسم کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ ہکا بکا ہو کر کیرات کو دیکھنے لگا۔

قاسم کے ہوش ذرا درست ہوئے تو اس نے مضمحل لہجے میں پوچھا۔ "کیرات! کیا تمہیں یقین ہے کہ شہزادی ارمانوس، عروس نیل بننے پر آمادہ ہو جائے گی؟"

قاسم نے کیرات کے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔ قاسم نے کہا۔ "ارمانوس ایک سمجھ دار شہزادی ہے۔ وہ جارجس کے فریب میں نہیں آئے گی۔"

"شہزادی ارمانوس مجبور ہے قاسم!" یہ آواز ایک اجنبی خاتون کی تھی جو کیرات کے کمرے میں جھانک رہی تھی۔

قاسم اور کیرات دونوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کیرات اسے پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا لیکن قاسم نے اسے فوراً شناخت کر لیا۔

"تلشا تم...... تم نے دریا کیسے پار کیا؟"

شہزادی ارمانوس کی رازدار سہیلی دروازے سے آگے بڑھ کر قاسم کے پاس پہنچی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "مسلم سردار! کل شہزادی ارمانوس کو "عروس نیل" بنا کر کشتی میں سوار کر دیا جائے گا۔ گورنر جارجس نے قلعہ والوں کو یقین دلایا ہے کہ اگر شہزادی ارمانوس کو قربان کر دیا جائے تو دریا میں زبردست طغیانی آ جائے گی اور مسلمان حملہ آور دریا پار نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ غلط ہے...... بالکل غلط تلشا......" قاسم چیخ پڑا۔ "مسلمان تو اس وقت بھی دریا پار کر کے قلعہ پر حملہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک خاص وجہ سے حملہ نہیں کر رہے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی سردار قاسم!" تلشا نے فوراً سوال کیا۔

قاسم گھبرا گیا۔ وہ کیسے بتاتا کہ مسلمان مدینہ سے کمک آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایک فوجی راز تھا۔ جسے سوائے سپہ سالار عمرؓو بن عاص یا چند خاص سرداروں کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ قاسم نے فوراً خود کو سنبھالا اور ٹالنے کے لیے کہا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تلشا یہ بتاؤ کہ شہزادی نے میرے لیے کوئی پیغام بھیجا ہے کیا؟"

"ہاں سردار قاسم!" تلشا فوراً بولی۔ "اسی لیے میں جان پر کھیل کر تمہارے پاس پہنچی ہوں تمہارے سپاہیوں نے مجھے ساحل پر اترتے ہی حراست میں لے لیا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سردار قاسم کے لیے شہزادی کا ایک پیغام لے کر آئی ہوں تو وہ آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

تلشا نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کی سانس پھول گئی اور وہ ہانپنے لگی۔ اس وقت قاسم نے تلشا کو تسلی دی۔

"شہزادی نہیں تلشا! اب تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جو کہنا ہے اطمینان سے کہو۔"

تلشا نے فوراً کہنا شروع کر دیا۔ "شہزادی ارمانوس نے کہا ہے کہ جارجس نے شاہ مقوقش کو بھی فریب دیا ہے۔ اس لیے شہزادی نے قاسم سے درخواست کی ہے کہ اس کی جان بچائی جائے اور اسے دریا میں ڈبونے سے روکا جائے...... کل...... کل......" اور تلشا کی آواز بیٹھنے لگی۔

قاسم نے چیخ کر پوچھا۔ "کل...... کس وقت...... کہاں...... کیسے......؟"

اور تلشا نے جلدی جلدی بتایا۔ "کل صبح پہلی کرن کے ساتھ شہزادی کو ایک سجی ہوئی کشتی میں سوار کیا جائے گا اور اس کشتی کے ساتھ ایک اور چھوٹی سی کشتی بندھی ہوگی۔ یہ کام قلعہ قصرالشمع سے ایک میل دور جنوب میں ہوگا۔ شہزادی کی کشتی پر ایک اور شخص سوار ہوگا جو کچھ جنتر منتر پڑھنے کے بعد شہزادی کو چھوٹی کشتی میں اتار دے گا اور پھر اس چھوٹی کشتی میں نیزہ مار کے سوراخ کر دے گا تا کہ کشتی میں پانی بھر جائے اور شہزادی نیل کی لہروں میں غرق ہو جائے۔"

قاسم سوچ میں پڑ گیا۔ اسی وقت تلشا کی آواز آئی۔ "مسلم سردار...... مجھے اجازت دیجیے۔ شہزادی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

قاسم نے فوراً جواب دیا۔ "شہزادی کو اطمینان دلانا۔ خدا نے چاہا تو اس کی مدد کو ضرور پہنچوں گا۔"

تلشا چلی گئی اور قاسم سر پکڑ کر سوچنے لگا۔

پھر اسی رات قاسم نے سپہ سالار عمرؓو بن عاص سے ملاقات کی اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ سپہ سالار نے شہزادی کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا اور جب قاسم نے شہزادی کو بچانے کی درخواست کی تو سپہ سالار نے اسے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

جواں مرد قاسم رات کے آخری حصہ میں بیس سوار لے کر اس طرف چل پڑا جہاں شہزادی ارمانوس کو دریائے نیل کے سپرد کیا جانا تھا۔ یہ لوگ صبح ہونے سے پہلے پہلے اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہنچنے کے لیے تلشا نے اس سے کہا تھا۔

نماز فجر کے بعد جب قاسم نے دریا پار کیا تو دوسری طرف بہت سے لوگ موجود تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ صحیح مقام تک پہنچا ہے۔ سورج طلوع ہوتے ہی ایک آراستہ و پیراستہ کشتی دریا میں اتاری گئی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی کشتی بھی بندھی ہوئی تھی۔ قاسم نے اپنے ساتھ صرف چھ سوار لیے اور باقی کو حکم دیا کہ وہ کنارے سے ذرا ہٹ کے اس کشتی کو دیکھتے ہوئے پہاڑ کی طرف گھوڑے بڑھائیں جس میں شہزادی کو سوار کیا جانا تھا۔ شہزادی کی کشتی پر سرخ پھریرا اڑ کر یہ اعلان کر رہا تھا یہ شہزادی کی کشتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شہزادی ارمانوس کو کشتی میں اتار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تنومند فوجی بھی کشتی میں اتر گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ تھا۔ شہزادی کے کشتی میں اتارے جانے کے ساتھ ہی ساحل پر کھڑے پروہتوں نے جنتر منتر کا جاپ شروع کر دیا۔ وہ بیچ بیچ دیوی کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔ اب قاسم بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے کچھ دور پیچھے دریا میں اتر گیا۔ ان کے گھوڑے کمر کمر دریا پانی میں پہنچ کے رک گئے اور جیسے ہی شہزادی کی کشتی کنارے سے روانہ ہوئی، قاسم اور اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں تیرا دیئے۔

قاسم کا گھوڑا سب سے آگے تھا اور وہ جلد از جلد شہزادی کی کشتی کے قریب پہنچنا چاہتا تھا۔

شہزادی کی کشتی کنارہ چھوڑ کر تیز دھارے میں پہنچ

گئی تھی۔

اب ساتھ کے آدمیوں نے سہارا دے کر شہزادی کو چھوٹی کشتی میں اتار دیا تھا۔

دوسرے کنارے پر کھڑے لوگ "عروس نیل" کو نیل کے حوالے کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے نعرے بلند کر کے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ شہزادی کی چھوٹی کشتی لہروں پر ڈول رہی تھی اور دوسری کشتی میں کھڑا آدمی نیزے سے شہزادی کی کشتی میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قاسم اپنے گھوڑے پر بیٹھا تھا اور گھوڑے کو شہزادی کے قریب لانے کی تگ ودو میں مصروف تھا۔ اس دوران اس نے لگامیں منہ میں دبائیں اور کمان اتار کر اس میں تیر جوڑا اور شہزادی کی کشتی کو نشانہ بنانے والے پر تیر چلایا۔ مگر اس کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا اور تیر اس آدمی کے شانے کے پاس سے نکل گیا۔

قاسم نے فوراً کمان گلے میں لٹکالی کیونکہ اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس کا چلایا ہوا تیر کہیں شہزادی کو زخمی نہ کردے۔

اسی وقت شہزادی کی کشتی میں سوراخ ہو گیا اور کشتی میں تیزی سے پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ وقت بہت نازک تھا۔ قاسم کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ اسی سوچ و بچار میں تھا کہ شہزادی کی کشتی پانی بھرنے کی وجہ سے الٹ گئی اور شہزادی پانی میں غوطے کھانے لگی۔ قاسم نے گھوڑا چھوڑ دیا اور تیزی سے تیرتا ہوا کشتی کے قریب پہنچ گیا۔

شہزادی بدحواس ہو کر پانی میں غوطے کھا رہی تھی۔ قاسم تیرتا ہوا شہزادی کے قریب پہنچا اور اس نے شہزادی کے بالوں کو پکڑ کر اسے پانی سے تھوڑا سا اٹھا لیا۔ شہزادی بدحواسی میں غوطے کھا رہی تھی اور ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اسی وقت قاسم کا ایک دوست اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنا گھوڑا قاسم کے حوالے کر دیا اور خود پانی میں تیرنے لگا۔ قاسم کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگامیں آئیں تو وہ گھوڑے پر بیٹھ گیا اور اس نے شہزادی کو بالوں سے کھینچ کر اپنے آگے ڈال لیا۔ شہزادی اس وقت تک بے ہوش ہو چکی تھی۔

قاسم اپنے حواس درست رکھے ہوئے تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں بھی تھام رکھی تھیں اور اپنے آگے شہزادی کو بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس طرح وہ کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بے ہوش شہزادی کو لیے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اس کے ساتھی جو دریا کے کنارے اس کے ساتھ ہی گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ وہ سب کے سب جمع ہو گئے اور انہوں نے قاسم اور شہزادی کو کھینچ کھانچ کر دریا سے باہر نکال لیا۔

اس طرح جواں سال قاسم نے پہلی مرتبہ عروس نیل کو دریا کی خوف ناک موجوں کے پنجوں سے چھین لیا تھا۔

قصہ مختصر شہزادی ارمانوس کو سپہ سالار لشکر اسلام جناب عمروؓ بن عاص کے سامنے پیش کیا گیا۔ شہزادی ارمانوس فوراً ایمان لے آئی۔ سپہ سالار نے اسے قاسم کے حوالے کرنے کے بجائے مصر کی فتح تک فوج کی حفاظت میں رکھنے کا حکم صادر کیا۔

دوسری طرف سپہ سالار عمروؓ بن عاص کی کمک کی درخواست پر مدینہ منورہ میں فوراً غور کیا گیا اور دس ہزار سواروں کا ایک لشکر زبیرؓ بن عوام کی سپہ سالاری میں مصر روانہ کیا گیا۔

تازہ دم لشکر پہنچتے ہی عمروؓ بن عاص نے قلعہ الشمع پر بھرپور حملہ کیا۔ رومیوں نے شہر مصر کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ ان کی اس کوشش میں بے شمار رومی مارے گئے۔ شہر مصر اور قلعہ الشمع کا محاصرہ اگرچہ کچھ طول کھینچ گیا لیکن زبیرؓ بن عوام کی بے مثال شجاعت نے آخر رومیوں کو قلعہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

قلعہ کی فتح اس طرح ہوئی کہ ایک رات زبیرؓ بن عوام اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ ریشم کی بنی سیڑھیوں کے ذریعے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ اوپر پہنچ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ "اللہ اکبر" کے اس قدر فلک شگاف نعرے لگائے کہ قلعہ والے یہ سمجھے کہ مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ زبیرؓ بن عوام نے قلعہ والوں کی بدحواسی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسی طرح نعرے لگاتے ہوئے صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ پہرے دار انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور زبیرؓ بن عوام نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ لشکر اسلام تو باہر کھڑا ہوا اسی وقت کا منتظر تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دھڑا دھڑ قلعہ میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔

اسی طرح رومی لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہ مقوقش نے قریب کے دوسرے قلعہ میں بھاگ کر جان بچائی اور پناہ حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی شاہ مصر نے سپہ سالار لشکر اسلام کے پاس صلح کی سفارت بھیجی۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ مقوقش نے کسی وقت نامہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے لگا کر چوما تھا اور اس کا پورا احترام کیا تھا۔ اس کے پیش نظر شاہ مقوقش کی تمام تجویز کردہ شرائط سپہ سالار لشکر اسلام نے بغیر حیل و حجت کے تسلیم کر لیں۔

کچھ دن آرام کر کے لشکر اسلام نے مصر کے اس وقت کے دارالسلطنت اسکندریہ کا رخ کیا۔ سکندر اعظم کا آباد کیا ہوا یہ شہر اور بندرگاہ رومیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں پر ایک رومی بحری بیڑہ بھی رہتا تھا جہاں سے رومی دور دور تک حملے کرتے تھے۔ اسکندریہ میں ملکہ قلوپطرہ کا بنایا ہوا ایک بڑا مندر تھا۔ جسے عیسائیت کے عروج کے زمانہ میں سینٹ مارک کیتھڈرل کے گرجا میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

اسکندریہ کی جنگ میں قبطیوں نے برائے نام حصہ لیا۔ چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد رومیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور مصر کے قبطی ایک ظالمانہ حکومت کے پنجے سے ہمیشہ کے لیے نجات پا گئے۔

اس دوران قاسم اور شہزادی ارمانوس کی شادی ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ شہزادی ارمانوس اور جواں سال قاسم کی طویل رومانی داستان کا اگرچہ ہمارے ناول سے براہ راست کوئی تعلق نہیں مگر ہم نے اسے قارئین کی دلچسپی کے لیے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جب اسلامی فوجوں نے پوری طرح مصر پر قبضہ کر لیا تو حضرت عمرؓ خلیفہ دوم نے حضرت عمروؓ بن عاص جو لشکر اسلام کے سپہ سالار تھے۔ انہیں مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ ان کی گورنری کو کچھ عرصہ ہوا تھا کہ دریائے نیل اتفاق سے خشک ہو گیا۔ مصر کے دستور کے مطابق جب دریا خشک ہوتا تھا تو اسے ایک دوشیزہ کی قربانی دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے مصریوں کے اعتقاد کے مطابق دریا میں پانی آ جاتا تھا۔

پس لوگ مصر کے گورنر عمروؓ بن عاص کے دربار میں ایک وفد کی صورت میں پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ انہیں حسب سابق ”عروسِ نیل“ کی قربانی دینے کی اجازت دی جائے تاکہ دریا میں پانی جاری ہو اور ملک میں قحط نہ پڑے۔ اس وقت کوئی مصری نہیں بلکہ ایک مسلمان گورنر تھا۔ چنانچہ گورنر عمروؓ بن عاص نے فوراً اپنی کیبنٹ کی میٹنگ طلب کر لی جس میں عام طور سے زیادہ مسلمان ہی تھے۔ انہوں نے طویل بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ دریا کو کسی زندہ انسان کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کی قربانی نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ یہ بات سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

پس انہوں نے مصریوں کے وفد کو بلا کر انہیں مطلع کیا۔

”اسلام اس طرح کی قربانی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ان کی درخواست قبول نہیں کی جا سکتی۔“

اس جواب سے مصریوں میں بہت بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ انہیں قحط کا سامنا تھا۔ اب مصریوں اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا اور بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ اس معاملہ یا مقدمہ کو دربارِ خلافت میں پیش کیا جائے اور وہاں سے جو حکم صادر ہو اس پر عمل کیا جائے۔

چونکہ معاملہ بہت سنگین تھا اس لیے فوراً دربار خلافت کو مصریوں کے مطالبہ کی پوری تفصیل ایک طویل خط کے ذریعے بھیجی گئی اور قاصد کو تاکید کی گئی کہ وہ دربار خلافت کا فیصلہ یا حکم نامہ اپنے ساتھ لے کر آئے۔

پس یہاں کا قاصد بھاگم بھاگ دربار خلافت مدینہ منورہ پہنچا اور خلیفہ حضت عمرؓ اور دربار خلافت کو مصری مطالبہ یا درخواست سے آگاہ کیا۔ خلیفہ حضرت عمرؓ نے خود اس مسئلہ پر بہت سنجیدگی سے غور و فکر کی اور مشیروں کی رائے معلوم کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے خود اپنے قلم سے دریائے نیل کو یہ خط لکھا۔

”یہ خط اللہ کے بندے عمر بن خطاب کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام ہے کہ......

اے دریا اگر تو خدا کے حکم سے بہتا ہے تو ہم خدا ہی سے تیرے جاری ہونے کا سوال کرتے ہیں اور اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے ایک خط گورنر مصر کے نام بھی لکھا اور انہیں تاکید کی کہ میں نے دریا کے نام جو خط لکھا ہے اسے لے جا کر دریا کی ریت

میں ڈال دو۔

پس مصر کے گورنر عمروؓ بن عاص نے خلیفہ کے حکم کے مطابق وہ خط لے جا کر دریا کی ریت میں ڈال دیا۔

اور پھر جب گورنر نے وہ خط دریا کی ریت میں ڈال دیا کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں پانی آ گیا۔ اس دن کے بعد سے آج تک دریائے نیل کبھی خشک نہیں ہوا۔ حالانکہ اس عظیم واقعہ کو تقریباً چودہ سو سال ہونے کو آئے ہیں۔

سچ ہے دونوں جہاں کا مالک و خالق خداوند کریم ہے۔

❀❀❀❀

تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اس سے قبل فلسطین کے وہ لوگ جو ایام حج میں اپنی غربت کی بناء پر مکہ و مدینہ تک نہ جا سکتے تھے۔ وہ ان ایام میں بیت المقدس میں جمع ہوتے اور قبلہ اول کی زیارت کو عزت اور توقیر جانتے تھے۔ لیکن عبدالمالک کے دور میں اس شہر کی عظمت اور وقار میں زیادہ اضافہ ہوا اور وہ لوگ جو عبداللہ بن زبیر اور خلیفہ عبدالمالک کی جنگوں کے خوف سے حرمین شریفین حج کو نہیں جا سکتے تھے وہ اس طرف کا رخ کرنے لگے تھے۔

تاریخ اس مقدس شہر پر نازل ہونے والی برکات کا شمار نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان عظمتوں کو سمیٹ سکتی ہے جو اسے اسلامی دور حکومت میں حاصل تھیں۔ البتہ تاریخ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دور حکومت میں بیت المقدس امن و امان کا مرکز اور علم و ہنر کا گہوارہ تھا۔ اور جب خلافت امیہ کا آفتاب غروب ہوا اور اس کی جگہ بنو عباس آئے تو بیت المقدس بھی عباسیوں کی تولیت میں چلا گیا۔ عباسیوں نے اس کی انتظامی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ خلیفہ مہدی اور خلیفہ المامون نے اس متبرک شہر کی زیارت کی۔

”نفقور“

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کے تسلط کو عیسائیوں نے کبھی برداشت نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے قبضے سے ناخوش رہے اور روم کی عیسائی سلطنت کے حکمرانوں نے اسلامی سرحدوں پر بار بار حملے کیے لیکن انہیں ہر بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ خلیفہ ہارون رشید کے بعد حکومت میں ”نفقور“ نے قسطنطنیہ کے تخت پر قبضہ کر لیا تو اس نے عباسی خلیفہ کو جنگ کا چیلنج دیتے ہوئے ایک نہایت گستاخانہ خط دربار خلافت کو لکھا جس کا جواب خلیفہ ہارون رشید نے ان مختصر الفاظ میں دیا۔

”اس کا جواب وہ ہے جو تو آنکھوں سے دیکھے گا اور کانوں سے سنے گا۔“

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلیفہ ہارون رشید نے نفقور کو شکست دے کر اپنا باجگزار بنا لیا۔

اسلامی سلطنت کی اس عظمت سے متاثر ہو کر مغربی ممالک کے سربراہ شاہ فرانس ”شارلیمان“ نے خلیفہ ہارون رشید کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور سفارت بھیجی۔

خلیفہ ہارون رشید نے دوران جنگ بھی القدس میں عیسائی زائرین پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ عیسائی سفیر بھی القدس گئے اور انہوں نے وہاں خیرات بانٹی۔ ان کی واپسی پر خلیفہ ہارون رشید نے ان کے ہاتھ شاہ فرانس شارلیمان کو مزارِ مقدس کی چابیاں بھیجیں۔ یہ واقعہ ۸۰۰ء کا ہے۔

خلیفہ مامون رشید کے عہد خلافت میں رومی فوجوں نے ایک بار پھر اسلامی سرحدوں پر یلغار کی تھی اور طربوس اور مصیصہ پر قبضہ کر کے ۴۴۰۰ مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں خلیفہ مامون

رشید بھی ایک بڑے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے رومیوں کو شکست سے دوچار کیا۔ پھر اپنے بھائی معتصم باللہ کو رومیوں کے تعاقب کا حکم دے کر دارالخلافہ واپس ہوا تھا۔

اس کے بعد خلافت معتصم کے عہد میں ابوحرب برقع یمانی نے بغاوت کر کے جند ''فلسطین'' پر قبضہ کر لیا لیکن اس کی بغاوت کو رجا بن ایوب نے جلد ہی ختم کر دیا۔ ابوحرب کی بغاوت کا قصہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

ایک ترکی سپاہی نے ابوحرب کے گھر ٹھہرنا چاہا۔ ابوحرب اس وقت موجود نہ تھا۔ سپاہی نے عورت کو کوڑا مارا۔ جب ابوحرب گھر آیا تو بیوی نے اس سے تمام حال بیان کیا اور کوڑے کی مار کا نشان دکھایا۔ ابوحرب اشتعال میں آ گیا اور تلوار کھینچ کر سپاہی کی تلاش میں نکلا۔ سپاہی اسے مل گیا تو ابوحرب نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور خود روپوش ہو گیا۔ پھر وہ ایک مدت کے بعد ایک لشکر کے ساتھ ظاہر ہوا اور اس نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔''

خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ میں قیصر روم ''توفیل'' نے اسلامی سرحدوں پر حملے کیے اور مقام ''زبطرہ'' پہنچ کر اسے آگ لگا دی۔ پھر ایک ہزار خواتین کو گرفتار کر کے لے گیا۔ جب خلیفہ معتصم باللہ کو اس یلغار کی خبر ملی تو وہ کمر کس کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے فوراً عام بھرتی کا اعلان کیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ روم پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں معتصم باللہ یلغار کرتا ہوا فیل کے شہر ''عمودیہ'' تک پہنچ گیا تھا۔ اس حملہ میں بڑا جدال و قتال ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے خلیفہ معتصم باللہ کو کامیاب کیا۔ پھر جب خلیفہ کامیاب و کامران سامرہ واپس پہنچا تو اس نے اس خوشی میں ایک بڑا جشن منایا۔ رومیوں نے اس شکست کے بعد بھی خلیفہ معتصم باللہ کے عہد خلافت میں اسلامی سرحدوں پر بار بار حملے کیے مگر انہیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

خلیفہ معتصم باللہ کے بعد جب خلافت موفق کے ہاتھ میں آئی تو خلافت عباسیہ پر زوال آنا شروع ہوا اور موفق کے بعد عباسی خلیفہ معتمد کے زمانہ میں تو یہ حال ہوا کہ ہرات سے لے کر فارس تک بنی سامان خود مختار ہو گئے۔ دوسری طرف مصر میں ۲۶۴ ہجری یعنی ۸۴۸ء میں بنی سامان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے فلسطین کو بھی اپنے دائرہ حکومت میں شامل کر لیا۔ اس طرح بیت المقدس، خاندان طولونیہ کے قبضہ میں آ گیا اور اس خاندان نے اپنا رنگ جمایا۔ اس زمانہ میں نہ صرف رومی حملوں کا زور ٹوٹ گیا بلکہ ابن طولون نے رومیوں کے حدود اور شہروں کی خوب تاراجی کی۔

طولون خاندان کو خلیفہ مستنصر کے دور خلافت میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ رومیوں کا یہ حال ہوا کہ وہ خمارویہ بن طولون کے ڈر کی وجہ سے اسلامی سرحد میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ پھر جب عباسی خلیفہ المکتفی کا دور آیا تو عباسی خلافت کا چراغ گل ہونے لگا۔ امیر و وزیر امت کی مصلحتوں سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی غرض کے لیے دست و گریباں ہو گئے۔ اس طرح شیبان بن احمد طولون کی حکومت کے ساتھ ہی دولت طولونیہ اس قدر کمزور ہو گئی کہ اس کی جگہ دولت زخشیدیہ نے لے لی اور اس نے بیت المقدس کو اپنے دائرہ اختیار میں لے لیا۔

اس دور میں رومیوں نے پھر سر اٹھایا اور اسلامی سرحد کے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا۔ مگر خلیفہ مقتدر کے ایک غلام جس کا نام ثمل تھا، نے نہ صرف رومیوں کا زور توڑ دیا بلکہ رومیوں کو انگورہ

اور عموریہ تک مار بھگانے میں کامیاب ہوا۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود خلافت عباسیہ پر زوال آتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ حکومت عباسیہ کا وقار خلیفہ الراضی کے عہد میں بالکل ختم ہو گیا اور مصر کی زخشیدی خلیفہ کی جگہ فاطمیوں نے لے لی۔

مگر اسلامی حکومت کا زوال آیا تو آتا ہی چلا گیا۔ خلیفہ مطیع فاطمی کے عہد خلافت میں رومیوں نے اسلامی سرحدوں میں گھس کر مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا، انہوں نے مسجدیں جلا ڈالیں۔ مسلمانوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مسلمان امیر و وزیر یہ حال دیکھ رہے تھے مگر اپنی غرض کے لیے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے اور دشمن کا زور توڑنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار نہ کی۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ امام ابوبکر محمد اسماعیل بن قفال عروض شافی نے بیس ہزار کی جماعت سے رومیوں کا مقابلہ کرنا چاہا تو رکن الدین دیلمی نے انہیں آگے نہ بڑھنے دیا۔ پھر ۹۷۸ء میں فاطمی خلیفہ معز نے زخشیدیہ حکمران کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک بیت المقدس فاطمی خلیفہ کے قبضہ اقتدار میں رہا۔ پھر تین عرب رؤسا نے مل کر فاطمیوں کو ملک شام سے نکال باہر کیا اور مصر تک حسن امیر اور بنی طے حکمران ہوئے مگر دوسرے ہی سال بنو فاطمہ پھر قابض ہو گئے۔ عرب امراء کی اس باہمی چپقلش اور عیسائی حکمرانوں کے ظلم و تشدد کے باوجود بیت المقدس کو عیسائی زائرین کے لیے کھلا رکھا گیا۔ چنانچہ ۱۰۵۳ء رابرٹ شاہ نارمنڈی فرانس، ۱۰۵۴ء میں فرانس کے شاہ لیفر برٹ، ۱۰۶۵ء میں جرمنی کے باسیوں نے القدس کا حج کیا اور عیسائی مراعات اور حکمران طبقے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس دور میں آل سلجوق نے زور پکڑا اور رومیوں سے بدلہ لینے کے لیے ملک شاہ سلجوق نے پہلے تو القدس کے دفاعی استحکامات مضبوط کیے۔ یہ واقعہ ۴۶۷ ہجری یعنی ۱۰۷۱ء کا ہے۔ وہ انطاکیہ سے قسطنطنیہ تک رومیوں کو پسپا کرتا چلا گیا اور ان کے ملک میں پچاس مقامات پر منبر قائم کیے۔ آخر قیصر نے ایک ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کی۔ تمام فتوحات میں دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔ شاہ کے عہد ہی میں بیت المقدس کی شان و شوکت بحال ہو گئی۔ لیکن پھر ۱۰۸۴ء میں ترکمان سردار افق کی بغاوت چند ہفتوں بعد ہی ختم ہو کر رہ گئی۔

اس صدی عیسوی یعنی دسویں صدی میں ''مقدسی'' جو اس شہر کا باشندہ تھا اور ایک مورخ ''اصطخری'' نے جو فاطمی خلیفہ کے عہد میں گزرا ہے وہ دونوں بیت المقدس کے حالات میں لکھتے ہیں۔

''بیت المقدس ایلیا اور البلاط کے نام سے معروف ہے۔ شہروں میں اس سے بڑا کوئی شہر نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض دارالملک بھی اس سے چھوٹے ہیں۔ یہاں گرمی یا سردی کی شدت نہیں اور برف شاذ و نادر گرتی ہے۔''

ان مصنفین نے ایک اور جگہ لکھا ہے۔

''قاضی حرمین شریفین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) کے فرزند قاضی ابوقاسم نے ایک مرتبہ مجھ سے وہاں کی آب و ہوا کا حال دریافت کیا تو میں نے جواب دیا۔

''وہ بین بین ہے۔ یعنی نہ بہت گرم نہ بہت سرد۔''

انہوں نے جواب دیا۔

"ھذا صفة جنة" جنت کی صفت کی حامل بیت المقدس کی عمارتیں پتھر کی ہیں۔ اتنی مضبوط

عمارتیں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئیں گی۔ ایسے پاک اور عفیف لوگ بھی آپ کو کہیں اور نہیں ملیں گے جیسے بیت المقدس کے ہوتے ہیں۔ یہاں خوردنی اجناس بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ منڈیاں پاک وصاف رہتی ہیں۔ یہاں کی مسجد سب سے بڑی ہے۔ اس سے زیادہ تعداد میں مقدس مقامات کہیں اور نہیں۔ یہاں انگور کی کثرت ہے اور ایسا انگور کسی اور جگہ نہیں ہوتا۔ بیت المقدس میں صادق اطباء اور حکماء کا اجتماع ہے۔ اس لیے ہر شخص ان کی طرف کھنچتا ہے۔ سال کے کسی زمانہ میں بھی اس کے کوچہ و بازار پردیسیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ اس کے سب شہروں سے ممتاز ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ اس شہر میں دنیا اور آخرت کی تمام خوبیاں جمع ہیں۔ ابنائے دنیا جو آخرت کے بھی مشتاق ہوتے ہیں۔ اس شہر میں اپنی پسند کی اجناس کی منڈیاں پائیں گے اور اسی طرح ارباب آخرت جنہیں اس دنیا کی نصیحت کی بھی ضرورت ہے۔ ان کو دونوں باتیں یہاں میسر آئیں گی۔ رہا اس شہر کا اللہ کی نعمتوں سے سب شہروں سے زیادہ بہرہ ور ہونا تو حق یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس شہر میں پست و بلند میدان وکوہستان غرض ہر طرح کی زمین کے اور بالکل متضاد قسم کے میووں سے اسے بھرا ہے۔ مثلاً نارنگی اور بادام، کھجور اور جوز، انجیر اور موز وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ دودھ، شہد اور شکر کی افراط ہے۔

بیت المقدس میں کوئی خراب نہیں۔ شراب عام طور پر نہیں پی جاتی۔ نہ بدمستی اور مدہوشی نظر آتی ہے۔ شہر میں خفیہ یا اعلانیہ قحبہ خانے نہیں ہیں۔ لوگ اپنے تقویٰ اور خلوص میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہ خبر اڑی کہ والئی شہر نے شراب پی ہے۔ تو لوگوں نے اس کے گھر کے گرد دیوار بنادی کہ لوگ اس کی دعوتوں میں نہ جانے پائیں۔

لیکن مقدسی، اس شہر میں یہود و نصاریٰ کے غلبہ کی بھی شکایت کرتا ہے اور لکھتا ہے۔

''بیت المقدس کے گرد چالیس میل کا نصف قطر میں جتنا علاقہ ہے وہ سب اس شہر کی حدود میں داخل ہے اور اس میں بہت سے گاؤں ہیں۔''

پھر لکھتا ہے۔

''یہ زمین ہے جسے اللہ پاک نے بابرکت بنایا ہے۔ یہاں پہاڑوں پر نیز میدانوں میں درختوں کی کثرت ہے۔ کسی آب رسانی یا نہری پانی کی ضرورت نہیں۔ گرمیوں میں جس وقت جنوبی ہوا چلتی ہے تو ہر شب اس شدت سے اوس پڑتی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی موریوں میں پانی آجاتا ہے۔''

مقدسی کے اس بیان کی تصدیق کننگ ہیم نے کی ہے۔ وہ ارض مقدس اور بائبل میں لکھتا ہے۔

''فلسطین میں صاف اور روشن مطلع دن کی گرمی کو بہت جلد فضا میں منتشر کر دیتا ہے جس کے باعث وہاں کی راتیں سرد ہوتی ہیں جبکہ دن گرم ہوتے ہیں۔ ہوائے شب کی یہی برودت، آب رسانی کا وہ کام کرتی ہے جس کے بغیر نباتات کی زندگی ناممکن ہے۔ ہوا کی تمام رطوبت ملک پر سے گزرتے ہوئے یہیں چھٹ جاتی ہے اور فضا کی برودت اسے ابخرات میں بدل دیتی ہے۔ جو کہر کا باران نعمت بن کر ہر سوکھے پتے تک نمی پہنچاتے ہیں۔''

مقدسی کے بعد ایرانی سیاح ناصر خسرو ۵، مارچ ۱۰۴۷ء کو بیت المقدس میں وارد ہوا۔ وہ لکھتا ہے۔

شام اور نواحی ملک کے باشندے بیت المقدس کو ''القدس'' کہتے ہیں اور اگر ان علاقوں کے باشندے حج بیت اللہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو انہی مقررہ ایام میں بیت المقدس آتے اور شعارِ مذہبی بجالاتے ہیں۔ اس جگہ حج کے دن قربانی کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض سنین میں ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں یہاں ہزار تک اشخاص جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ ختنہ کی رسم ادا کرنے کے بعد وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ نیز یونانیوں کے علاقے اور دوسرے ملکوں سے یہود و نصاریٰ بھی بڑی تعداد میں یروشلم آتے ہیں۔''

ناصر خسرو آگے لکھتا ہے۔

بیت المقدس کے گرد اراضی اور مواضع پہاڑی ڈھلوانوں پر واقع ہیں۔ زمین عمدہ اور زراعت کے قابل ہے۔ گیہوں، زیتون اور انجیر کی کاشت ہوتی ہے۔ اور بھی قسم قسم کے درخت یہاں پائے جاتے ہیں۔ آس پاس کوئی چشمہ نہیں جس سے آب پاشی کی جائے۔ لیکن پیداوار پھر بھی بہت زیادہ اور نرخ معتدل ہیں۔ اکثر بڑے لوگوں کی زمینوں میں پچاس ہزار من یعنی سولہ ہزار گیلن تک روغن زیتون نکلتا ہے۔''

بیت المقدس کے بارے میں ایک قول بہت مشہور ہے۔ وہ قول یہ ہے کہ۔

''یروشلم میں قحط کبھی نہیں پڑتا۔''

پوپ سلاسٹر کی ہرزہ سرائی

بعض مورخین نے بیان کیا ہے کہ ۹۸۶ء میں پوپ سلاسٹر بیت المقدس کی زیارت کو آیا تو اس نے واپسی پر شہر مقدس کے عیسائیوں پر ظلم وستم کی فرضی داستانیں لوگوں میں بیان کیں جس کے نتیجے میں فرانس اور اٹلی کے اسلحہ بند گروہ زیارت کے بہانے یہاں آتے اور لوٹ مار کر کے واپس جاتے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر اس کا یہ اثر ہوا کہ ملک شام اور مصر میں آباد عیسائیوں پر سختی کی جانے لگی۔ فاطمی خلیفہ نے انہیں اپنے مذہب کی پیروی کرنے سے روک دیا اور ان کے گرجا چھین لیے۔ اس کے باوجود فرانس اور اٹلی کے اسلحہ بند گروہوں اور مقامی عیسائیوں کی شرارتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

عمل اور ردعمل کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ ۱۰۰۸ء میں فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ کے حکم سے مرقد مسیح کو کھود کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اور دوسری زیارتیں بھی تباہ ہوئیں۔ یہ ایک غلط اور خطرناک اقدام تھا۔ عیسائی اس سلوک سے بہت دل برداشتہ ہوئے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتے رہے۔ آئندہ چالیس سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ۱۰۴۸ء میں مرقد مسیح کو اٹھانے والے خلیفہ کے پوتے المستنصر باللہ نے مرقد مسیح کو دوبارہ تعمیر کرادیا۔ مرقد کی یہ نئی تعمیر پہلے کے مرقد سے زیادہ خوب صورت اور عظیم تھی مگر تاریخ سے یہ الفاظ کون مٹا سکے گا کہ فاطمی خلیفہ کے حکم سے مرقد مسیح کو کھود کے پھینک دیا گیا۔

المستنصر کے اس سلوک کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس میں اور قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خلیفہ کی ماں ماریہ ایک خوش عقیدہ عیسائی خاتون تھی اور اس کی کوشش سے معاہدہ طے پایا تھا۔ مرقد مسیح کی تعمیر کی وجہ کچھ بھی ہو مگر حقیقت ہے کہ مصر کے خلیفہ کو یقین دلایا گیا تھا کہ عیسائی اب کوئی شرارت نہیں کریں گے اور پرامن رہیں گے۔

پھر جب فاطمی خلافت کے زوال کے بعد اور ترکان آل سلجوق پر قدرت مہربان ہوئی تو ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سالار نسر خوارزمی نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے فاطمی خلیفہ کی بجائے عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کا خطبہ پڑھایا۔ ان تمام کوششوں اور اکھاڑ پچھاڑ کے باوجود انتشار اور بدامنی کا دور دورہ رہا۔ عیسائی بار بار حملہ کرتے اور پسپا ہو جاتے۔ ان کی یہ تمام کوشش دراصل عیسائیوں کی بیت اللہ پر قبضہ کی خواہش کا نتیجہ تھا۔

تاریخ بارہویں صدی عیسوی کے آخری چند برسوں کا ایک انوکھا باب بتاتی ہے۔ اس وقت حالات یہ تھے کہ عباسی خلافت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور سلجوق ترکمان آپس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی مرکزیت انتشار کا شکار تھی اور عیسائیوں کے مشرقی اور مغربی کلیسا متحد ہو رہے تھے تا کہ بیت المقدس کو مسلمانوں سے حاصل کیا جائے۔ اور آخر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ عیسائی مورخین محار بات ہلال وصلیب یعنی صلیبی جنگوں کے آغاز کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ جب آل سلجوق نے فلسطین پر قبضہ کیا تو عیسائیوں کے لیے "حج" مشکل اور خطرناک ہوگیا۔

اس دوران پادری پطرس زیارت کو آیا جس نے واپس جاتے ہی مسیحی دنیا میں ہلچل مچادی۔ اس نے پوپ ارمن ثانی سے عیسائی حکمرانوں اور سرداروں کے نام خط لکھوائے اور وہ خود ۱۰۹۵ء میں گدھے پر سوار ہوکر فرانس اور جرمنی کے دورے پر نکلا۔ وہ شہر شہر قریہ قریہ پھرتا رہا اس عالم میں کہ لکڑی کی ایک صلیب جو علم کی طرح سیدھی تھی، اس کے کاندھے پر ہوتی تھی اور وہ دھاڑیں مار مار کر روتا اور "جہاد مسیح" کے نعرے لگاتا تھا۔

پادری کی دیوانگی یا شدت کا یہ نتیجہ نکلا کہ پورے یورپ میں تلاطم برپا ہوگیا۔ عیسائیت کے یہ مذہبی دیوانے بپھر کر بیت المقدس پر گدھوں اور چیلوں کی طرح جھپٹ پڑے اور مذہبی جوش اور جنون میں بیت المقدس کو عربوں سے چھین لیا۔

مگر عیسائی مؤرخین آل سلجوق کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکے کہ اس زمانہ میں عیسائی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے۔ ان کے معاشرے میں مجرموں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ پادری کلیسائے منبر پر چڑھ کر پکارتے تھے کہ:

"جو مجرم ہے، بیت المقدس جا کر گناہوں کی معافی مانگے۔ اسے جنت مل سکتی ہے۔"

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسائی زائرین کے گروہ زیادہ تر مجرموں پر مشتمل ہوتے تھے۔ جب ایسے زائرین میں اضافہ ہوا تو ترکمانوں نے بلا اجازت ان کے آنے پر پابندی لگا دی اور حکم ہوا کہ زائرین ڈھول تاشے اور باجے گاجے کے ساتھ نہ آئیں بلکہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ شہر میں قدم رکھیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ وہ راہب نیم پاگل تھا اور اپنی بیوی سے جھگڑا کرنے کی وجہ سے وہ راہب بنا تھا۔ اس نے پورے یورپ کو اس حملے کے لیے اکسایا۔ اس نیم پاگل پادری نے اپنے لیے "ولی اللہ" کا مقام پیدا کرلیا تھا۔

ان دنوں عیسائی سلطنت کمزور ہو رہی تھی اور مختلف مقامات پر تر کی سرداروں نے چھوٹی چھوٹی نیم آزاد ریاستیں بنالی تھیں۔ فلسطین پر بھی ترکمانوں کی حکومت تھی۔ اس وقت یہ بھی نیم مذہبی عقیدہ پھیلا ہوا تھا۔ عقیدہ یہ تھا:۔

"حضرت عیسیٰؑ روئے زمین پر نازل ہوکر ایک ہزار سال تک ایک ایسی عیسائی سلطنت قائم کریں گے جس میں صلح وآشتی اور نیکی کا دور دورہ ہو گا۔ یورپ والوں کا یہ بھی خیال تھا کہ اس بے نظیر عیسائی سلطنت کا آغاز مسلمانوں کو فلسطین سے نکالنے کے بعد شروع ہو گا۔ چنانچہ مختلف عیسائی ممالک کے سپاہی اس مقدس فرض کی ادائیگی کے لیے کمر بستہ ہوئے تھے۔"

عرب مورخین کے مطابق صلیبیوں نے سلجوق خاندان کے مظالم کی جتنی بھی داستانیں بیان کی ہیں وہ محض افسانہ ہیں جن کا اعتراف مغربی مؤرخین نے بھی کیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ آل سلجوق نے عیسائی

سلطنت کی سرحدوں پر حملہ سے تنگ آ کر جو جوابی کارروائیاں کیں اس نے عیسائیوں کے دلوں کو زخمی کر دیا تھا۔ آل سلجوق جنگجو ترک تھے جو وسط ایشیاء سے بگولہ بن کر اُٹھے اور آندھی بن کر دوسرے ممالک پر چھا گئے۔ سلطان الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کا تسلط تقریباً ختم کر دیا تھا۔

رومی شہنشاہ الیکس اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی فکر میں تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ملک شاہ کو مسلمانوں سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔ ملک شاہ کی وفات سے سلجوقی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ رومی شہنشاہ کے لیے مسلمانوں سے بدلہ لینے کا یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ اُس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور راہب پطرس کی زبانی یورپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا۔ یہ پیغام بڑا زہریلا اور شر انگیز تھا۔ شہنشاہ نے اپنے پیغام میں تحریر کیا تھا:۔

"مسلمانوں کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ ارض مقدس اور آثار مسیح کی حفاظت کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس سلسلے میں پوپ نے "بلاسنیا" میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس منعقد کیے۔ ان جلسوں میں نیم پاگل پیٹر بھی شامل تھا۔ اُس کی یاوہ گوئیوں اور ہرزہ سرائیوں سے متاثر ہوکر تمام حاضرین جلسہ نے اپنے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگوائی۔ پھر

"خدا کی مرضی یہی ہے خدا کی مرضی یہی ہے"

کے نعرے لگاتے ہوئے بیت المقدس کو چھڑانے کی قسم کھائی۔ اس لشکر کی روانگی ۱۰۹۶ء میں اس دن قرار پائی جس دن عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمانوں پر تشریف لے گئی تھیں۔

اس کے بعد پورے یورپ میں صلیب کی گونج سنائی دینے لگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عیسائی دنیا جنون میں گرفتار ہے۔ جنت کی خوشخبری، حصول دولت کا لالچ، زرخیز زمینوں پر قبضہ جیسے جھوٹے نعروں سے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ وغضب بھرا گیا۔ راہب اس موقعہ کو غنیمت جان رہے تھے۔ کیونکہ وہ خانقاہوں کی ذلت آمیز زندگی سے نجات کے خواہاں تھے۔ چنانچہ وہ بڑھ چڑھ کر مذہب کا نام لیتے اور لوگوں کو طرح طرح کا لالچ دیتے۔

یہ وہ وقت تھا کہ جس کسی نے صلیب پہن لی وہ تمام قرضوں اور ٹیکسوں سے بری کر دیا جاتا تھا اور وہ عیسائیت کا محافظ قرار پاتا تھا۔

عیسائی مورخ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ صلیبی جنون یورپ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دور دراز کے جزیروں تک بھی پہنچ گیا۔ جزیرہ ویلز کے لوگ شکار چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈنمارک والوں نے شراب و کباب کو سلام کرلیا۔ اہل ناروے ادھ پکی مچھلیوں کو چھوڑ کر صلیبی جہاد کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور اس طرح تیرہ لاکھ مخلوق ارض فلسطین پر قبضہ کے لیے روانہ ہوئی۔

اس جم غفیر کا سردار پطرس ہی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا یورپ، ایشیا پر چڑھ آیا ہے۔ اثنائے راہ ان مقدس محاربین نے بلغاریہ میں وہ لوٹ مچائی کہ الامان والحفیظ۔ اس سلسلے میں قسطنطین کی بیٹی کا یہ قول بہت مشہور ہوا اور تاریخ کا حوالہ بن گیا۔

"ان جنونی محاربین کے سامنے جو بچہ بھی آتا یہ اس کی تکہ بوٹی کرڈالتے۔"

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی باشندوں اور اہل ہنگری اور بلغاریہ سے ان کی لڑائیاں ہوئیں۔ اس خانہ جنگی میں جو بچے وہ بھاگ کے قسطنطنیہ پہنچے لیکن

قیصر الیکس نے انہیں ایشیائے کوچک میں دھکیل دیا۔ وہاں ان کی درندگی بڑھ گئی لیکن قلیج ارسلان سلجوقی نے ان کی وحشت کا پورا پورا انتقام لیا اور پوری فوج کو جانوروں کی طرح قتل کر دیا گیا۔

اس دوران تاریخی حوالے کے مطابق یورپی حکومتوں کی باقاعدہ فوج ایشیا کے ساحل پر اتری۔ اس میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت یورپ کا رئیس گاڈفری اور دیگر سالارِ افواج یورپ کر رہے تھے۔

ان افواج کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ ان مقدس مجاہدین نے قونیہ کا محاصرہ کرلیا اور وہاں کا سلطان امیر ارسلان ایک خوف ناک جنگ کے بعد شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے اور ارمنی النسل امیر فیروز کی غداری نے انہیں انطاکیہ میں داخلہ کا راستہ دے دیا۔ صلیبی فوجیں رات کے وقت شہر میں داخل ہوئیں اور انہوں نے ساری آبادی کو تہہ تیغ کر دیا۔ عیسائی مورخین کے مطابق مسلمان مقتولین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

پھر یہ عیسائی فوجیں معرۃ السغمان کی طرف بڑھیں اور پھر اسے فتح کر کے تین روز تک قتل عام کیا۔ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان قتل ہوئے۔

اس مرحلہ پر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ فاطمی خلافت مصر نے ترکمانوں کو کمزور پا کر ارض فلسطین پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا اور فاطمی خلیفہ کے سپہ سالار افضل بن بدر جمال نے القدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شعبان ۴۸۹ ہجری کو شہر فاطمیوں کے قبضہ میں آگیا اور افتخار الدولہ حاکم ہوا لیکن تین سال بعد صلیبیوں نے القدس کا محاصرہ کرلیا۔ صلیبی افواج چالیس ہزار اور مصری فوج صرف ایک ہزار تھی۔ اسے مصر سے کمک نہ پہنچی اور نہ عباسی خلیفہ نے کوئی اعانت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس روز بعد ۴۹۲ ہجری میں صلیبی محاربین کوہِ صیہون کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔ صلیبی محاربین نے شہر میں قتل و غارت کے بعد مسجد کا محاصرہ کیا اور پھر بچوں، عورتوں اور جوانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا۔

ایک گروہ محرابِ داؤد میں جا چھپا۔ مگر نصرانی بیت المقدس کی دیوار توڑ کر اندر آگئے اور وہاں قیامت برپا ہو گئی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے گئے۔ معصوم بچوں کو فصیل پر پٹخ پٹخ کر مار دیا گیا۔ علماء کرام پر تیل اور نفت چھڑک کر جلا دیا گیا۔ مسجد اقصیٰ اور محرابِ داؤد میں شہداء کی تعداد سات ہزار سے بارہ ہزار تھی۔ مشرقی اور مغربی مورخین متفقہ طور پر مسلمان شہداء کی تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ القدس کے گلی کوچوں، ویرانوں اور کھنڈروں میں لاشوں کے انبار لگے تھے۔ مسجد اور اس کے صحن میں مقتولین کا خون گھوڑوں کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔

اس غارت گر فتح کے تیسرے دن مسلمان قیدیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ باقیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ خود کو میناروں اور چھتوں سے گرا کر ختم ہو جائیں۔ مشہور مورخ اسٹینلے لین پول نے لکھا ہے کہ عیسائی بیت المقدس میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں کیل ٹھونکے۔ ایک عیسائی مورخ اس طرح رقم طراز ہے۔

بیت المقدس میں فاتحانہ داخلے پر صلیبیوں نے وہ قتل عام کیا کہ مسجد عمرؓ میں جانے والے گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون پہنچ رہا تھا۔ بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر انہیں دیواروں پر دے مارا گیا یا نیچے پھینک دیا گیا۔

دوسرے دن پھر اس قتل عام کا اعادہ کیا گیا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔

شیخ سعدی نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

"اس دن جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا، انسانیت کی توہین ہے۔"

ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ ہمارے لوگ (صلیبی) راستوں اور چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور بچوں کو پکڑ پکڑ کے قتل کر رہے تھے۔

ایک اور عینی شاہد ریمانڈ اڑبل اس طرح رقم طراز ہے۔

"بیت المقدس کے راستوں پر مسلمانوں کی اس قدر لاشیں پڑی تھیں کہ گزرنا ناممکن ہو گیا تھا۔"

پھر عیسائیوں نے اس قتل عام کو ناکافی سمجھ کر ایک محفل منعقد کی جس میں قرار پایا کہ کل باشندگان بیت المقدس کو تہہ تیغ کر دیا جائے۔ چنانچہ قتل عام کا حکم جاری ہو گیا جو پورے نو روز تک جاری رہا۔ اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی تہہ تیغ ہوئے اور کوئی متنفس باقی نہ رہا۔

اس شکست اور لوٹ مار کے نتیجے میں مسجد عمرؓ سے چالیس سونے کی قندیلیں جن کا وزن ایک سو رطل اور دو سو چھوٹی قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مالِ غنیمت اتنا تھا کہ جس سے چھ گاڑیاں بھر گئیں مگر پھر بھی بچ رہا۔

اس قتل عام کی خبر جب بغداد پہنچی تو اہل بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر کوچہ و بازار میں نکل آئے۔ وہ دہائی دے رہے تھے۔

"آہ...... القدس میں تقدیر الٰہی نازل ہوئی۔"

خلیفہ المستنصر نے ایک فوج روانہ کی جو حلوان سے بغیر مقابلہ کیے واپس آگئی۔ مصر نے امیر الجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ شکست کھا گیا۔ یہ لشکر ناتجربہ کار اور بازاری آدمیوں پر مشتمل تھا۔ دشمن نے جب حملہ کیا تو وہ بے جان کھڑا رہا اور دشمن نے اسے آسانی سے قید کرلیا۔ صرف چند قیدی واپس جا سکے۔

اس المناک واقعہ کے بعد عیسائیوں نے انطاکیہ، الرہا، طرابلس اور بیت المقدس میں چار سلطنتیں قائم کرلیں جن کا سردار اعلیٰ گاڈفرے ہوا۔ اس نے اپنے لیے "محافظ قبہ مسیح" کا لقب پسند کیا لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں بعد یعنی ۱۸ جولائی ۱۱۰۰ میں مر گیا۔ اس کا بھائی بالڈان، الرہا سے آکر تخت نشین ہوا اور اپنی جگہ اپنے بیٹے بالڈون برگ کو لگا آیا۔

بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی عیسائیوں کے لشکر مسلسل آتے رہے۔ دوسری طرف مسلمان، عیسائیوں کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ عباسی خلیفہ برائے نام تھا۔ اسلامی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جن کا ایک دوسرے سے نہ تعلق اور نہ کوئی رابطہ تھا۔ اگر کوئی رابطہ تھا تو صرف یہ کہ وہ اپنے اقتدار کو وسیع کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔

اس صورت حال کا یہ نتیجہ نکلا کہ عیسائیوں نے جن علاقوں پر قبضہ کیا وہاں سے مسلمانوں کو نکال باہر کیا۔ یہ مسلمان پہاڑوں اور ریگ زاروں میں منتشر ہو گئے لیکن ہیرالڈ لیم کے الفاظ ہیں۔

"مصائب کے ان اندھیروں میں بھی مسلمانوں کا عقیدہ چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ انہیں یقین تھا کہ موجوں کی یہ طوفان انگیزی عارضی ہے اور یہ موجیں اپنے مقام کی طرف ضرور لوٹ جائیں گی۔"

چنانچہ پہلی شکست کے بعد مسلمان حکمران اس

عقیدے اور اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں اتا بک عماد الدین زنگی والئی موصل کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس بہادر مسلم حکمران نے ۱۱۴۴ء میں عیسائیوں کو زبردست شکست سے دوچار کیا اور الرہا پر قبضہ کرلیا۔ الرہا عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی شکست کی خبر پورے یورپ میں دم کے دم پھیل گئی۔

چنانچہ پاپائے روم نے تمام عیسائی حکمرانوں کے پاس خطوط اور پیغامات بھجوائے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوں اور اس پیغام کے تحت عیسائی اقوام پھر اٹھ کھڑی ہوئیں اور فرانس کے بادشاہ ''لوئی'' اور فرمانروائے المانیہ کنراڈ ثالث اپنی فوجوں کے ساتھ بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کنراڈ آیا لیکن مسلمانوں نے اسے شکست دے کر اس کی بیشتر فوج کو قتل کردیا۔ جو بچے وہ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ان فرار ہونے والوں کو راستے میں فرانس کا لشکر ملا۔ یہ بھگوڑے اس لشکر کے ساتھ ہو گئے مگر جب اسے بھی مار پڑی تو یہ بچے کھچے عیسائی طرح طرح کی سختیاں اور تکلیفیں اٹھا کے پھر بیت المقدس واپس پہنچے۔

یہ بارہویں صدی کا زمانہ تھا۔ اس وقت دمشق کی حکومت مجیر الدین بق کے قبضے میں تھی۔ اس شکست خوردہ عیسائی لشکر نے دمشق پر حملہ کر دیا لیکن عماد الدین کے بیٹوں نور الدین زنگی اور سیف الدین زنگی نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔

یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس جنگ میں ممتاز ضعیف العمر عالم دین شیخ وقت حجتہ الدین یوسف مغربی شریک تھے۔ مسلمان سالار نے ان سے درخواست کی کہ آپ تکلیف نہ کیجیے۔ ہم اس فرض کی ادائیگی کے لیے موجود ہیں۔ مگر بزرگ شیخ نے فرمایا۔

''میں خدا سے سودا کر چکا ہوں۔''

اور انہوں نے میدان جنگ میں لڑ کر شہادت حاصل کی۔

ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ صلیبی جنگ میں اگرچہ یورپ کا سر نیچا نہیں ہوا لیکن بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور ہوگئی۔ اور اگر نور الدین زنگی کو موت مہلت دیتی تو عیسائی سلطنت کا بیت المقدس میں قیام ایک خواب بن جاتا۔

سلطان نور الدین زنگی ایمان اور عمل کی دولت سے مالا مال تھا۔ ملک شام سے عیسائیوں کا اخراج اُس کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج کو منظّم کیا اور بہت سی نواحی ریاستوں پر قبضہ کرلیا تاکہ وہ اطمینان سے فرنگیوں کا مقابلہ کر سکے۔ اُس نے سازشوں کو ناکام بنا کر شام اور الجزیرہ کی متحدہ حکومت قائم کی اور مصر میں اثر ورسوخ حاصل کیا۔

لیکن سلطان نور الدین زنگی نے دشمن کے ساتھ عیاری اور مکاری کو کبھی جائز نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ حاکم یروشلم بالڈون جب مرض الموت میں مبتلا ہوا اور اُس کی جانشینی پر عیسائیوں میں اختلاف ہوا تو بعض ساتھیوں نے موقع کو غنیمت جان کر سلطان کو حملہ پر اکسایا۔ لیکن سلطان نے یہ کہتے ہوئے اس تجویز کو مسترد کردیا۔

''اس وقت جبکہ دشمن مصیبت میں مبتلا ہے۔ اس پر حملہ جوانمردی کے خلاف ہے۔''

تاریخ کا یہ ایک انوکھا باب ہے کہ وہ نوجوان یوسف جسے اپنے چچا کے اصرار اور سلطان نور الدین زنگی کے حکم پر اپنی مرضی کے خلاف مصر جانا پڑا، آگے چل کر وہی مصر کا حاکم ہوا اور تاریخ اسلام میں ''سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس''

کے نام نامی اور اسم گرامی سے ایک ایسا نقش چھوڑ گیا جو تا قیامت روشن اور درخشاں رہے گا۔

اس فاتح بیت المقدس کا شجرۂ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے:۔

صلاح الدین بن نجم الدین بن ایوب بن شازی بن مروان بن علی بن عشرہ بن حسن بن علی بن احمد بن علی بن عبدالعزیز بن ہدتبہ بن حصین بن حرت بن سنان بن عمر بن معرہ بن عوف حمیری۔

اس شجرۂ نسب میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ علامہ خلکان کی رائے یہ ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ درین یعنی غیر عرب سے تھا۔ ابن کثیر انہیں کرد نسل سے بتاتے ہیں۔ بعض مؤرخین کی رائے میں وہ عرب کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مورث اعلیٰ ''عوف حمیری'' تھا۔

سلطان صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب آذربائیجان کا رہنے والا تھا۔ وہ جوانی کے زمانے میں بغداد چلا آیا تھا۔ وہاں اُس کی صلاحیت اور جسمانی قوت کی وجہ سے قلعہ تکریت کی قلعہ داری کا منصب عطا ہوا۔

انہیں تکریت میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ناموافق حالات کے تحت نجم الدین ایوب کو قلعہ داری کا منصب چھوڑنا پڑا اور وہ اس عالم پریشانی میں اپنے چھوٹے بھائی اسد الدین شیر کوہ کو ساتھ لے کر ریاست موصل کے حاکم اتا بک عماد الدین زنگی کے پاس چلا گیا۔

نجم الدین کے قلعہ تکریت کی قلعہ داری سے اخراج کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہاں رہتے ہوئے اس کے بھائی کے ہاتھ سے ایک ایسا شخص قتل ہوگیا جس کے عزیز واقارب دربار خلافت میں اثر ورسوخ رکھتے تھے۔

چنانچہ خلیفہ وقت نے نجم الدین کو فوراً معزول کر دیا اور یہ حکم دیا کہ خلافت کا یہ حکم وصول کرتے ہی نجم الدین قلعہ تکریت خالی کر دے اور دوسری صبح کا سورج وہ قلعہ تکریت سے باہر رہے۔

یہ ۵۳۲ ہجری کی ایک تاریک رات تھی جب نجم الدین جلدی جلدی اپنا سامان بندھوا کر تکریت کے قلعہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ رہا تھا۔ اس وقت تکریت کے قلعہ میں یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ پریشان اور فکر مند نجم الدین کی بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا اور قلعہ کی فضا میں لرزتی ہوئی بچے کی آواز جس نے بظاہر نجم الدین کو مزید مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ اور وہ اسے اپنی بدقسمتی سمجھ رہا تھا مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا کیونکہ یہ لرزتی ہوئی آواز نکالنے والا بچہ آگے چل کر صلاح الدین اور سلطان صلاح الدین ایوبی بن کر دنیائے اسلام کا ماہِ کامل ثابت ہوا۔

نجم الدین قلعہ تکریت سے نکل کر معہ اپنے عزیز و اقارب اور متعلقین کے سیدھا حاکم موصل اتا بک شہید زنگی کے پاس پہنچا۔

حاکم زنگی کو نجم الدین کے جوہر قابل ہونے کا پہلے سے علم تھا۔ پس اس نے نجم الدین کو بعلبک کا قلعہ دار بنادیا۔ کہتے ہیں کہ بعلبک کے قلعہ اور شہر کا نام قدیم زمانہ کے ایک دیوتا اور اس کے مند ''بعل'' پر رکھا گیا تھا۔

اتا بک کے معنی استاد کے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ حکومت ان غلاموں کی تھی جنہیں سلجوقیوں نے اپنی وسیع وعریض سلطنت کے دور دراز کے علاقوں میں فوج کے مختلف مناصب پر مقرر کرنے کے لیے خریدا تھا۔ یا وہ تحفے کے طور پر سلجوقیوں کے دربار میں پیش کیے گئے تھے اور سلجوقیوں نے انہیں فوج میں بڑے بڑے مناصب عطا کر کے اسلامی ذرہ نوازی کی ایک

زندہ مثال قائم کی تھی۔

آگے چل کر یہ سلاطین سلاجقہ کمزور ہو گئے اور آپس کی خانہ جنگی سے سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو یہی غلام جنہیں ''اتابک'' کہا جاتا تھا۔ شہزادگانہ سلاجقہ کے اتالیق بن گئے اور تھوڑی ہی مدت بعد اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر سلجوقیوں کی سلطنت کے مالک بن گئے۔

ان اتابکان زنگی میں عمادالدین زنگی کا نام سرفہرست ہے کیونکہ وہی پہلا حکمران تھا جس نے زنگیوں کے سلسلہ حکومت کی حلب اور موصل میں بنیاد رکھی۔

امیر عمادالدین زنگی نے نجم الدین ایوب کو بعلبک کا گورنر بنایا تو جیسے اس خاندان کے دن پھر گئے۔ نصرت اور کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ جب کسی پر ایک دم سے اعزاز کی بارش ہونے لگے تو وہ اکثر بہک جاتا ہے۔ نجم الدین بھی شاید بہک گیا۔

چنانچہ اس نے دبی زبان میں امیر سے کہا۔

''خادم اس احسان کے لیے امیر محترم کا حد درجہ شکر گزار ہے۔'' پھر ایک لمحہ رک کر کہا۔ ''اگر اس فرمان میں تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے تو خادم کی گردن عمر بھر احسان اور شکر کے بوجھ سے نہ اٹھ سکے گی۔''

امیر موصل کے اٹھتے ہوئے قدم ایک دم رک گئے اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس وقت وہ بعلبک کے شہر کوتوال کے محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے نجم الدین کو بعلبک کی گورنری کا حکم خلوت میں بلا کر دیا تھا۔ امیر موصل، امراء اور غلام دونوں کے معاملات میں بہت سخت واقع ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے اپنے وفاداروں سے محبت نہ تھی۔ وہ چھوٹے بڑے تمام لوگوں کا خیال رکھتا تھا اور انہیں ان کے کارناموں کے اعتبار سے نوازتا تھا۔

مگر اپنے حکم کے معاملہ میں اسے دخل اندازی پسند نہ تھی۔

''تم میرے حکم میں ترمیم کرانا چاہتے ہو؟'' امیر موصل کا لہجہ اس قدر کرخت تھا کہ پورا کمرہ گونج اٹھا۔ باہر پہرے پر کھڑے غلام کے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ آج نجم الدین کی خیر نہیں، اس نے امیر سے گستاخی کی ہے اور اب کوئی دم میں امیر اس کی گرفتاری کا حکم دے گا۔

نجم نے بھی شاید غلط وقت پر ایک صحیح درخواست کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ امیر، موصل اور بعلبک کی فتوحات سے خوش ہے اس لیے اس کی درخواست پر ہمدردی سے غور کرے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ پس نجم الدین نے خود کو سنبھالا اور ادب سے عرض کیا۔

''امیر سے سرتابی، وفاداری کا شیوہ نہیں اور خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آیا تو خادم اپنے امیر سے آنکھیں ملانے کی بجائے اپنی تلوار سے خود اپنا سر قلم کر لے گا۔ خادم کا مدعا تو محض ایک درخواست پیش کرنا تھا۔''

''درخواست کا یہ انداز نہیں ہوتا نجم الدین۔'' امیر کے جلال میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

''خادم اپنی نادانی پر شرمندہ ہے امیر محترم۔'' نجم الدین نے اور زیادہ لجاجت سے کہا۔

''ہوں۔ تو کیا تمہیں ہمارا دیا ہوا اعزاز پسند نہیں آیا۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہے امیر عالی مقام۔ امیر ہمیشہ اپنے جاں نثاروں کو نوازتے رہے تھے۔ میرے لیے سب سے بڑا اعزاز تو یہ ہے کہ میں امیر کے دربار سے ہمیشہ وابستہ رہوں اور میری یہ خواہش بھی ہو گی کہ میں امیر پر قربان ہو جاؤں۔''

امیر نجم الدین نے انکسار کا کچھ ایسا انداز اختیار

کیا کہ امیر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''نہیں نجم الدین! ایسا نہ کہو۔''

امیر نے چھت کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں دریائے دجلہ کے کنارے تکریت کا قلعہ اب تک یاد ہے۔ جب ہم اپنے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ وہاں پہنچے تھے تو تم نے کمالِ مہربانی کے ساتھ اپنے قلعہ میں ہمیں پناہ دی تھی۔ اگر ہمیں تمہارا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید ہم موصل کبھی واپس نہ آ سکتے۔''

''امیر اس خادم کی ادنیٰ خدمت کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

نجم الدین نے یہ کہہ کر خود کو امیر کی نظروں میں اور زیادہ بلند کر لیا۔

امیر موصل کا یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا جب وہ سلجوقی شہزادوں کے تخت و تاج کے لیے خانہ جنگی کے دوران ایک محاذ پر شکست کھا کر پناہ کی تلاش میں تکریت پہنچا تھا۔

نجم الدین ان دنوں تکریت کا قلعہ دار تھا اور اس نے عمادالدین زنگی کو اپنے قلعہ میں پناہ دی تھی۔

''ہم تمہارے احسان مند ہیں نجم الدین۔'' امیر کا جلال ختم ہو گیا تھا۔ اس نے محبت بھری نظروں سے نجم الدین کو دیکھا اور بڑے پیار سے کہا۔

''ہاں اب بتاؤ نجم الدین! تم کیا چاہتے ہو؟''

''نجم الدین نے ہمت کر کے کہا۔ ''اے امیر! میں چاہتا ہوں کہ گورنری کا اعزاز میرے بجائے میرے چھوٹے بھائی اسدالدین کو عطا کیا جائے۔''

امیر نے حیران نظروں سے نجم الدین کو دیکھا اور کہا۔ ''میں تمہارے برادرانہ جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے ارادے جذبات سے خالی ہوتے ہیں نجم الدین۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟''

اس لیے کہ اسدالدین مجھ سے زیادہ اہل ہے امیر محترم۔''

''کون اہل ہے اور کون نااہل، اس کا فیصلہ کرنے کا حق تمہیں نہیں دیا جا سکتا۔''

امیر موصل کا لہجہ پھر چڑچڑا ہو گیا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے یہ حکم واپس نہیں لیا جا سکتا۔''

''اس کی کچھ وجوہات اور بھی ہیں امیر محترم۔'' نجم الدین نے گفتگو کا دوسرا انداز اختیار کیا۔

''وہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔'' امیر نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیان کر دو۔ اگر کوئی معقول وجہ ہوئی تو ہم تمہاری درخواست ضرور قبول کریں گے۔''

''امیر محترم!'' نجم الدین نے کہا۔ ''اسدالدین آپ کے زیادہ قریب رہا ہے۔ اس نے مجھ سے زیادہ آپ کی خدمت کی ہے۔''

''تمہاری اس بات میں کوئی وزن نہیں۔'' امیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ہاں اگر کوئی اور وجہ ہو تو بتاؤ۔''

''امیر عالی مقام۔'' نجم الدین نے کہنا شروع کیا۔ ''اسدالدین میں جوانی کے ساتھ ساتھ شوریدہ سری بھی ہے۔ تکریت کے قیام کے دوران اس نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے بہت ہنگامہ برپا ہوا اور آخر ہمیں تکریت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ اگر اسے بعلبک کا قلعہ دار بنا دیا گیا تو انتظامی معاملات میں الجھنے سے اس میں سنجیدگی پیدا ہو جائے گی اور شوریدہ سری کی طوفانی موجیں کنارے سے باہر نہ نکلنے پائیں گی۔ دراصل میں اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینا چاہتا ہوں امیر عالی مقام!''

امیر کے چہرے پر نہ جانے کیوں مسکراہٹ آ گئی۔ ''مجھے اسدالدین کی شوریدہ سری ہی تو پسند ہے نجم الدین۔ یہ تو بہادروں کا تحفہ ہوتا ہے۔ اس کا یہ

مطلب نہیں کہ اس میں سنجیدگی کا فقدان ہے۔ میں نے اس دوران اسے کئی سنجیدہ کام کرنے کے لیے دیے اور وہ ان میں کامیاب رہا۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر سنجیدہ آدمی انتظامی امور میں بھی ماہر ہو۔ ہم نے تکریت کے قلعہ میں تمہارے اعلیٰ انتظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ دمشق اور بعلبک میں صرف ایک دن کا فاصلہ ہے، ہمیں ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو شمشیر زن ہونے کے علاوہ قلعہ کا معقول انتظام بھی کر سکے۔ معین الدین انز اس وقت گھبرایا ہوا ہے۔ وہ بعلبک کا کسی بھی وقت رخ کر سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں تم بعلبک کا بہتر طور پر دفاع کر سکو گے۔“

نجم الدین کے لیے بات کو طول دینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کی۔ امیر نے بعلبک کی حفاظت کے لیے تھوڑی فوج وہاں چھوڑی، پھر موصل واپسی کا ارادہ کیا۔

قلعہ میں جب یہ خبر پھیلی کہ نجم الدین کو بعلبک کا قلعہ دار بنا دیا گیا ہے تو سب ہی نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ اسد الدین نے بھائی کو مبارک باد دی۔ نجم الدین کو اب بعلبک میں مستقل طور پر رہنا تھا۔ پس اس نے موصل سے اپنے اہل وعیال کو بلوا لیا۔ ان میں اس کا بیٹا صلاح الدین بھی تھا۔ جس کی عمر اس وقت تقریباً چھ سال تھی۔

امیر عماد الدین کی سیماب فطرت اسے نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ موصل پہنچتے ہی وہ نئے معرکوں کی منصوبہ بندی میں لگ گیا۔ وہ دمشق کے خلاف کوئی فوری اقدام تو نہ اٹھا سکا لیکن دمشق کی مسلم ریاست کے شمال اور مغرب میں کئی چھوٹی بڑی عیسائی ریاستیں تھیں جن سے معین الدین انز نے تعلقات بڑھا رکھے تھے۔

یروشلم کا شاہ بالڈون، انز کا سب سے بڑا حلیف تھا۔ موصل کے شمال میں الرہا (اڈیسہ) کی مضبوط ریاست تھی جو اس کے سر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ الرہا کا حکمران جوسیلین اول مسلمانوں کے لیے قہر الٰہی سے کم نہ تھا۔ وہ دیار بکر کی مسلم ریاستوں پر آئے دن حملے کرتا رہتا تھا۔ بے شمار آبادیاں تباہ اور کتنے ہی مسلمان تہہ تیغ ہو چکے تھے۔ پھر کسی مظلوم کی بد دعا اسے لگ گئی اور وہ مر گیا۔ اس کی موت پر مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔

جوسلین کا جانشین بھی مسلمانوں کا شدید مخالف تھا مگر وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اسے شراب و کباب سے اتنی فرصت بھی نہ ملتی تھی کہ وہ مسلم علاقوں پر تاخت و تاراج کا ارادہ کرتا۔ امیر عماد الدین زنگی کی ابھرتی ہوئی طاقت نے اسے بھی محتاط کر دیا تھا۔ جارحانہ روش کی بجائے اس نے مدافعانہ طرز اختیار کر لیا تھا۔ پھر بھی وہ امیر عماد الدین زنگی کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔

اس طرح امیر زنگی کے راستوں کا وہ بھی ایک بڑا پتھر تھا مگر خواہش کے باوجود بھی امیر زنگی الرہا سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ الرہا کے قریب بہت سی عیسائی ریاستیں تھیں جو اسے فوری کمک پہنچا سکتی تھیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد امیر عماد الدین زندگی نے دیار بکر پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ دیار بکر میں کئی مسلمان سرداریاں تھیں۔ مگر بغیر ان پر قبضہ کیے امیر کے پہلو مضبوط نہ ہوتے تھے۔ دوسری طرف الرہا پر وہ تب ہی ہاتھ ڈال سکتا تھا جب دیار بکر کی تمام سرداریاں اس کے زیر اثر ہوں مگر امیر کو یہ کڑوا گھونٹ بہر صورت حلق سے اتارنا تھا۔ امیر بڑی رازداری سے فیصلے کرتا تھا۔ اس کے ارادوں کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ وہ لشکر لے کر بھی نکلتا تو کسی کو نہ معلوم ہوتا کہ

امیر کس طرف کا رخ کریں گے۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ الرہا اور دیار بکر کے بارے میں بہت غور و فکر کر رہا تھا اور اس کی خبر امیر کے غلام خاص بارکتش کے ذریعہ اس کے سرداروں تک پہنچی تھی۔

ایک دن بارکتش نے امیر اسد الدین سے سرگوشی کی تھی۔

”آقاء محترم آج کل رات کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر غور و فکر فرماتے ہیں۔“

اور اسد الدین چونک پڑا تھا۔ امیر کا ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر غور و فکر کرنا اس کے سرداروں کے لیے باعث اضطراب تھا۔ پس ایک سردار نے اندازہ لگایا۔

”لگتا ہے کہ کوئی نئی مہم شروع ہونے والی ہے۔ کیونکہ ہر نئی مہم کے آغاز سے پہلے امیر کی یہی حالت ہوتی ہے۔“

سردار کا یہ اندازہ درست تھا۔ لشکر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ امیر نے جاگیرداروں کی جاگیریں ختم کر دی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک حکومت اس کے ہاتھ میں ہے اس وقت تک امراء کو زمین اور املاک کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جب حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو زمین اور املاک کب باقی رہیں گی۔

جاگیردارانہ نظام میں حکمران کے پاس کوئی خاص فوج نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت کے وقت حکمران، امیروں کو طلب کرتا تھا اور وہ اپنی فوج کے ساتھ لشکر میں شامل ہو جاتے تھے مگر امیر عماد الدین زنگی کو تو ہر وقت ایک بڑے لشکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت خود کو حالت جنگ میں رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے جاگیردارانہ نظام ختم کر کے لشکر کو مستقل کر دیا تھا۔ تمام لشکر موصل میں رہتا تھا اور انہیں باقاعدہ ماہ بماہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی امیر ان کا خیال رکھتا تھا۔ اس طرح امیر اور لشکر میں براہِ راست رابطہ تھا اور لشکر اپنے حکمران (سپہ سالار) پر جان دیتا تھا۔

ایک دن امیر زنگی اسی ادھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا کہ غلام بارکتش خاموشی سے اندر آیا اور ادب سے عرض کیا۔

”آقائے محترم! جعفر باریابی کا خواہش مند ہے۔“

”کون...... نصیر الدین جعفر؟“ امیر کا خیال اپنے نائب کی طرف گیا۔

”نہیں آقا......“ بارکتش نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نصیر الدین جعفر نہیں بلکہ وہ جعفر جو آپ کی خاص خدمت پر مامور ہے۔“

”اچھا...... اچھا......“ امیر مسکرایا۔ ”عجیب بات ہے دو دو جعفر ہمارے خدمت گزار ہیں اور لطف یہ کہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔ اچھا انہیں بلاؤ۔“

غلام حکم پا کر باہر چلا گیا۔ امیر کو دونوں جعفروں میں اکثر مغالطہ ہو جایا کرتا تھا۔ ایک جعفر امیر کا نائب تھا اور دوسرا اس کا خاص جاسوس۔ یہ وہی جعفر تھا جس نے امیر کے لیے بعلبک اور دمشق میں جاسوسی کی تھی۔ امیر ادھر کچھ دنوں سے اسے یاد کر رہا تھا۔ اس کے اچانک آنے سے امیر کو خوشی ہوئی۔

خواجہ سرا، جعفر کو لے کر آ گیا۔ جعفر آداب بجا لایا۔

اُس وقت خواجہ سرا نے امیر کو مزید اطلاع دی۔

”آقا، سردار اسد الدین بھی قدم بوسی کے لیے حاضر ہیں۔“

”کون...... شیر کوہ؟“ اس کے ساتھ ہی امیر تردد میں پڑ گیا۔ وہ اس وقت جعفر سے کچھ اہم گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسد الدین جیسے اہم سردار کو انتظار کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔

آخر امیر نے کہا۔ ”شیر کوہ کو بھی آنے دو۔“

جعفر گفتگو کا آغاز کرنے والا تھا کہ شیر کوہ بھی غلام کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے امیر کو سلام پیش کیا۔ امیر نے مسکرا کر جواب دیا اور ساتھ ہی کہا۔ ’’ہمارا یہ وفادار اپنی کسی ضرورت سے حاضر ہوا ہے۔ پہلے میں اس کی بات سننا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ضرور...... ضرور...... آپ پہلے اس کی بات سن لیجیے۔‘‘ اسد الدین نے جواب دیا اور واپسی کے لیے پلٹا۔

’’تم ذہین ہوتے جا رہے ہو اسد الدین۔‘‘ امیر خوش دلی سے مسکرایا۔ ’’جو بات میں نہ کہنا چاہتا تھا وہ تم نے خود سمجھ لی۔‘‘

پھر امیر نے جعفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں نہیں جانتا جعفر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اعتراض نہ ہو تو تم ٹھہر سکتے ہو۔‘‘

جعفر کو جیسے بولنے کا موقع مل گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ ’’آقائے محترم! خادم ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہے۔ سردار اسد الدین کی شخصیت ایسی نہیں کہ جن کے سامنے میں درخواست پیش کرتے ہوئے شرم محسوس کروں۔‘‘

اسد الدین نے قدم روک لیے اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔

’’ہاں جعفر! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ امیر نے جعفر سے دریافت کیا۔

’’آقا! مجھے کچھ دنوں کے لیے الرہا جانے کی اجازت دی جائے۔‘‘ جعفر نے ادب سے عرض کیا۔

’’الرہا......‘‘ اور امیر عماد الدین زنگی اپنی جگہ پر اس طرح اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگا۔

جعفر اور اسد الدین دونوں ہی بڑی حیرت سے امیر کو دیکھ رہے تھے۔ جعفر کا پورا بدن کانپنے لگا تھا۔ اس نے الرہا جانے کی درخواست کی تھی۔ یہ کوئی گستاخی تو نہ تھی۔ پھر امیر کو کس چیز نے اس قدر بے چین اور متفکر کر دیا؟ اسد الدین اپنی جگہ پریشان کھڑا تھا۔ اگر وہ گفتگو شروع ہونے کے بعد آیا ہوتا تو یہی سوچتا کہ جعفر نے کوئی ایسی بات ضرور کہی ہو گی جس نے امیر کی یہ حالت بنا دی۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی اور دونوں اپنی اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔

’’تم نے الرہا کا نام لیا ہے نا؟‘‘ امیر زنگی نے قدم روک کر جعفر کو یوں گھورا جیسے اُس نے امیر کو گالی دی ہو۔

’’جی آقا، میں نے الرہا جانے کی درخواست کی ہے۔‘‘ جعفر انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔ اب امیر نے اسد الدین کو مخاطب کیا۔ ’’اسد الدین، مجھے افسوس ہے۔ اس وقت میں تم سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ حکومت کا ایک راز افشا ہو گیا ہے، میں اس کی تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

اسد الدین نے جواب دینے کے بجائے امیر کو ادب سے رخصتی سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

’’آقا کا مزاج کسی وجہ سے مکدر ہو گیا ہے۔ مجھے اجازت دی جائے، میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘ جعفر نے امیر کے غصے کو سمجھ لیا تھا۔ اُس نے بہتر یہی سمجھا کہ امیر کی نظروں سے جس قدر جلد ہو سکے دُور ہو جائے۔

’’جعفر، تم نہیں جا سکتے۔ گفتگو تو تم سے ہی ہونا ہے۔‘‘ امیر زنگی کی نظریں جعفر پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ مجرم ہو اور بھاگنے کے بہانے تلاش کر رہا ہو۔

اُدھر جعفر کی یہ کیفیت تھی کہ اُس کے دونوں پیر لرز رہے تھے اور وہ انہیں مضبوطی سے جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اُس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

’’آقا، اگر میری درخواست نا گوار گزری ہو تو میں معذرت کے ساتھ اسے واپس لیتا ہوں۔‘‘

امیر زنگی نے زہر خند کیا اور رعب دار آواز میں

بولا۔ ’’پہلے تم یہ بتاؤ کہ الرہا کا نام تم نے کس سے سنا؟‘‘

جعفر کے ہاتھ پاؤں اور پھول گئے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ الرہا میں کیا ایسی خاص بات ہے، جس نے امیر کو اس قدر بے چین کر دیا ہے۔ پھر بھی اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔

’’آقا نے جو کام میرے سپرد کیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ میں دُور و نزدیک کی تمام عیسائی ریاستوں پر نظر رکھوں اور ان کے حالات سے آگاہ رہوں تا کہ وہ کسی وقت امیر کے لیے دردِ سر نہ بن جائیں۔‘‘

’’یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے جعفر۔‘‘ امیر کا لہجہ اور زیادہ غصیلا ہو گیا۔ ’’مجھے یہ بتایا جائے کہ کس بد بخت نے تمہیں الرہا کا حوالہ دیا ہے؟‘‘

جعفر نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور پورے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’میرے محترم آقا، مجھے کسی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ الرہا ایک عیسائی ریاست ہے۔ اس وقت میں وہاں ایک کام سے جانا چاہتا ہوں۔‘‘

امیر زنگی کی نظریں اب تک بدلی ہوئی تھیں۔ وہ جھنجلائے انداز میں بولا۔ ’’جعفر، تم یہ نہ بھولو کہ اس وقت تم عماد الدین زنگی کے سامنے ہو۔ جس کی شفقت پیغامِ عروج، مگر جس کا جلال قہر خداوندی سے کم نہیں ہوتا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم نے الرہا کا نام ہمارے کسی امیر یا سردار کی زبان سے تو نہیں سنا؟‘‘

’’ہرگز نہیں آقا۔‘‘ جعفر نے فوراً تردید کی۔ ’’امیر کا جاسوس ہونے کی وجہ سے مجھے یروشلم، انطاکیہ، طرابلس، آرمینیا اور الرہا کی عیسائی ریاستوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہیں۔ یہاں تک کہ ان تمام ریاستوں کے حکمرانوں کی عادات و اطوار سے بھی واقفیت رکھتا ہوں۔‘‘

جعفر کے اس تفصیلی بیان سے بھی شاید امیر زنگی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس لیے اُس نے زور دے کر کہا۔

’’جعفر، کیا تم الرہا کی پوری اہمیت سے واقف ہو؟‘‘

جعفر اپنے امیر سے اس قدر سخت اور کرید کرید کے سوالات کرنے سے پریشان ہو رہا تھا۔ اُس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر امیر کو الرہا سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے کہ وہ بار بار گھما کر الرہا کا نام دہرا رہا تھا۔

’’میرے آقا، میرے امیر، میں نے الرہا کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا لیکن یہ ضرور سنا ہے کہ یہ شہر بہت خوب صورت ہے۔ مگر اس کا حکمران ایک عیش پرست اور ناعاقبت اندیش انسان ہے۔ اُس میں اپنے باپ جوسیلین اول کی ذہانت اور دور اندیشی نہیں ہے۔‘‘

’’جعفر سچ سچ بتا۔‘‘ امیر نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ ’’کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا ہو کہ تیرا امیر بھی ’’الرہا‘‘ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اور وہاں تو اس وجہ سے جانا چاہتا ہے کہ قبل از وقت وہاں کے حالات سے تو پوری طرح واقف ہو جائے؟‘‘

جعفر دل ہی دل میں امیر کی اس کج بحث پر پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر کوئی سخت جواب نہیں دے سکتا تھا۔ پھر بھی اُس نے امیر کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ’’میرے آقا، مجھے قطعی علم نہیں کہ میرے آقا بھی الرہا میں دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ میں نے کسی امیر سے اس بارے میں کچھ سنا ہے۔‘‘

امیر زنگی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔‘‘

جعفر پھر الجھ گیا اور اسے اطمینان کے لیے امیر سے سوال کرنا پڑا۔ ’’آقا، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟‘‘

’’نہ تم نے کوئی غلطی کی ہے نہ تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔‘‘ آخر امیر زنگی نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔ مگر جعفر کا دل مطمئن نہ تھا۔ وہ ٹکر ٹکر امیر کو دیکھ رہا تھا۔ امیر ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد خود ہی

بولا۔ ”یہ بتاؤ جعفر، تمہیں اُس ریاست میں کیا کام آن پڑا ہے کہ تم وہاں جانے کے لیے اس قدر بے چین ہو؟“

”مجھے وہاں ایک ذاتی کام ہے آقا۔“ جعفر نے بھی بات ختم کرنے کے لیے کہہ دیا۔ مگر اُسے فوراً خیال آیا کہ اُس نے غلط جواب دیا ہے۔ اس لیے اُس نے فوراً خود ہی اپنی صفائی پیش کی۔

”میں جانتا ہوں کہ ایک غلام کی ہر بات اور ہر کام کی وجہ اُس کے آقا کے علم میں ہونی چاہیے۔ اس لیے میں اصل وجہ پیش کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل جائے جو گستاخی کی حد میں آتا ہو تو مجھے معاف کیا جائے۔“

”بے فکر رہو جعفر......“ امیر مسکرایا۔ ”میں آقا ہونے کے ساتھ اپنے وفاداروں کا دوست بھی ہوں۔“

اب جعفر نے سر کو خم کر کے کہنا شروع کیا۔ ”اے آقائے محترم، بعلبک کے قیام کے دوران میری ایک عیسائی لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر بعلبک پر قبضہ کے وقت وہ اپنے باپ کے ساتھ الرہا چلی گئی۔ میں اُسی سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔“

امیر زنگی مسکرا دیا۔ ”کیا تمہیں امید ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح بے چین ہوگی؟“

”امیر محترم!“ جعفر جذبات کے دھارے میں بہنے لگا۔ بعلبک میں شبہ کی بناء پر مجھے گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر اُس وفادار لڑکی اور اُس کے باپ نے مجھے اس قید سے رہائی دلائی تھی۔ وہ بیش قیمت جواہرات جو میں نے سرکاری خزانے میں جمع کرائے تھے وہ انہی کی ملکیت تھی۔ آقا اس کے بارے میں خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جعفر۔“ امیر نے کہا۔ ”تم الرہا ضرور جاؤ گے۔ مگر چند دن کے لیے نہیں۔“

جعفر گھبرا گیا۔ اُس نے ادب سے پوچھا۔ ”آقا، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

امیر زنگی کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ پس انہوں نے کہا۔ ”تم الرہا اپنے ذاتی کام سے نہیں بلکہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں جاؤ گے۔ تم کو وہاں اخراجات کے لیے بھی کچھ رقم کی ضرورت ہوگی اس لیے تم خزانے سے ایک معقول رقم لے جا سکتے ہو۔ الرہا میں تم جس سے چاہو مل سکتے ہو مگر اپنے فرض سے غافل نہ ہونا۔ تمہارا واسطہ اور رابطہ موصل سے رہے گا۔ تم ہمیں الرہا اور شاہ جوسلین کے حالات سے آگاہ کرتے رہو گے۔ یہ خیال رہے کہ تم الرہا میں اس وقت تک رہو گے جب تک ہم تمہیں واپسی کا حکم نہیں دیتے۔“

اس کو کہتے ہیں کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ آقا کا حکم سن کر جعفر کا دل باغ باغ ہو گیا۔ پس اس نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ”جو حکم آقا کا۔“

جعفر اپنی قسمت کی یاوری پر مسکرا رہا تھا۔ اس کا ذاتی سفر سرکاری سفر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ الرہا میں قیام میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جعفر اخراجات کی زیر باری سے بچ گیا تھا۔

دوسرے دن جعفر ایک گرجا گھر میں گیا۔ اس نے پادری کو یہ تاثر دیا کہ اسے عیسائی مذہب سے دلچسپی ہے اور وہ اس مذہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ موصل ایک اسلامی حکومت تھی۔ وہاں عیسائیوں کی چند عبادت گاہوں کے علاوہ ان کا کوئی محلّہ یا الگ آبادی نہ تھی۔ پادری نے جعفر کی نصرانی مذہب سے دلچسپی دیکھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پادری نے جعفر کو پڑھنے کے لیے بہت سی کتابیں دیں اور جعفر کے دریافت کرنے پر عیسائی عبادت کے طور طریقے سمجھائے۔

جعفر نے عیسائیوں کی اتوار کی عبادت میں شرکت کی۔ غرض یہ کہ جعفر نے دو ہفتوں کے اندر اندر نہ صرف پادریوں کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کر لی بلکہ اس نے پادریوں کے رہن سہن اور دوسروں سے گفتگو کرنے کے انداز بھی ذہن نشین کر لیے۔ جعفر کو ان باتوں سے واقف ہونے کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ امیر زنگی نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ تا حکم ثانی الرہا میں قیام کرے گا۔

پھر ایک صبح جب ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی تو جعفر اپنی قیام گاہ سے نکل کر سڑک پر آیا اور ایک بازار سے دوسرے بازار اور دوسرے سے تیسرے بازار سے گزرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اس طرح وہ ایک سرائے میں پہنچا جہاں قافلے آتے اور ٹھہرتے تھے۔ چالاک جعفر نے گزشتہ دن یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ سرائے سے ایک قافلہ ایک دو دن میں تل باشر ہوتا ہوا الرہا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ جعفر نے خود کو پادری ولیم کے نام سے سالارِ قافلہ سے متعارف بھی کرا لیا تھا اور اپنا نام الرہا جانے والوں کی فہرست میں درج کرا دیا تھا۔

اسلام میں دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ جعفر یعنی پادری ولیم کو سالار قافلہ نے اُٹھ کر تعظیم دی، اُس وقت ولیم کے ہاتھ میں ایک لمبی تسبیح تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ پشت پر لٹکے ہوئے تھیلے کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اُس کے گلے میں صلیب آویزاں تھی اور صلیب کا نشان بھی اُس کے سینے پر چمک رہا تھا۔

تیسرے دن قافلہ نے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سرائے سے کوچ کیا۔ جعفر نے دل میں بسم اللہ اور اللہ اکبر کہہ کر پہلا قدم اٹھایا۔ اُس وقت جعفر کا دل جذبات سے پُر تھا۔ ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ اُسے ترن کوزی کی وفاداری پر کوئی شبہ نہ تھا۔ مگر اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ بعلبک بہر صورت اسلامی ریاست کا ایک حصہ تھا جہاں عیسائیوں کی ثانوی حیثیت تھی۔ مگر یہ شہر (الرہا) عیسائیوں کا گڑھ اور مرکز تھا۔ الرہا کو عیسائیوں کی سب سے مضبوط چوکی کہا جاتا تھا اور ترن کوزی اس مضبوط چوکی میں تھی۔

جعفر کو اُس کے دوست اور سرائے کے مالک نے بڑے افسردہ لہجے میں بتایا تھا کہ انہوں نے ترن کوزی کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ رُکی تھی۔ ترن کوزی بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ جس وقت بعلبک پر امیر زنگی نے قبضہ کیا تو وہاں کے عیسائیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بعلبک چھوڑ کر الرہا چلے جائیں گے۔ ترن کوزی کے فادر فلپ نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ وہ جیسا مناسب سمجھے اپنے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے۔

اُس وقت صقہ میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ ترن کوزی پھر بھی ہمت کر کے سرائے پہنچی تھی کہ شاید اُس کی ملاقات جعفر سے ہو جائے اور وہ اپنے وعدے کے مطابق خود کو جعفر کے حوالے کر دے۔ مگر جعفر وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس وقت ترن کوزی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے باپ سے الگ ہو جائے اور سرائے میں مقیم رہے۔ اگر وہ ایسی حماقت کرتی تو جعفر کے نہ آنے پر بالکل بے سہارا اور در بدر ہو جاتی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ فادر فلپ کے ساتھ الرہا چلی جائے اور وہاں ٹھہر کر جعفر کا انتظار کرے۔ اُس نے سرکاش کو بتا دیا تھا کہ وہ الرہا جا رہی ہے اور وہاں رہ کر جعفر کا انتظار کرے گی۔ چنانچہ ترن کوزی نے حالات کے تحت جو فیصلہ کیا تھا وہ مناسب تھا۔ یہ جعفر کی بدقسمتی تھی کہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکا اور اب اُسے یہ خطرناک سفر کرنا پڑ رہا تھا۔

تل باشر کی کارواں سرائے کا مالک ایک عیسائی

تھا۔ یہ خوب صورت سرد مقام الرہا کی ریاست میں شامل تھا اور گرمیوں میں اکثر الرہا کے حکمران یہاں موسم گرما گزارتے تھے مگر جب سے عمادالدین زنگی کا عروج ہوا تھا الرہا کے حکمران نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ گرمیوں اور سردیوں یعنی دونوں موسموں میں الرہا ہی میں رہتا تھا۔

بڑا شہر ہونے کی وجہ سے قافلہ تین دن تک تل باشر میں مقیم رہا۔ چوتھے دن جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو اس میں ایک ایسا شخص شامل ہوا جسے دیکھ کر جعفر چونک پڑا۔ اس کی شکل وصورت بڑی حد تک لارنس سے ملتی تھی جس سے جعفر نے بعلبک کے گرجے میں جواہرات چھینے تھے۔ لارنس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جن کے بارے میں جعفر کو شبہ تھا کہ اس نے انہیں اس گرجا میں دیکھا ہے جہاں اسے قید کیا گیا تھا۔

لارنس اور جعفر ہم سفر تھے مگر دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ جعفر پہچانے جانے کے خطرے کے پیش نظر اس سے دور دور رہتا تھا اور لارنس یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ امیر زنگی کا ایک اہم ہرکارہ عیسائی علاقے میں سفر کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

قافلہ کا سفر جاری رہا۔ منزلیں آتی رہیں اور گزرتی رہیں۔ لارنس کا راستے میں کہیں قافلہ چھوڑنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جعفر نے یہ فیصلہ ضرور کیا تھا کہ اگر لارنس کسی جگہ ٹھہرا تو وہ خود بھی اس کے ساتھ قافلہ چھوڑ دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر لارنس کے دل میں اب بھی ترن کوزی کو حاصل کرنے کا خیال ہے یا وہ ترن کوزی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اسی جگہ قیام کرے گا جہاں ترن کوزی ہوگی۔

مگر قافلہ تل باشر سے الرہا پہنچ گیا اور قافلے کے ساتھ لارنس اور جعفر بھی شہر میں داخل ہو گئے۔ قافلہ کو سرائے میں ٹھہرنا تھا اس لیے اس نے ادھر کا رخ کیا۔ دوسری طرف لارنس کی منزل الرہا تھی اس لیے وہ شہر میں داخل ہوتے ہی قافلے سے جدا ہو گیا۔ جعفر کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ الرہا اس کے لیے بالکل نیا شہر تھا اس لیے وہ اندازہ نہ کر سکا کہ لارنس کدھر جا رہا ہے۔

الرہا کی بڑی سرائے کے دروازے پر سرائے کے عیسائی مالک نے جعفر کا پرجوش استقبال کیا۔ قافلہ میں ہر ملک اور ملت کے لوگ شامل تھے اور سرائے کا مالک ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتا اور اسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلا رہا تھا۔ سرائے کے مالکوں کو حکومت کی طرف سے خاص تاکید تھی کہ مسافروں سے خوش دلی سے پیش آیا جائے اور ان کے آرام کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ سرائے مالک اس حکم نامہ سے بہت خوش تھے کیونکہ حکومت کا حکم تھا کہ ہر قافلہ کا خیال رکھا جائے خواہ اس کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو۔

جعفر نے اسی رات سرائے کے مالک سے ملاقات کی۔ سرائے کا مالک اپنے سامنے ایک متین صورت پادری کو دیکھ کر اس کے استقبال کو کھڑا ہو گیا۔

"تشریف رکھیے فادر!" سرائے کے مالک نے ادب سے کہا۔

"تم پر خدائے مسیح کی رحمت ہو اور کاروبار میں اضافہ ہو۔" فادر ولیم اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے بیٹھ گیا۔

"آپ شاید قافلے کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔" مالک نے سر جھکا کر پوچھا۔

"تم نے صحیح اندازہ لگایا بیٹا۔" فادر ولیم آئندہ کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں فادر؟" پتہ نہیں مالک کے سوال میں تجسس تھا یا اس نے محض بات بڑھانے کے لیے یہ سوال کیا تھا۔

"ہمارا کیا پوچھتے ہو بیٹا۔ نہ پتہ نہ ٹھکانا۔ جس شہر میں دل لگا کچھ دن ٹھہر گئے۔ ورنہ جدھر منہ اٹھا چل پڑے۔ شمال سے جنوب تک کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اس ناچیز ولیم نے خداوند یسوع مسیح کا سجدہ نہ گزارا ہو۔ بعلبک کی یہ عظیم عبادت گاہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ولیم نے یہاں یروشلم کی ہواؤں کے جھونکے محسوس کیے ہیں اور پاک مریم کی روح کے سائے دیکھے ہیں۔"

سرائے کے مالک کی عقیدت اور اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ وہ صبر نہ کر سکا اور بات کاٹ کے بولا۔

"فادر ولیم! آپ کا یروشلم سے کبھی گزر ہوا ہے؟"

"ہاں بیٹا!" فادر ولیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "خداوند یسوع مسیح اور پاک مریم کا وہی تو گھر ہے۔ اس گھر میں ایک شب گزارنا ہزار سجدوں کے برابر ہے۔ اس گناہ گار نے وہاں پانچ ماہ رہ کر اپنی روح کو مصفا کیا اور گناہوں کو دھونے کی کوشش کی ہے۔"

"فادر ولیم!" یہ کہتے ہوئے مالک سرائے نے فادر ولیم کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ "آپ نے اس دیار کی سیر کی ہے جہاں کے نظارے جنت نشاں اور فضائیں ہر وقت معطر رہتی ہیں؟"

سرائے کا مالک دیر تک ولیم کے پیروں کو چومتا جاتا رہا اور ولیم اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی دعاؤں سے نوازتا رہا۔ اسے مالک کی صورت میں الرہا میں رہنے کا ایک ٹھکانہ مل گیا تھا۔ دوسری طرف مالک سمجھ رہا تھا کہ فادر ولیم کی ملاقات اور قدم بوسی سے اس نے جنت کا پروانہ حاصل کر لیا ہے۔

"فادر..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ آپ یہاں کب تک قیام فرمائیں گے؟" سرائے کے مالک نے ایک ساتھ دو سوال کر دیے۔

"بیٹا! ہم جیسے جہاں گرد ایک جگہ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتے۔ حالانکہ یروشلم سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شہر نہیں۔ مگر جب علم میں پختگی نہ آئی ہو اور تجربہ ارتقائی منازل میں ہو تو پادری کو کسی جگہ جم کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ بلکہ اسے اپنی تکمیل کرنی چاہیے۔" فادر ولیم نے اسے گول مول سا جواب دیا۔

"بے شک فادر..... آپ نے بالکل درست فرمایا۔" مالکِ سرائے نے عقیدت کے بھرپور جذبے کے ساتھ کہا۔ "یہ الرہا کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے قدموں نے اسے رونق بخشی۔ میری درخواست ہے کہ آپ دن میں کم از کم ایک بار ضرور مجھے قدم بوسی کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"

"تمہاری درخواست قبل از وقت ہے بیٹے!" ولیم نے فوراً مطلب کی راہ نکالی۔

"ابھی تو مجھے خود خبر نہیں کہ آیا میں الرہا میں قیام کر بھی سکوں گا کہ نہیں۔"

"بہرحال کل تک تو آپ یہاں رہیں گے۔" مالک نے کہا۔ "فرمایئے میں کس جگہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟"

"دیکھو بیٹے!" ولیم سنبھل کے بولا۔ "میں یہاں ایک بزرگ محسن سے ملنے آیا ہوں۔ ان سے ملاقات ہو گئی تو دو چار ہفتے ان کے پاس قیام کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ اور ملاقات نہ ہونے کی صورت میں مجھے واپس جانا ہوگا۔ یروشلم مجھے پکار رہا ہے۔ وہاں کے در و دیوار مجھے پکارتے ہیں۔ یہاں تک کہ خواب میں بھی وہاں کے نظارے میرا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔"

"فادر ولیم! آپ کس بزرگ سے ملنا چاہتے ہیں یہاں؟" مالکِ سرائے نے بے چینی سے پوچھا۔

"ان کا نام فادر فلپ ہے۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں وہ بزرگ۔ مہربان، دوست اور مشفق رہنما۔ تم نے انہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ ان کا قیام الرہا کے کسی بڑے عبادت خانے میں ہوگا۔" ولیم نے اپنے تمام اندازے اس پر ظاہر کر دیے۔ کیونکہ اسے امید بندھ گئی تھی کہ سرائے کے مالک سے اسے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل ہوں گی۔

سرائے کا مالک کچھ دیر تک ذہن پر زور دیتا رہا پھر بولا۔

"فادر فلپ..... مگر میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔ یہاں کے تمام عبادت خانوں سے میں واقف ہوں اور روز کسی نہ کسی عبادت خانے میں جاتا ہوں۔ میرے خیال میں اس نام کا کوئی فادر، الرہا میں موجود نہیں۔"

فادر ولیم پریشان ہو گیا۔ اسے یہی بتایا گیا تھا کہ ترن کوزی اور فادر فلپ الرہا گئے ہیں۔ اس زمانہ میں بعلبک کے شمال اور جنوب میں عیسائی ریاستوں کی ایک زنجیر سی بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی ریاست میں جا سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دمشق چلے گئے ہوں۔ بعلبک چھوڑنے والے مسلمان عام طور پر دمشق ہی جاتے تھے۔ سرائے کا مالک ولیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پس اسے مطمئن کرنے کے لیے ولیم نے کہا۔

"تمہاری بات درست ہو سکتی ہے میرے بیٹے۔ ہائے ہائے..... کیسا تباہ ہوا ہے وہ شان دار شہر۔ بڑی قتل و غارت گری ہوئی تھی وہاں۔ ظالموں نے انیتونیس کی عبادت گاہ کو بھی لوٹ لیا تھا۔ فادر فلپ اسی عبادت گاہ کے لارڈ پادری تھے۔

"فادر! کیا بعلبک کی تباہی کے وقت آپ وہاں موجود تھے؟" سرائے کے مالک نے اپنی دلچسپی ظاہر کی۔

"اچھا ہوا کہ میں اس وقت وہاں موجود نہ تھا ورنہ یہ تباہی مجھ سے نہ دیکھی جاتی۔" ولیم نے ٹھنڈی سانس لے کر تاسف کا اظہار کیا۔ "اب تو وہ شہر پہچانا ہی نہیں جاتا۔"

مالک نے بھی افسوس کیا۔ "میں نے تو وہاں کا صرف حال سنا ہے فادر!...... بہت سے لوگ وہاں سے آ کر الرہا میں آباد ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بعلبک کا کوئی پادری یہاں نہیں آیا۔ ورنہ مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔"

"پھر تو میرا یہاں آنا بیکار ہوا۔" ولیم نے بڑے دکھ سے کہا۔ "مگر میں فادر فلپ سے ملے بغیر جا بھی تو نہیں سکتا۔ کیا پتہ کچھ دنوں بعد وہ الرہا آ جائیں اور انہیں معلوم ہو کہ میں ان سے ملے بغیر چلا گیا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔"

"پھر آپ کچھ دن یہاں ٹھہر کر ان کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟" مالک نے مودبانہ عرض کیا۔ "اگر فادر فلپ نہ بھی آئے تو میں یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ الرہا والے بڑے مہمان نواز ہیں فادر۔ خصوصاً آپ لوگوں کے بارے میں تو یہ لوگ بہت حساس ہیں۔"

تمہاری درپردہ درخواست اور میری خواہش میں بڑی مطابقت ہے بیٹے!" ولیم نے خوشی کا اظہار کیا۔ "میں پہلی مرتبہ الرہا آیا ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ الرہا میں کتنی عبادت گاہیں ہیں اور مجھے کہاں ٹھہرنا چاہیے۔"

"فادر! آپ جس عبادت گاہ میں بھی جائیں گے۔ لوگ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے مگر یہ ضروری تو نہیں کہ آپ کسی عبادت گاہ میں ہی ٹھہریں۔" مالک کا انداز استفہامیہ تھا۔ وہ دراصل فادر ولیم کو اپنی سرائے میں قیام کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ولیم سب کچھ سمجھ رہا تھا مگر انجان بنا رہا۔

"بیٹے! آخر کسی نہ کسی جگہ تو ٹھہرنا ہی ہوگا۔" ولیم نے جیسے فیصلہ مالک پر چھوڑ دیا۔

چنانچہ مالک کو فادر ولیم کی بات سے حوصلہ ہوا اور اس نے دبے دبے لفظوں میں دعوت دی۔ "وہ جگہ یہ سرائے بھی تو ہو سکتی ہے فادر! یقین کیجیے آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجیے۔ ایسے اتفاقات زندگی میں کبھی کبھی ہی ہوتے ہیں۔"

پھر اس نے ذرا زور دے کر کھلے الفاظ میں انہیں دعوت دی۔ "میں آپ کو کسی اور جگہ نہیں ٹھہرنے دوں گا فادر! آپ الرہا سے واقف نہیں۔ فادر فلپ کو کہاں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟ میں خود انہیں تلاش کروں گا بشرطیکہ وہ یہاں پہنچ گئے ہوں یا آنے والے ہوں۔"

"بیٹے! تم کس قدر نیک اور پر خلوص ہو۔ مجھے تو تم بولنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔" فادر ولیم نے رسمی طور پر احتجاج کیا۔ حالانکہ اس کی یہ تمام گفتگو اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی۔

"آپ کو بولنے کی ضرورت بھی نہیں فادر...... بس فیصلہ ہو گیا۔" سرائے کے مالک نے بڑے اعتماد سے فیصلہ کیا۔

فادر ولیم نے "اچھا۔" کہہ کر اس فیصلے کو تسلیم کر لیا حالانکہ یہ تو خود ان کے دل کی آواز تھی۔

❁ ❁ ❁ ❁

فادر ولیم کو الرہا میں رہتے ہوئے دو ماہ گزر گئے مگر اسے ترن کوزی کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا۔ الرہا کے بعد دوسرا شہر "تل باشر" تھا جہاں ترن کوزی کے قیام کا امکان ہو سکتا تھا مگر وہ اپنے فرائض منصبی چھوڑ کر الرہا سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس دوران اسے امیر کی طرف سے کوئی پیغام بھی نہیں ملا تھا۔

سرائے کا مالک فادر ولیم سے بہت خوش تھا۔ وہ فادر ولیم کا اس قدر دلدادہ ہو گیا تھا کہ سرائے کے کام نمٹانے کے بعد وہ سیدھا فادر ولیم کے کمرے میں آتا اور پھر ان سے دنیا جہان کی خبریں سن کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتا تھا۔ مالک نے ولیم کو آخری کمرہ دیا تھا۔ وہاں تک لوگ بہت کم پہنچتے تھے۔ فادر ولیم بھی مالک کو اپنے تجربات اور دوسرے دنیاوی قصے سنا سنا کر مصروف رکھتا تھا۔

اس طرح فادر ولیم کو الرہا میں رہتے ہوئے مزید دو ماہ گزر گئے مگر اسے اپنے مطلب میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سرائے کے مالک نے بھی فادر ولیم کی خاطر الرہا کے تمام عبادت خانوں کی خاک چھان ڈالی تھی مگر اسے بھی فادر فلپ کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی تھیں۔ اس تمام عرصہ میں ولیم نے بھی اپنے طور پر فادر فلپ کی تلاش جاری رکھی تھی۔ وہ اتوار اتوار بڑے گرجے میں نماز کے لیے جانے لگا تھا تاکہ آنے جانے والوں پر اس کی نظر رہے مگر اسے فادر فلپ یا ترن کوزی کے بارے میں رتی بھر بھی کوئی اطلاع نہ مل سکی تھی۔

(باقی آئندہ)

تحفہ خاص

محمد بدر منیر

وہ چاروں دوست ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے تھے مگر وہ جانتے تھے ان میں سے صرف ایک ہی اس حسینہ سے شادی کرسکتا ہے چنانچہ انہوں نے اس کا فیصلہ اسی لڑکی پر چھوڑ دیا جب نتیجہ سامنے آیا تو......!
ایثار و قربانی کے جذبے کے پس منظر میں ایک خوب صورت کہانی

حساس دل قارئین کے لیے ایک تحفۂ خاص

ایک روز جب میں اپنے دوستوں سرجی اور جارج کے ساتھ آوارہ گردی کر رہا تھا کہ اچانک وہ دکھائی دی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھومتی، گنگناتی اور باتیں کرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اس کی سہلیاں بھی اگرچہ دلکش تھیں لیکن وہ تو ستاروں کے درمیان چودھویں کے چاند کی طرح روشن روشن دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی روشنی کے آگے تمام روشنیاں پھیکی پڑ چکی تھیں۔ وہ بلاشبہ شاعر کے حسین ترین تصورات سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ وہ اپنی سہلیوں کے ہمراہ آگے آگے چل رہی تھی۔ ہم تینوں دوست ان سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ پھر ہم نے اپنی رفتار تیز کردی لیکن ہمیں یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہ اپنی سہلیوں کے ساتھ ایک گھر میں داخل ہوگئی۔ ہم منہ لٹکائے واپس ہو گئے۔

چند دنوں بعد وہ پھر ایک جگہ دکھائی دی۔ اس بار وہ تنہا تھی۔ پرس اپنے شانے پر لٹکائے متوازن رفتار سے چلی جارہی تھی۔ جارج نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس وقت وہ ہمارے متعلق ہی سوچ رہی ہے۔ دیکھو۔ ذرا غور سے دیکھو وہ شاید پھول کی پتیوں سے یہ شگون لے رہی ہے کہ ہم تینوں میں سے کون اسے سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ کون ایسا ہے جو نہیں چاہتا۔'' جارج نے یہ بات اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ذرا زور سے کہی۔

اس نے چونک کر کہا۔ ''کون نہیں چاہتا۔''

اس نے اپنے...... تصورات کی دنیا سے واپس آتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہوں کا مرکز جارج ہے۔ ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

''معاف کیجیے گا۔'' اس نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ''آپ لوگ غلط سوچ رہے ہیں۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ کل کا پرچہ کیسا رہے گا؟''

''کل کس مضمون کا پرچہ ہے؟'' جارج نے دریافت کیا۔

''کیمسٹری کا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر تم برا نہ مانو تو میں اپنے نوٹس تمہیں کو دے سکتا ہوں۔'' جارج نے چہک کر کہا۔

''اوہ! آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔'' لڑکی ممنونیت سے بولی۔

''میں اسے کہاں آپ کے پاس پہنچاؤں؟'' جارج نے دریافت کیا۔

''گرلز ہاسٹل، بلاک نمبر دو، دوسری منزل، کمرہ نمبر پانچ۔''

''اور تمہارا نام؟'' جارج نے دریافت کیا۔

''ہینسا۔'' لڑکی نے مختصر جواب دیا۔

''بہت خوب صورت نام ہے۔'' جارج نے تبصرہ کیا۔

ہینسا نے مسکرا کر پہلے جارج کی طرف اور پھر ہماری طرف دیکھا اور چلی گئی۔ ہم ایک دو لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر خود بھی آگے بڑھ گئے اور اپنے اپنے انداز میں اس کی تعریف کرتے رہے۔

جارج اسے نوٹس دیتا رہا۔ یہ نوٹس ہم تینوں کی مشترکہ محنت سے تیار ہوئے تھے۔ ہماری مشترکہ محنت رنگ لائی اور وہ امتحان میں کامیاب ہوگئی۔ ہم اسے مبارک باد دینے کے لیے اس کے ہاسٹل گئے۔ ہمارے ہاتھوں میں گلدستے تھے۔ اس نے ہماری مبارک باد اور گلدستوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ہم نے مل کر تھیٹر دیکھا۔ تھیٹر میں ہم خاصے بے تکلف ہوگئے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ہفتہ وار چھٹیوں میں سیر و تفریح ایک معمول بن گئی۔

ہم تینوں ہی اسے پسند کرنے لگے اور تینوں ہی ایک دوسرے پر ظاہر کرتے کہ ہماری محبت خود غرضی سے پاک ہے۔ ہینسا بھی ہم تینوں کو پسند کرتی تھی۔ اس کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہم تینوں میں سے کسے زیادہ چاہتی ہے۔ پھر بھی میری اور سرجی کی رائے تھی کہ ہم دونوں کے مقابلے میں اس کا جھکاؤ جارج کی طرف ہے۔

اسی دوران جنگ شروع ہوگئی۔ ہم تینوں بلکہ چاروں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ جب الوداعی ملاقات کے لیے ہم ہینسا کے پاس گئے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم میں سے کوئی بھی ماسکو آئے تو وہ ہینسا سے ضرور ملے مگر ملاقات کے وقت میز کے گرد چار کرسیاں ہوں گی۔ چنانچہ جنگ کے دوران ہم جب بھی ماسکو آتے تو ہینسا سے ضرور ملتے مگر الگ الگ کیونکہ ہم الگ الگ ہی ماسکو آتے تھے۔ اور ہر موقع پر معاہدے کے مطابق میز کے گرد چار کرسیاں ہی رکھی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جس نے بھی ہینسا سے ملاقات کی اس نے یہی محسوس کیا کہ ہم سب جدا ہونے کے باوجود وہاں موجود ہیں اور یقیناً ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہم چاروں یکجا ہوجائیں گے۔

اس طرح کچھ مدت گزر گئی۔

پھر میں اور سرجی ساتھ ساتھ ماسکو پہنچے۔ ہم ہینسا سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ ہم پہلی فرصت میں اس سے ملے۔ ملاقات کے وقت بدستور چار کرسیاں رکھی گئیں۔ ہینسا نے جنگ کے بارے میں بہت سی باتیں دریافت کیں۔ پھر جارج کے بارے میں خاص طور پر پوچھا۔ ہم نے اسے جارج کی خیریت سے آگاہ کیا اور اس کی بہت زیادہ تعریف کی۔ کیونکہ ہمیں احساس تھا کہ وہ جارج کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ جارج اسے برابر خط لکھتا رہتا تھا۔ ہینسا نے ہمیں اس کا خط پڑھ کر سنایا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اسے جلد ہی محاذ سے واپس بلایا جارہا ہے اور ماسکو کے قریب ایک فیکٹری میں متعین کیا جارہا ہے۔ میں نے اور سرجی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ لیکن ہینسا نے فوراً محسوس کرتے ہوئے ہمیں تسلی دی۔

''سب کچھ ایسا ہی رہے گا دوستو جیسا کہ اب ہے۔ کسی امتیاز اور فرق کے بغیر تم تینوں ہی

میرے دوست رہو گے مگر اس کی آنکھوں میں ہم نے خوشی کی ایک کرن دیکھی جو جارج کے قریب آنے کی اطلاع پر نمودار ہوئی تھی۔

نومبر میں ایک بار پھر میں اور سرجی فوجی اعزازت کی تقسیم کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے پہنچے اور ہینسا سے ملے۔ ہینسا نے فون کر کے جارج کو بھی ماسکو بلا لیا۔ اس طرح ایک طویل مدت کے بعد ہم تینوں ایک ساتھ ہی ہینسا سے ملے۔ ہینسا نے اس موقع پر اپنی چند سہیلیوں کو بھی دعوت دینا چاہی مگر ہم نے منع کر دیا۔ ہم یہ ملاقات صرف اپنے تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔

ہینسا نے اپنا سب سے زیادہ دیدہ زیب لباس پہنا۔ وہ اس لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دیتی تھی۔ ہم تینوں ہی اسے بڑی محویت کے ساتھ دیکھتے رہے اور ماضی کی خوش گوار یادیں تازہ کرتے رہے۔ ہینسا جارج سے اس کی نئی ملازمت کے بارے میں زیادہ تر دریافت کرتی رہی۔ پھر وہ باتیں کرتے کرتے اچانک بولی۔

”میں نے تم تینوں کے لیے بہت لذیذ کیک تیار کیا ہے۔ یہ کیک میری طرف سے تمہارے لیے آج کی ملاقات کی یاد میں خصوصی تحفہ ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ ہینسا نے یہ خصوصی تحفہ کیوں تیار کیا ہے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”ہینسا میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ......“

اس نے میری طرف توجہ دیے بغیر کہا۔ ”ہاں! ہاں کہو کیا بات ہے؟“ سرجی اور جارج دونوں مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے کہا۔ ”ہم تینوں تمہیں بے پناہ چاہتے ہیں اور......“

ہینسا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔

”میں بھی تم تینوں کو اتنا ہی پسند کرتی ہوں اور اس میں کسی کے لیے کوئی کمی بیشی نہیں۔“

اس کے لہجے میں سادگی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات محض اخلاقاً کہہ رہی ہے۔ ورنہ حقیقتاً وہ دل سے کسی ایک کو ہی پسند کرتی ہے لیکن وہ ایک کون ہے اور وہ دو کون ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ دو کون ہو سکتے ہیں۔

”سنو ہینسا! میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم ہم تینوں کو ہی پسند کرتی ہو اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتیں لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو ایسا کرو کہ تم کیک میں ایک سکہ چھپا دو۔ کیک تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور پھر جس کے حصے میں بھی سکہ آئے گا وہ......“

”......خوش نصیب ہو گا۔“ جارج نے لقمہ دیا۔

ہینسا شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم یہی کرتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور ہم بے تابی سے پہلو بدلنے لگے۔

”وہ آج بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔“ سرجی نے کہا۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ جارج بولا۔ ”وہ ہمیشہ ہی خوب صورت لگتی ہے۔“

”لگے گی کیوں نہیں......“ میں نے کہا۔ ”جب ایک لڑکی کی تین امیدوار ہوں تو وہ خود بخود خوب صورت لگے گی۔“

گفتگو اس سے آگے نہیں چل سکی کیونکہ ہم تینوں آنے والے وقت کے خیال سے مضطرب تھے۔ اگرچہ میں نے ہی قرعہ اندازی کی تجویز پیش کی تھی لیکن اب مجھے افسوس ہو رہا تھا بلکہ خود پر

غصہ بھی آ رہا تھا کہ ایسی دل خراش تجویز میرے ذہن میں کیوں آئی اور اگر ذہن میں آ ہی گئی تو اس محفل میں اس کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس موقع پر مجھے یہ محاورہ بھی یاد آیا کہ ”پہلے تولو، پھر بولو“ لیکن اب معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلے بول دیا تھا اور اب تول رہا ہوں اور ترازو کے اس پلڑے میں مجھے بے وزنی کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔

سرجی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”معلوم ہوتا ہے تم سخت نروس ہو۔“

میں نے فوراً جواب دیا۔ ”نہیں۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں البتہ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم سلگائے بغیر کس طرح سگریٹ نوشی کر لیتے ہو۔“ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ سگریٹ سلگائے بغیر ہی سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا لیکن دھواں نہ نکلنے کے باوجود اسے خیال نہ آیا کہ سگریٹ میں ابھی لائٹر نے اپنا کردار ادا نہیں کیا ہے۔

میری بات سن کر وہ کھسیانے پن سے مسکرایا۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر پیکٹ میں رکھ لیا۔ ”شاید وہ آ رہی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر چپ ہو گیا۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ہینسا ایک پلیٹ میں کیک لیے ہوئے آ گئی۔ اس نے پلیٹ میز پر رکھی اور کہنے لگی۔

”اسے کون کاٹے گا؟“

ہم نے ایک دوسرے کی طرف مشورہ طلب نگاہوں سے دیکھا۔ سرجی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ہمارے خیال میں اسے تم ہی کاٹو۔“ پھر اس نے تائید طلب نگاہوں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ہم ہینسا کا ہاتھ اپنی تقدیر کا ہاتھ سمجھ لیں گے۔“

”اور جارج تمہارا کیا خیال ہے؟“ ہینسا نے جارج کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”میں اپنے دوستوں کی تجویز سے متفق ہوں۔“ لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

ہینسا نے چھری اٹھائی اور کیک کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہم تینوں نے اپنے اپنے حصے کا ٹکڑا اٹھا لیا لیکن کافی دیر تک کیک کھانے سے انکار کرتے رہے۔ آخر سرجی نے کہا۔ ”شروع کرو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے کیک کھانا شروع کر دیا۔ میں نے اور جارج نے بھی بادلِ ناخواستہ اس کی تقلید کی۔

ہم بہت خاموشی اور احتیاط کے ساتھ کیک کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتے اور اسے دیر تک زبان کے سہارے منہ میں پھیرتے۔ جب اطمینان ہو جاتا کہ اس میں سکہ نہیں ہے تو اسے حلق سے نیچے اتارتے۔ ہینسا ایک طرف بیٹھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔

اسی عالم میں سرجی نے ہمیں مخاطب کیا۔ ”ساتھیو!......“

میں نے اور جارج نے فوراً اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ شاید سرجی کو سکہ مل گیا ہے۔ اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”کیا خیال ہے انٹرول نہ کر دیں۔ اس دوران ایک ایک سگریٹ پی لیں۔“

''نہیں......'' میں نے ایک جھٹکے سے کہا۔ ''کیک ختم کرلیں۔ سگریٹ بعد میں پئیں گے۔'' ابھی امید باقی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

اسی لمحے جارج اٹھ کھڑا ہوا۔ خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''دوستو! میں نے مقابلہ جیت لیا ہے۔'' اس نے مداری کی طرح اپنے منہ سے بیس کوپک کا سکہ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔

سرجی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں پہلے ہی جانتا تھا کہ جارج خوش قسمت ثابت ہوگا۔''

جارج نے مسکرا کر ہینسا کی طرف دیکھا اور اس کے سامنے جا کر گھٹنے کے بل بیٹھ کر بولا۔ ''ڈارلنگ! قسمت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔''

اس کے بعد ہماری ملاقات چھ ماہ بعد ہوئی۔ جارج نے خط کے ذریعے ہمیں اطلاع دی تھی کہ ان کی شادی ہو چکی ہے لیکن ابھی شادی کی دعوت نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے لیے یہ بات حیران کن نہیں تھی کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری شرکت کے بغیر شادی کی دعوت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دونوں میاں بیوی دعوت میں ہماری شرکت کے خواہاں ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی ان کی ازدواجی زندگی کی پہلی خوشی میں شامل ہونے کے لیے چھٹی لی اور ماسکو پہنچ گئے۔ ہینسا کے گھر کا جانا پہچانا زینہ ہم نے خاموشی سے طے کیا اور ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اندر سے مسرت سے بھرپور قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے گھنٹی کا بٹن دبا کر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ دروازہ جارج نے ہی کھولا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی چوم کر اسے شادی کی مبارک باد دی۔ پھر ہینسا آئی اور ہم نے اسے بھی شادی کی مبارک باد دی اور خوش گوار مستقبل کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ یہ باتیں بڑی سنجیدگی سے ہو رہی تھیں۔ اچانک ہینسا نے کہا۔ ''دوستو! تم ہماری شادی کی دعوت میں آئے ہو۔ ہمارا تحفہ کہاں ہے؟''

سرجی نے کچھ دیر تک خاموشی اختیار کی اور سوچ کر بولا۔ ہینسا تمہارا تحفہ ادھار رہا۔ البتہ ہم اپنے جگری یار کو ضرور تحفہ دیں گے۔'' اس نے بیس کوپک کا سکہ اپنی جیب سے نکال کر بڑے ادب واحترام سے جارج کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جارج اس انوکھے تحفے پر حیران رہ گیا۔ لیکن یہ حیرانی چند لمحوں کی تھی۔ پھر شاید وہ سارا معاملہ آہستہ آہستہ سمجھنے لگا تاہم وہ خاموش رہا۔ البتہ اس کی بیوی اور ہماری سابقہ محبوبہ جارج کی طرف پیار سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''دراصل میں نے اس کیک میں لینن کی تصویر والے تین سکے رکھ دیے تھے۔''

اس کی بات سن کر میرے ساتھی سرجی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے بیس منٹ تک اپنے حصے کا سکہ منہ میں دبا کر رکھا تھا۔

''اور میں تو اسے حلق کے راستے معدے میں اتارنے ہی والا تھا۔'' میں نے لقمہ دیا۔

ہماری ان باتوں سے جارج کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ جھجکی جھجکی نگاہوں سے ہماری جانب دیکھنے لگا۔

نامکمل ھستی

راحیلہ تاج

انتقام ایک ایسا جذبہ ہے جو اگر کسی دل میں گھر جائے تو وہ انسان درندہ بن جاتا ہے۔

دونوں ٹانگوں سے محروم ایک معذور شخص کا قضیہ انتقام کی آگ نے اسے مجسم شعلہ بنا دیا تھا۔

نفرت وانتقام پر مبنی ایک ایسی کہانی، جسے آپ نظرانداز نہیں کرسکیں گے

کل جب میری ملاقات ہارڈی سے ہوئی تو مجھے بے حد حیرت ہوئی کیونکہ میرا خیال تھا کہ اب زندگی میں ہمارا کبھی آمنا سامنا نہیں ہوگا۔ یہ ملاقات کسی بھی اعتبار سے خوش گوار نہیں تھی۔ میں اس وقت اپنی پہیوں والی کرسی کو گھما کر باورچی خانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دفعتہ میرے گھر کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے کرسی کو گھمایا اور پہیوں کو ہاتھوں کی مدد سے چلاتا ہوا کمرۂ نشست میں پہنچا۔ یہ کمرہ میری خواب گاہ بھی تھا اور یہیں سے بیرونی راستے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ میں اس کمرے میں پہنچا تو وہ دروازہ کھول کر اندر آ چکا تھا۔ یہ اس کی مخصوص عادت تھی۔ وہ جہاں جی چاہے گھستا چلا آتا ہے۔

وہ کمرے میں آتے ہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا چہرہ مسکراہٹ کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم نظر آتا تھا۔ بے دانت کے مسوڑھے اس کے دہانے سے جھانک رہے تھے۔ اس کی کھوپڑی سے تربوز جیسی تھی، جسے دیکھ کر بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اسے کلہاڑی سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

میں ہیرون ویلی کا نظارہ کر کے واپس آیا ہی تھا کہ اس کی کار میرے گھر کے سامنے پہنچ گئی تھی لیکن اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس کار میں ہارڈی کا نفرت انگیز جسم بھی ہوگا۔

''تم کچھ موٹے ہو گئے ہو ہارڈی؟'' میں نے اس کی بیلٹ کے اوپر اور نیچے گوشت کی موٹی تہہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

وہ کاؤچ کے سامنے جھولے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ کرسی میرے بستر اور کپڑوں والی الماری سے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھی۔ میرے گھر میں بس اتنا ہی فرنیچر رہ گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو پہیوں والی کرسی پر زندگی گزار رہا ہو اسے زیادہ سامان کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

''ہماری ملاقات چار سال بعد ہوئی ہے دوست!'' ہارڈی نے کہا اور کرسی میں پہلو بدلنے کی کوشش کی۔ کرسی کے ہر حصے سے احتجاجی صدائیں بلند ہوئیں اور اس کی پتلون کے کپڑے کا ریشہ ریشہ الگ ہونے پر آمادہ دکھائی دینے لگا۔ کھڑکی سے آنے والی ایک کرن سے اس کی پتلون کا زِپ چمک رہا تھا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا، جس حالت میں بھی ہو گھر سے نکل کر دوسروں کے ہاں پہنچ جاتا تھا۔ نفرت سے میرا ذہن جھنجھنا اٹھا...... اور نفرت کی تلخی آواز میں بھی شامل ہو گئی۔

''مجھے دوست کہہ کر مت پکارو۔ بتاؤ...... تم کیا چاہتے ہو؟ اب تم کس چیز کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اتنی

مدت کے بعد تمہیں کیا چیز یہاں لائی ہے؟ میرے پاس تو اب کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا۔ سب کچھ تم پہلے ہی چھین چکے ہو۔"

"تمہیں اپنے ایک پرانے دوست سے اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کیا میں نے تمہاری پہیے دار کرسی کے لیے جگہ ڈھلوانیں نہیں بنوائیں؟ کیا میں وہ آدمی نہیں ہوں، جس نے تمہارے گھر میں، تمہاری سہولت کے لیے کئی اشیاء بھجوائی تھیں؟ کیا میں وہ آدمی نہیں، جس نے تمہارے ٹب......"

"تم وہی آدمی ہو ہارڈی!" میں نے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "جس نے ڈائنا مائٹ لگاتے وقت احتیاط نہیں کی اور مجھے زندگی بھر کے لیے اس کرسی میں قید کردیا ہے۔"

ہارڈی نے ناک کھجائی...... اور اسے کچھ اس انداز میں سکیڑ لیا جیسے ناگوار بُو محسوس کررہا ہو۔

"وہ ایک حادثہ تھا دوست! ورنہ میں نے تو اپنی زندگی میں کسی مکھی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا۔"

میں نے ماضی کا ایک ورق پلٹا۔ مکھی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا، میں نے اس کی بات ذہن میں دہرائی...... حالانکہ اسی شخص نے بچپن میں ایک بلی کو مارا تھا تو اس کے باپ نے سرزنش کی تھی جس پر چراغ پا ہوکر اس نے خونخوار بھینسے کے ذریعے اپنے باپ کو قتل کروادیا تھا۔

بظاہر اس کے باپ کی موت بھی ایک حادثہ ہی ثابت ہوئی تھی لیکن خود ہارڈی نے چند روز بعد مجھے چپکے سے بتادیا تھا کہ اسی نے بھینسے کا رسّہ کاٹ دیا تھا اور بعد میں رسّے کے کناروں پر مٹی لگادی تھی تاکہ کوئی یہ محسوس نہ کرسکے کہ رسّے کو کاٹا گیا تھا۔ مکھیوں کے معاملے میں تو وہ جنونی تھا۔ ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہارڈی پڑھائی کے دوران میں مکھیوں کو اذیت دے دے کر مارنے میں لگا رہتا تھا۔ وہ پہلے ان کے پَر نوچ ڈالتا تھا...... پھر ایک ٹانگ میں تاگا باندھ کر بعض اوقات انہیں چھوڑ دیتا تھا۔ مجھے بھی اس نے ایک ایسی ہی مکھی بنادیا تھا، جس کے پَر نوچ ڈالے ہوں اور وہ قوتِ پرواز سے محروم ہو۔

میرے ذہن میں اس کی ایک ایک حرکت گھوم گئی۔ ایک بار اس نے ایک مکھی کے پَر نوچ کر اس کی ٹانگ میں تاگا باندھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

"میرے پالتو جانور کو دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے روشنائی سے مکھی کو اچھی طرح لتھیڑ کر سفید کاغذ پر چھوڑ دیا۔ مکھی کے چلنے سے روشنائی مختلف لکیریں بنانے لگی۔ وہ ہنس پڑا۔ "یہ چینی زبان کی ماہر ہے، دیکھو کیسی خوش نما تحریر بنارہی ہے۔"

میں اس کی ہر حرکت پر پریشان ہوجاتا تھا لیکن ہارڈی کے سلسلے میں مجھے ایک بات آج تک سمجھ نہیں آئی۔ لڑکیاں اس پر جی جان سے مرتی تھیں۔ جب ہم جوان ہوگئے اور ہماری شادی ہوگئی تو اس کے گرد عورتوں کا جمگھٹا صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے، عورتیں اسے اتنا پسند کیوں کرتی ہیں؟

اس نے اوپر تلے تین شادیاں کی تھیں...... میری بیوی نورہ بھی اس کی ان بیویوں میں شامل تھی۔ پہلی بیوی چارلین کشتی الٹ جانے سے ہلاک ہوگئی تھی اور ہارڈی کا بیان تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ دوسری بیوی نے کسی نامعلوم وجہ کے تحت گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کرلی تھی اور آخر میں میری سابق بیوی نورہ بھی زینے سے گر کر مرگئی تھی۔

نورہ کے بارے میں ہارڈی کا بیان تھا کہ وہ میلے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے زینے سے اُتر رہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ سر کے بل زمین پر گرگئی، جس سے اس کی کھوپڑی چٹخ گئی اور اس کی گردن کی ہڈی کو بھی نقصان پہنچا تھا۔

نورہ نے اس کی دوسری بیوی کی خودکشی کے بعد مجھے چھوڑ دیا تھا، میں محض آدھا آدمی تھا اس لیے مجھے اس بات کا غم نہیں تھا کہ وہ میری ادھوری ہستی سے نالاں ہوکر کہیں چلی گئی تھی...... بلکہ دکھ یہ تھا کہ اس نے ہارڈی کو شوہر کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔

"کیا تم ابھی تک پتھر کی کان میں کام کررہے ہو؟" میں نے نورہ کی تکلیف دہ یادوں سے گلوخلاصی کے لیے سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے زیرِ لب مسکرا کر جواب دیا۔ "جیف بلین کی موت کے بعد سے میں وہاں فورمین کی حیثیت سے کام کررہا ہوں۔"

"جیف بلین مرچکا ہے؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"ہاں...... بہت عجیب حادثہ تھا۔" اس نے سوگواری کا گہرا تاثر اپنے منحوس چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے وہ ایک اچھا آدمی تھا۔"

"کیا ہوا تھا؟" میں نے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"پتھروں کو ریزہ ریزہ کرنے والی مشین کے پاس کھڑے اس نے معلوم نہیں کیا دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ گھومتے ہوئے پٹے کے قریب تھا۔ جھکنے سے اس کا کوٹ پٹے سے الجھ گیا اور وہ مشین میں جا گرا۔ میں اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھا لیکن افسوس میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکا...... اس کی آخری چیخ بڑی دلدوز تھی۔"

"یہ کب کی بات ہے اور ڈیبی کو کیا ہوا تھا؟" میں نے ہارڈی کی نئی بیوی ڈیبی کے بارے میں سوچتے ہوئے پوچھا۔ وہ نورہ جیسی حسین تھی اور عمر میں اس سے دس سال چھوٹی تھی۔

"ڈیبی...... ہاں...... میں اس کے لیے بہت غمگین ہوں۔ یہ غالباً نورہ کی موت کے دو مہینے بعد کا واقعہ ہے۔ میں اور ڈیبی ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے اور وہ ہماری ازدواجی زندگی کے شاندار لمحات تھے۔"

"کیا وہ واقعی مرچکی ہے؟"

"ہاں! میں نے انتہائی دکھ کے ساتھ اسے ایک ہفتے قبل ہی دفن کیا ہے۔ وہ الٹی سیدھی دوائیں استعمال کرنے کی عادی تھی۔ اس نے کوئی غلط دوا کھائی اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا...... بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے غلطی سے ایک صریح الاثر زہر کھالیا تھا۔"

"یہ سن کر واقعی دکھ ہوا ہارڈی!" میں نے کہا۔

"ہاں! لیکن میں زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔" اس نے قدرے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ دیکھنے چلا آیا تھا کہ تم اپنے شب و روز کیسے گزار رہے ہو۔ میں پرانے دوستوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ ان کی حیثیت میرے لیے خاندان کے افراد جیسی ہے۔"

میرے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا۔ جب پتھر کی کان میں ہم ساتھ ساتھ تھے اور اس نے میرے ہٹنے سے پہلے ہی ڈائنا مائٹ کے فلیتے کو آگ لگادی تھی۔ ایک چٹان میری پشت پر گری اور ریڑھ کی ہڈی کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کے بعد...... میں زندہ تو رہا لیکن پہیوں والی کرسی میرا مقدر بن گئی تھی۔ ہارڈی کہہ رہا تھا۔ "ایک دو دن قبل مجھے اچانک یاد آیا کہ تم سے ملے ہوئے کئی سال بیت گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تمہارے بھائی ہیری کا خیال بھی آیا۔ غالباً وہ کیلی فورنیا چلا گیا تھا؟"

میں نے جواباً سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”اور جینی..... تمہاری بہن!“ ہارڈی نے کہا۔ ”وہ آج کل کہاں ہے؟ میرا خیال ہے اس نے اب تک یکے بعد دیگر کئی لفنگوں سے شادی کر کے اپنے آپ کو مکمل طور پر تباہ کرلیا ہوگا۔“

”نہیں! اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ آگسٹا میں مقیم ہے اور وہیں ملازمت کررہی ہے۔“ میں نے کہا۔ جب میں جینی کے بارے میں اسے بتا رہا تھا تو مجھے اپنی زبان مفلوج ہوتی محسوس ہورہی تھی۔

”ہوں..... اور غالباً اس کا پتا وہی ہے جو اس نے کرسمس کارڈ پر لکھا تھا۔ یہ کارڈ اس نے ڈیبی کو بھیجا تھا۔ آج صبح اپنی پیاری بیوی ڈیبی کی درازوں کو صاف کرتے ہوئے مجھے وہ کارڈ نظر آیا تھا۔ میں گھر جا کر اسے تلاش کروں گا اور پھر جینی کو خط لکھوں گا۔ ممکن ہے مجھے اس سے فون پر بھی بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اس سے ملاقات بہت ضروری ہوگئی ہے۔“

مجھے اپنے پیٹ میں آنتیں الجھتی اور گرہوں میں بندھی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں نے کوشش کی کہ وہ میرے ہاتھوں کی طرف نہ دیکھے اس طرح اسے معلوم ہوسکتا تھا کہ میری اندرونی حالت کیا ہے۔

”میں پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے کسی روز اس کے پاس جاؤں گا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد اس سے بہت کم ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے اب تو وہ جسمانی اعتبار سے ایک شان دار خاتون بن گئی ہوگی۔“

میرے پیٹ میں درد نے شدت اختیار کرلی۔ آنتیں یوں الجھ رہی تھیں جیسے کئی زہریلے سانپ آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہوں اور بار بار مجھے ڈس رہے ہوں۔

”تم اس سے ملنے کب جاؤ گے؟“ میں نے آواز پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

”شاید آج رات کو چلا جاؤں۔“

”تم ایک دو روز انتظار کیوں نہیں کرلیتے؟“ میں نے کہا اور کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے ہارڈی کو اپنا پروگرام ملتوی کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ ”میرے پاس جینی کی چند تازہ ترین تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں اس نے سوئمنگ پول پر اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ کھنچوائی ہیں۔“ میں نے اپنی آواز کو قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ ”وہ واقعی خوب صورت لڑکی ہے۔“

ہارڈی نے بے چینی سے گوشت کے پہاڑ کو حرکت دی۔

”کیا وہ تصویریں یہیں تمہاری خواب گاہ میں ہیں؟“ اس نے بے قراری سے دریافت کیا۔ ”میں ابھی لاتا ہوں، کیا تم نے انہیں دراز میں رکھا ہے؟“

میں نے کرسی کو گھما کر اس کی راہ میں حائل کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔ تم کل آجاؤ، میں ان تصویروں کو تلاش کر کے رکھ لوں گا..... اور ہم اسے یہاں سے بھی فون کرسکتے ہیں۔ میں اسے اطلاع دے دوں گا کہ تم اس سے ملنے آرہے ہو۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک رہے گا۔“ ہارڈی نے فوراً تائید کی۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ ایک پرانے دوست سے مل کر بہت خوش ہوگی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے گلابی مسوڑوں کی نمائش کی اور میرے سامنے کھڑا اپنا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتا رہا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”اور ہاں..... کل تم یہاں آرہے ہو تو میرا ایک کام بھی کرتے آنا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایندھن کی ضرورت ہے، کچھ خشک لکڑیاں اپنی گاڑی پر لاد کر ضرور

لیتے آنا۔ میں کل تمہیں اس کی ادائیگی کردوں گا۔“

وہ دروازے کے لٹو پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

”میری گاڑی کے بریک زیادہ اچھے نہیں ہیں، لیکن خیر..... میں تمہارے لیے لکڑیاں لا دلاؤں گا۔“

میرے پیٹ میں بل کھاتے ہوئے سانپ قدرے پُرسکون ہوگئے۔

وہ چلا گیا تو میں کرسی کو گھماتا ہوا باہر لے آیا۔ میرا گھر اس علاقے میں سب سے آخری حصے پر واقع ہے۔ یہاں کئی ڈھلانیں ہیں اور ہائی وے کے مڑتے ہی ایک ایسی ڈھلان ہے جہاں بہت پہلے ایک تفریحی مقام تھا۔ آج کل وہاں کوئی نہیں جاتا البتہ میں تنہائی کاٹنے کے لیے اپنی کرسی اس ڈھلان تک لے جاتا ہوں اور دیر تک وہاں بیٹھا ڈھلان کے نیچے چٹانی سلسلے اور اس میں اچھلتی کودتی دریائی لہروں کا نظارہ کرتا رہتا ہوں۔

مینڈکوں اور چھوٹے موٹے جانوروں کو اپنی کرسی سے دور رکھنے کے لیے ایک چھڑی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہوں۔ یہ چھڑی ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے اس مقام پر چار سال تک پہیوں کو چلاتے چلاتے اور تھوڑی بہت حرکت سے اتنی ورزش کرلی ہے کہ اب میرے لیے ضرورت کے مطابق تھوڑا سا جھکنا تکلیف دہ ثابت نہیں ہوتا..... بلکہ اب تو میں باتھ روم کی سلاخوں پر جھولتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں دیر تک گھومتا رہا، اس کے بعد میں واپس گھر آگیا۔

رات بھر پُرسکون نیند کے مزے لوٹتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں نے ایک بوتل خریدی اور دو گلاسوں کے ساتھ اسے کمرے میں رکھ دیا۔ میں نے دوستی کی تجدید پر چند جام پینے کا ارادہ کرلیا تھا۔

☆......☆......☆

آج میں بہت خوش اور پُرسکون ہوں۔ میری محدود سی دنیا میں ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ میں دل کی گہرائیوں سے مطمئن ہوں۔ چند جام حلق سے اُتارنے کے بعد جب ہارڈی کی کھوپڑی گرم ہوجائے گی تو میں اسے اسی ڈھلان پر چلنے کی دعوت دوں گا، جہاں سے دریا اور چٹانوں کا دلفریب منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ میں اسے کہوں گا کہ کسی حسین لڑکی کی تصویریں دیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں ہوسکتی۔

ڈھلان سے کچھ دور وہ گاڑی روک کر تصویروں کا تقاضا کرے گا تو میں تصویروں کا لفافہ اسے دے دوں گا۔ وہ تصویروں میں منہمک ہوجائے گا اور...... یہ سوچتے ہوئے میں نے چھڑی بڑھا کر دروازے کا پٹ بند کرنے کی کوشش کی...... ہاں...... دروازے اور کرسی کا فاصلہ زیادہ ہے جب کہ میں اب اس سے زیادہ بھی جھک سکتا ہوں۔

اب مجھے بے چینی سے ہارڈی کا انتظار ہے۔ وہ کچھ دیر بعد میرے ہاں پہنچنے ہی والا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میں چھڑی سے اس کی گاڑی کے ایکسیلیٹر کو دبانے کی حد تک ضرور جھکنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ وہ تصویروں میں غرق ہوگا اور جب اسے احساس ہوگا تو اس وقت تک گاڑی ڈھلان پر پہنچ چکی ہوگی...... ایک ایسے مقام پر جہاں اچھے بریکوں والی گاڑیاں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں...... میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں اس حد تک جھکنے میں کامیاب نہ ہوا تو انتہائی کوشش کروں گا...... چاہے میری ریڑھ کی ہڈی...... اوہ، دروازے پر دستک ہورہی ہے...... وہ آرہا ہے......

پشیمان

اقبال بھٹی

مجرم خواہ کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو۔ ایک نہ ایک روز وہ اپنے جرم کا اعتراف خود اپنے منہ سے ضرور کرتا ہے اور پھر قانون کے شکنجے میں آجاتا ہے۔
ایک قتل کی رو داد' اس واردات کا نہ تو کوئی عینی گواہ تھا نہ کوئی ثبوت۔
ایک سراغ رساں کا احوال' اس نے مجرم کو تلاش کرکے اعتراف جرم کے لیے انوکھا طریقہ نکالا تھا۔

جرم وسزا پر مبنی ایک دلچسپ ودلکش اورنابغہ روزگار کہانی

9 نومبر 1910ء کو نیوجرسی کے ایزبری پارک میں میری اسمتھ نامی نوسالہ لڑکی کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ اس کے سر پر کسی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی تھی اور گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کے علاوہ اسے ذیادتی کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ اس بچی کی لاش اس مقام سے، جہاں وہ آخری مرتبہ نظر آئی تھی، تھوڑی ہی دور ایک جنگل میں پائی گئی تھی۔ لاش دریافت ہونے کے بعد مقامی سراغ رساں سرگرم عمل ہوگئے۔

دو ہفتے کی مسلسل کوشش کے باوجود کوئی سرا ان کے ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے نیویارک کی مشہور ومعروف برنس سراغ رساں ایجنسی سے رابطہ قائم کرلیا۔ ایجنسی نے یہ کیس اپنے نیویارک کے منیجر ریمنڈ کے حوالے کردیا۔ جوان العمر ریمنڈ نے اس کیس کو حل کرنے کے لیے ایک ایسا طریقہ اپنایا جو آج بھی سراغ رسانی کی دنیا میں کلاسیکی حیثیت رکھتا ہے۔

میری اسمتھ آخری مرتبہ تین بج کر دس منٹ پر اسکول سے گھر آتے ہوئے ایک نیم سنسان سڑک پر نظر آئی تھی لیکن وہ کبھی گھر نہ پہنچ سکی۔ چنانچہ جرم کا وقت اور جغرافیائی عناصر طے پا گئے۔ مصیبت یہ تھی کہ اس مشتبہ علاقے میں ریمنڈ کے خیال کے مطابق کم از کم ایک درجن ایسے افراد رہتے تھے جن پر ارتکاب جرم کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔

اس کیس میں ریمنڈ نے جو پہلا قدم اٹھایا۔ اسے زیادہ ذہانت آمیز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس نے ہتھوڑے پر مرغی کا خون مل کر ان تمام مشتبہ افراد کو دکھایا اور ان سے کہا کہ یہ ہتھوڑا لاش کے قریب پایا گیا تھا۔ کیا کسی نے اسے پہلے دیکھا ہے؟ انہوں نے یقیناً نہیں دیکھا تھا لیکن ریمنڈ دراصل ان کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ فرینک نامی ایک شائستہ اور خوب رُو گل فروش جو اسی مشتبہ علاقے کی ایک دکان میں کام کرتا تھا۔ ہتھوڑے کو دیکھ کر نروس ہوگیا۔

ریمنڈ کی عقابی نگاہوں سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی اور تب وہ اپنا اگلا قدم اٹھانے پر غور کرنے لگا۔

ایک بات طے ہے فرینک اگرچہ بظاہر بہت ہنس مکھ نظر آتا۔ لیکن بہ باطن سردمہر اور باتدبیر تھا۔ اگر واقعی اسی شخص نے قتل کا ارتکاب کیا تھا تو اس سے اقبال جرم کرانا کوئی آسان کام نہ ہوتا۔ چونکہ جسمانی شہادتیں ناپید تھیں۔

ریمنڈ جانتا تھا کہ اسے کسی طرح اس جرم کے بارے میں بات کرنے پر آمادہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور یہی سب سے مشکل کام تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا۔ اس نے سر آرتھر کانن ڈائل کی ایک کہانی ''دی ہاؤنڈ آف بیسکر ویلز'' پڑھ رکھی تھی۔ شرلاک ہومز کی اس شہرۂ آفاق کہانی میں رات کے وقت کسی شکاری کتے کے رونے کی بھیانک آواز مقامی لوگوں خاص طور پر چند مخصوص افراد پر نہایت دہشت ناک اثر ڈالتی تھی۔ اتفاق سے، مشتبہ گل فروش فرینک کی رہائش گاہ کے قریب ہی ایک بے حد جسیم کتا رہتا تھا۔ ریمنڈ نے اپنے ایک ساتھی کو ہدایت کی کہ وہ رات تین مرتبہ، بارہ بجے، دو بجے اور چار بجے اس کتے پر پتھر پھینکے۔ اس ساتھی سراغ رساں نے ایک ہفتے تک اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

اس دوران ریمنڈ ہر صبح سارے مشتبہ افراد خاص طور سے فرینک کا جائزہ لیتا رہا۔ کتے کی آواز دور تک سنی جاتی تھی۔ دس روز کے بعد ریمنڈ نے فرینک کا تعاقب کیا اور اسے ایک یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ فرینک ایک ڈاکٹر کے چیمبر میں داخل ہوگیا تھا۔

بعد میں وہ اس ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد گویا ہوا۔ ''میں انصاف اور قانون کے مفاد میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ فرینک ہیڈ نامی شخص کو کیا شکایت تھی؟''

''وہ سردی کی شکایت کر رہا تھا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بے حد گھبرایا ہوا نظر آتا تھا لیکن یہ بتانے پر آمادہ نہیں ہوا کہ کون سی شے اسے پریشان کر رہی ہے۔''

''تم نے اسے کیا تجویز کیا؟'' ریمنڈ نے پوچھا۔

''تبدیلی آب وہوا۔''

چند روز کے بعد فرینک نیویارک چلا گیا۔ ریمنڈ بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

نیویارک پہنچ کر فرینک نے چودھویں شاہراہ کے قریب ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور رہنے لگا۔ ریمنڈ اس کی سخت نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ وہ ہر روز مقررہ اوقات میں ایک ہی ریستوران میں کھانا کھاتا ہے۔ ریمنڈ کے ذہن میں ایک بات آئی کہ اگر فرینک کو کوئی ساتھی خاص طور سے کوئی جرمن ہم وطن مل جائے تو اس کی تنہائی دور ہو جائے گی اور وہ بہت خوش ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی ایجنسی کے ایک نوجوان جرمن کارل کو ہدایت کی کہ وہ بھی اسی ریستوران میں کھانا کھانا شروع کردے۔

کارل اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ کھانے کے دوران وہ ایک جرمن روزنامے کا بھی مطالعہ کرتا رہتا۔ ایک روز فرینک اس سے مخاطب ہوا۔

''میں دیکھ رہا ہوں تم جرمن ہو۔'' اس نے کہا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''میرا نام فرینک ہیڈ مین ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''مجھے کارل نمیسٹر کہتے ہیں۔''

''چلو کوئی فلم دیکھتے ہیں۔'' فرینک نے پیش کش کی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' کارل نے جواب دیا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

❀ ❀ ❀ ❀

اس روز کے بعد دونوں گہرے دوست بن گئے اور کثرت سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ فرینک چونکہ کہیں ملازمت نہیں کر رہا تھا اور اپنی پس انداز کی

ہوئی رقم پر گزارہ کر رہا تھا لہٰذا کارل کو بھی اپنی بے روزگاری کی وضاحت کرنی پڑی۔ ”مجھے کام کرنے کی ضرورت نہیں فرینک۔“ اس نے ایک روز فرینک کو آگاہ کیا۔

”جرمنی میں میرے باپ کی جاگیر ہے۔ جب تک اس کا تصفیہ نہیں ہو جاتا۔ مجھے فی ہفتہ پچھتر ڈالر ملتے رہیں گے۔“

ڈرامے کا پہلا اسٹیج بہت خوبی سے تیار ہو چکا تھا۔ اب ریمنڈ نے فرینک کا نفسیاتی ردعمل دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ دونوں دوست چونکہ آئے دن فلم دیکھنے جاتے تھے۔ ریمنڈ نے نیویارک کے مشرق میں واقع ایک چھوٹے سے سینما ہاؤس کے مالک سے گفتگو کی اور اسے اپنے اعتماد میں لے کر اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ فلم کے دوران جنسی تشدد کا ایک منظر جوڑ کر دکھا دے۔ کارل اور فرینک دوسرے تماشائیوں کے ساتھ اس شو میں موجود تھے۔ جب وہ منظر پردہ سیمیں پر آیا تو فرینک اپنی نشست پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ بہت مشکل سے سانس لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب قتل کا منظر سامنے آیا تو اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ایک الجھی الجھی سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تم سے کل ملوں گا کارل۔“ اس نے کہا۔ ”میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“

اب ریمنڈ کو یقین ہوگیا کہ یہی گل فروش اس بچی کا قاتل ہے۔ وہ کوئی چال چلنے پر غور کر ہی رہا تھا کہ فرینک نے اس کی مشکل آسان کردی۔

”کارل!“ ایک روز اس نے کہا۔ ”ہم ساتھ ہی کیوں نہ رہیں؟“

”مجھے اس پیش کش کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“ کارل نے خوش دلی سے کہا اور اس کے کمرے میں منتقل ہوگیا۔

اس نئی صورت حال نے ریمنڈ کو کارروائی کرنے کے لیے ایک نیا میدان فراہم کردیا۔ اس نے سراغ رساں کارل کو چند ہدایات دیں اور انتظار کرنے لگا۔

کارل نے ہدایت کے مطابق پہلی ہی رات فرینک کو سوتے میں جھنجوڑ کر جگا دیا۔

”کیا بات ہے فرینک!“ اس نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم نیند میں تقریباً ایک گھنٹے سے بڑبڑا رہے ہو۔“

فرینک اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ”میں کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے جاننا چاہا۔

کارل نے شانے اچکائے۔ ”ٹھیک سے سن نہیں سکا۔“ وہ بولا۔ ”لیکن تم کسی لڑکی کے متعلق بڑبڑا رہے تھے۔“

فرینک اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا اور ایک جھولن کرسی پر بیٹھے بیٹھے بقیہ رات سگریٹ پھونکتے ہوئے گزار دی۔ کارل نے یہی عمل بے شمار راتوں کو دہرایا لیکن اب حکام بہت بے چین ہو گئے تھے اور وہ اس کا نتیجہ چاہتے تھے۔

ریمنڈ اور اس کے باس ولیم برنس نے ان سے درخواست کی کہ انہیں مزید مہلت دی جائے کیونکہ اگر جلد بازی سے کام لیا گیا تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔

پھر ریمنڈ نے ایک اور پتا پھینکا۔ اس نے ایزبری پارک پریس کے ایڈیٹر لائل کو اپنے روزنامے میں ایک کہانی شائع کرنے پر آمادہ کرلیا جس کے مطابق حکام کو ایک ہتھوڑا مل گیا تھا جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ یہ وہی ہتھوڑا ہے جو قتل میں استعمال کیا گیا تھا۔

یہ کہانی قسط وار شائع کرنے اور فرینک کو پڑھانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ریمنڈ جانتا تھا کہ یہ کہانی فرینک کی نظروں سے گزرے گی کیونکہ وہ اس روزنامے کا قاری تھا۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ فرینک نے بھی وہ کہانی پڑھی اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونکنے لگا۔ پھر کارل نے وہ اخبار اٹھا لیا اور عام سے انداز میں پڑھنے لگا۔ اچانک وہ فرینک سے مخاطب ہوا۔

”فرینک!“ وہ بولا۔ ”یہاں تمہارا نام شائع ہوا ہے۔ کیا تم ایزبری پارک کے رہنے والے ہو؟“

فرینک آنکھیں نکال کر اپنے دوست کو گھورنے لگا۔ ”ہاں! میں نے وہاں دو سال کام کیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرا نام کہاں شائع ہوا ہے؟“

کارل نے اس کا نام اسے دکھایا۔ ”وہ لوگ کبھی اس قتل کا معما حل نہیں کرسکیں گے۔“ فرینک نے کہا۔ ”جو ہتھوڑا انہیں ملا ہے۔ وہ قتل والا ہتھوڑا نہیں ہے۔ کیونکہ.........“ وہ اچانک رک گیا۔

”چلو، چل کر کوئی فلم دیکھتے ہیں۔“ کارل نے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

اب اس شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ فرینک ہی قاتل ہے۔ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرتے کرتے رہ گیا تھا۔ اب ریمنڈ اس سے مکمل اقبال جرم کرانے کی ترکیب لڑانے لگا۔

ایک روز کارل نے ریمنڈ کی ہدایت کے مطابق ایک بگھی کرائے پر لی اور اپنے دوست فرینک کے ساتھ تفریح کی غرض سے ایک ویران اور سنسان علاقے کی طرف نکل گیا۔

راہ میں ایک شخص نے لفٹ لینے کی غرض سے ان کی بگھی روکنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی غنڈہ معلوم

ہوتا تھا۔ کارل نے بگھی روکنے سے انکار کر دیا۔ جواب میں اس شخص نے اسے گالی دی۔ کارل بگھی سے سڑک پر کود گیا اور اس شخص سے گتھم گتھا ہوگیا۔ اس شخص نے ایک پتھر اٹھا کر اس پر پھینکا۔ کارل بروقت جھکائی دے کر بچ گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکال لیا اور دو فائر کیے۔ وہ شخص منہ کے بل سڑک پر ڈھیر ہوگیا۔ کارل نے مزید کئی فائر کیے اور اس کی لاش کو لڑھکا کر سڑک کے کنارے کرنے کے بعد اچھل کر بگھی میں سوار ہوگیا۔ گھوڑے کو چابک مارا اور بگھی تیزی سے روانہ ہوگئی۔ ''کارل تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فرینک نے گھبرا کر کہا۔

''کیوں نہیں؟'' کارل نے خوف اور برہمی کی ملی جلی کیفیت کے تحت پوچھا۔

''کیونکہ......'' فرینک نے کہا۔ ''تم جب تک زندہ رہو گے خود کو محفوظ تصور نہیں کرو گے۔ تم محفوظ رہو گے بھی نہیں۔ تم نے کسی کو قتل کر دیا ہے اور تمہیں یہ خوف ہمیشہ رہے گا کہ پولیس تمہیں ڈھونڈ نکالے گی۔''

''میں اس کے متعلق کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔'' کارل غرایا۔

یہ سب جو بھی پیش آیا تھا محض ایک ڈرامہ تھا۔ وہ غنڈہ جس نے بگھی رکوانے کی کوشش کی تھی۔ برنس ایجنسی کا ایک سراغ رساں اور کارل کا ساتھی تھا۔ کارل نے صرف ہوائی فائر کیے تھے۔ اب ریمنڈ نے ایک اور جعلی خبر چھپوائی۔

''ہیرالڈ'' کے پبلشر نے اخبار کی ایسی کاپی شائع کی جس میں اس شخص کے قتل کی رپورٹ تھی اور قاتل کا حلیہ بھی تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ کارل نے وہ کاپی فرینک کو دکھائی اور کہا کہ اب انہیں یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔

دونوں نیویارک سے فلاڈیلفیا چلے گئے اور وہاں سے اٹلانٹک سٹی پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ تک ایک بینکر اور کارل کے درمیان جعلی خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا جس کے مطابق جرمنی میں اس کے باپ کی جاگیر کا معاملہ تھوڑے ہی عرصے میں طے پانے والا تھا۔

''جب مجھے رقم مل جائے گی تو ہم کیلی فورنیا چلے جائیں گے۔'' کارل نے ایک روز کہا۔ ''یا کہیں دور نکل جائیں گے۔ میں تمہیں گل فروش کی حیثیت سے سیٹ کر دوں گا۔ کہو کیسا رہے گا؟''

''زبردست۔'' فرینک نے خوش ہو کر کہا۔

اب اسٹیج کارروائی کے لیے بالکل خالی تھا۔ ریمنڈ نے اسے دہشت زدہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسے ذہنی جھٹکے بھی دیے لیکن کوئی شے بھی اس سے اقبال جرم نہیں کرا سکی تھی۔ اب اس کی اگلی چال کو آخری چال ثابت ہونا تھا۔

چار ماہ گزر گئے تھے۔ دونوں دوست ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ ریمنڈ اور برنس ایجنسی کے دیگر سراغ رساں اس سے متصل کمرے میں آلۂ سماعت کے ساتھ موجود تھے۔

ایک روز کارل کو ایک ایسا خط موصول ہوا جس کے سلسلے میں اس نے یوں ظاہر کیا کہ گویا راز داری برت رہا تھا۔ حالانکہ وہ بہت بے تکلفی سے فرینک کو اپنی ہر بات بتا دیا کرتا تھا۔ وہ یہ خط میز پر ''بھول'' کر سگریٹ کا پیکٹ خریدنے نیچے لابی میں چلا گیا او جب واپس آیا تو فرینک غصے سے پاگل ہوا رہا تھا۔ وہ خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

تو تم مجھے ڈبل کراس کرنے کا ارادہ رکھ تھے...... ایں......؟'' اس نے پوچھا۔

وہ خط جو ریمنڈ نے نارتھ جرمن لائیڈ اے پیڈ پر لکھا تھا۔ ایک بحری جہاز کے ریزرویشن کی تصدیق کرتا تھا۔ اس کے مطابق کارل کو دو روز بعد جرمنی سفر کرنا تھا۔

''تم اور تمہاری بڑی بڑی باتیں......'' فرینک چیخا۔ دوسرے کمرے میں ریمنڈ اور اس کے ساتھی سراغ رساں سن رہے تھے۔

''تم مجھے کاروبار کرانے والے تھے...... تم...... میرے دوست اور اس کے بجائے تم نے کیا کیا؟ تم مجھے چھوڑ کر جرمن واپس جانے کا منصوبہ بنا رہے ہو۔''

''فرینک۔'' کارل اس کے خاموش ہونے پر گویا ہوا۔ ''تم جانتے ہو...... میں تمہیں کتنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن انسان ایک عجیب مخلوق ہے فرینک...... تم ہو یا میں...... سب بدل جاتے ہیں۔ آج دوست ہیں، کل دشمن بن جاتے ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' فرینک نے کہا۔

''فرض کرو کہ اتنے گہرے دوست ہونے کے باوجود تمہارے اور ہمارے درمیان لڑائی ہو جاتی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے اس غنڈے کو قتل کیا تھا۔'' کارل نے کہا۔ ''تم جا کر پولیس کو بتا سکتے ہو کہ میں نے قتل کیا تھا۔

''تو یہ بات ہے۔'' فرینک بولا۔ اس کا لہجہ پُرسکون تھا۔

''ہاں۔'' کارل نے جواب دیا۔ ''یہ بات ہے۔ میں واپس جرمنی جا رہا ہوں کیونکہ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا ایسا نہ کرتے؟ اگر تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ کوئی جانتا ہے کہ تم نے قتل کیا ہے؟''

''نہیں۔'' فرینک نے کہا۔

کارل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کاش میں تمہاری بات پر یقین کر سکتا۔''

''تم یقین کر سکتے ہو۔'' فرینک نے کہا۔ ''میں پولیس کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ تم نے کسی کو قتل کیا تھا۔ کیونکہ...... کیونکہ میں نے بھی ایک قتل کیا تھا۔''

''تم نے قتل کیا تھا؟'' کارل نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم نے کس کو قتل کیا تھا؟''

''میں نے ایزبری پارک میں اس لڑکی کو قتل کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یاد ہے اخبار میں میرا نام شائع ہوا تھا۔''

''تم یہ محض اس لیے کہہ رہے ہو تا کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔''

''نہیں کارل۔ میں نے واقعی اس چھوٹی سی لڑکی کو قتل کیا تھا۔'' فرینک نے زور دے کر کہا۔ ''میں نے اسے 9 نومبر کو قتل کیا تھا۔ اس کے سر پر ہتھوڑے سے ضرب لگائی تھی پھر اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔''

''یقین نہیں آیا۔'' کارل نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔''

فرینک نے اصرار کیا اور پورا واقعہ شروع سے آخر تک اسے کہہ سنایا تا کہ اس کا دوست اسی ملک میں رہے اور اس کے کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرے۔

ابھی اس کی داستان ختم ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کارل سمجھ گیا کہ دستک دینے والے اس کے ساتھی ہیں۔ چنانچہ وہ فرینک کو نظر انداز کر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

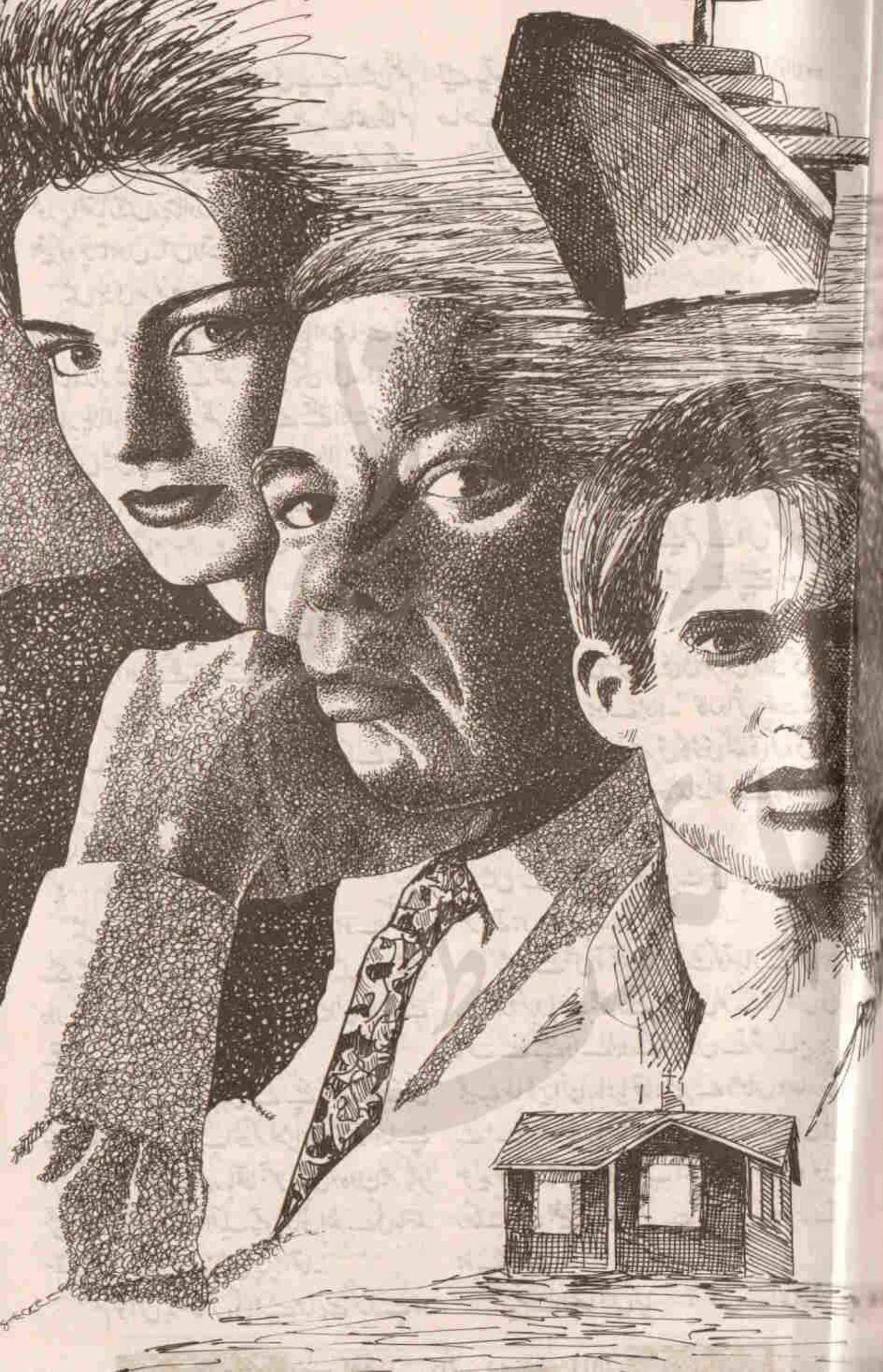

قسط نمبر1

بازی گر

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا مگر اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی سلسلے وار کہانی

ٹھیک نو بجے صبح میں نے بس کو خیر باد کہا اور ایک جانب پیدل چلنا شروع کردیا۔ یہ شہر کا مشہور اور مصروف کاروباری مرکز آئی آئی چندریگر روڈ المعروف میکلوڈ روڈ تھا جہاں مختلف بینکس کے ہیڈ آفسز کے علاوہ کثیر المنزلہ عمارتوں میں ہر نوعیت کی کاروباری کمپنیز کے دفاتر قائم تھے جہاں صبح سے شام تک مشینی انداز میں کام ہوتا تھا۔ ان دفاتر میں کام کرنے والے افراد کو دن بھر سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ مین میکلوڈ روڈ اور اس سے ملحقہ ذیلی گلیوں میں بھی انسانی نقل و حرکت افراتفری اور تیزی کا نمونہ پیش کرتی تھی۔ جیسے کہ ہر شخص کو اپنی منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔

مجھے اس "بزنس سینٹر" کی ایک ملٹی اسٹوریز بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر پہنچنا تھا جہاں "برہان ٹریڈرز" کا دفتر واقع تھا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے بے روزگار تھا اور ایک جاب کے سلسلے میں انٹرویو دینے آیا تھا۔ چند دن پہلے میں نے اپنی سی وی برہان ٹریڈرز میں جمع کرائی تھی۔ میری خوش قسمتی کہ یہاں مجھے انٹرویو کال بھی آ گئی تھی ورنہ بے روزگاری کے عذاب کو کم کرنے کے لیے سی ویز تو میں مختلف جگہوں پر ڈالتا ہی رہتا تھا لیکن شنوائی خال خال ہی ہوتی اور اگر کہیں جاب مل بھی جاتی تو وہ زیادہ عرصہ چلتی نہیں تھی۔

میں اپنی مطلوبہ کثیر المنزلہ عمارت سے چند قدموں کی دوری پر ہی تھا کہ ایک منظر نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ ایک گلی کے کونے پر درجن بھر افراد جمع تھے اور ان کی بلند آہنگ آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے صورت حال مجھ پر واضح ہوگئی۔

ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص نہایت ہی طیش کے عالم میں کچرا چننے والے ایک میلے کچیلے مفلوک الحال لڑکے کو زدوکوب کررہا تھا۔ مذکورہ لڑکا خود کو بچانے کے لیے اپنے ہاتھوں کو بے ہنگم حرکت تو دے رہا تھا تاہم "صاحب" کے سامنے اس کی پیش نہیں چل رہی

تھی۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اچانک میرے اندر ظالم کے خلاف نفرت کا ایک لاوا سا ابل پڑتا ہے پھر مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا اور میں سود و زیاں کا حساب کیے بغیر کود پڑتا ہوں۔ اس وقت بھی میں نے یہی کیا۔

میں بڑی سرعت اور ہوشیاری سے اس مغلوب الغضب صاحب کے عقب میں پہنچا اور نہایت ہی چوکنا انداز میں اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ بے اختیار پلٹا اور خون خوار نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے لاتعداد الجھن زدہ سوالات دکھائی دیے۔ میں نے دائیں ہاتھ کی ایک میکانکی حرکت سے اس کے تمام سوالات کا ایک ہی بھرپور جواب دے ڈالا۔

آنِ واحد میں میرا طوفانی گھونسا اس کی مغرور ناک پر پڑا اور اگلے ہی لمحے وہاں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اسے اس معیار کا منہ توڑ جواب بھی دے سکتا ہے۔

اس نے ہاتھ کی پشت سے ناک سے نکلنے والے خون کو صاف کیا اور چھوٹتے ہی مجھے گالی دی۔

''یو...... باسٹرڈ......!''

میں نے اپنے دماغ کو قابو میں رکھتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔ ''اس گالی کا جواب میں تمہیں بعد میں دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ' اس غریب کو کیوں مار رہے تھے؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے پٹنے والے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا جو اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور اپنے اس تھیلے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں وہ دن بھر کچرا جمع کیا کرتا تھا۔ وہ تھیلا ایک چم چماتی انڈے کی مانند سفید گاڑی کے قریب زمین پر پڑا تھا۔

''تم تو اس بدمعاش کی ایسے حمایت کر رہے ہو جیسے یہ تمہارا رشتے دار ہو؟'' مجھ سے مار کھانے والا وہ صاحب طنزیہ لہجے میں بولا۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاصے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس ملک کا ہر مظلوم میرا رشتہ دار ہے۔ بتاؤ' اس کچرا چننے والے لڑکے نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

وہ سفید گاڑی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں دو منٹ کے لیے اپنی گاڑی یہاں کھڑی کر کے گیا تھا۔ واپس آ کر دیکھا تو یہ بدمعاش کچرے کا تھیلا میری گاڑی کی ڈکی پر رکھے ایک جانب مزے سے کھڑا تھا۔''

''بس' اتنی سی بات کے لیے تم نے اس معصوم کو روئی کی مانند دھنک ڈالا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نے کل ہی اپنی گاڑی کی سروس کرائی تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کار واش مفت میں نہیں ہوتی۔ سالے نے میری گاڑی گندی کر دی۔''

بات کے اختتام پر اس نے معاندانہ نظر سے کچرا چننے والے کی طرف دیکھا۔

میں نے اس کی اجلی شرٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے بھی تو تمہاری شرٹ کو تمہارے ہی لہو سے گندا کر دیا ہے مجھ سے بدلہ نہیں لو گے؟'' اس کی ناک سے ٹپکنے والے لہو کے قطروں نے شرٹ پر بڑا عجیب سا ڈیزائن بنا دیا تھا۔ میرے دھواں دھار پنچ نے اسے باور کرا دیا تھا کہ مجھ سے الجھنے میں اس کی مزید ٹوٹ پھوٹ کا غالب اندیشہ تھا لہٰذا وہ کوئی رسک لیے بغیر خود کو اوپر سے مضبوط ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا......؟'' اس کے انداز میں دھمکی چھپی تھی۔

''میں اچھا صرف اچھے لوگوں کے ساتھ کرتا ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تم جیسے فرعونوں سے تو میں لات جوتے کا برتاؤ ہی کرتا ہوں۔''

''میں تمہیں اس حرکت کا جواب ضرور دوں گا......!'' وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔''

''ابھی تک تو میں نے یہی جانا ہے کہ تم ایک ذلیل اور کمینے انسان ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں' بتاؤ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟''

لوگوں نے دیکھا کہ بات بڑھنے والی ہے تو بیچ بچاؤ کرنے کو دوڑ پڑے۔ اس سے پہلے جب وہ شخص کچرا چننے والے کی پٹائی کر رہا تھا تو یہی لوگ خاموش تماشائی بنے اس بے چارے کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہم بہ حیثیت قوم اجتماعی بے حسی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہم دن رات اپنے گرد و پیش میں ظلم و زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارا لاتعلقی کا یہ رویہ ظالم کے ہاتھوں کو مضبوط اور حوصلے کو بلند کرتا ہے۔ میری آمد سے قبل درجن بھر افراد کچرا چننے والے لڑکے کو پٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے اپنی زبان تک کو زحمت دینا گوارا نہیں کیا اور اب سب بڑھ چڑھ کر اس شخص کو لعن طعن کر رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر سو میں سے ایک شخص بھی بہادری کے ساتھ پہل کرنے والا ہو تو دیکھتے ہی دیکھتے باقی ننانوے اس کی آواز سے آواز ملانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کاش! اس قوم کو ہر سو میں ایک ظالم کا ہاتھ روکنے والا مل جائے تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دنوں میں قوم کی تقدیر بدل جائے گی اے کاش!

وہ سوٹڈ بوٹڈ شخص! اچھی طرح جان گیا تھا کہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ وہاں موجود لوگوں کے تیور بھی بھانپ چکا تھا لہٰذا اس نے خاموشی سے نکل لینے میں ہی عافیت جانی۔ وہ کینہ توز انداز میں مجھے گھورتے ہوئے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ پھر پہلی فرصت میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں نے پلٹ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن کچرا چننے والا وہ آلودہ لباس لڑکا مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ہماری بحث و تکرار کے دوران میں چپکے سے کھسک لیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھا دیے۔

جب میں لفٹ کے ذریعے کثیر المنزلہ عمارت کے آٹھویں فلور پر پہنچا تو میری رسٹ واچ پونے دس کا وقت بتا رہی تھی۔ انٹرویو کے لیے نو سے گیارہ بجے تک کا وقت دیا گیا تھا۔ میں اپنے گھر سے تو اسی عزم کے ساتھ نکلا تھا کہ ''برہان ٹریڈرز'' میں انٹرویو کی غرض سے قدم رکھنے والا پہلا شخص میں ہی ہوں گا لیکن اس کمینے صاحب سے ہونے والی بدمزگی نے مجھے اپنے پروگرام سے پینتالیس منٹ لیٹ کر دیا تھا۔ اللہ کا شکر کہ انٹرویو کا مقررہ وقت ختم ہونے میں ابھی سوا گھنٹا باقی تھا۔

برہان ٹریڈرز امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ میں اس وقت کمپنی کے ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ یہ کمرا کسی ہال سے مشابہ تھا اور میں وہاں اکیلا نہیں تھا۔ میرے علاوہ کم از کم پچاس افراد وہاں بیٹھے نظر آ رہے تھے جو سب کے سب مرد تھے۔ اس پوسٹ کے اشتہار میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ

صرف میل ہی رجوع کریں ورنہ عموماً میں جہاں بھی انٹرویوز کے لیے جاتا تھا لیڈیز اینڈ جینٹس کی ملی جلی صورتیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ میرے قریب بیٹھے ایک دبلے پتلے اور دراز قامت نوجوان نے مجھ سے کہا۔

”میرا نام خوش ولی ہے۔ میں انٹرویو کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ مگر امیدواروں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر مجھے تشویش ہو رہی ہے۔“

”مایوسی گناہ ہے خوش ولی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے خال و خط اور لہجے سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس کا تعلق چترال یا گلگت سے تھا۔ اس نے اضطراری انداز میں کہا۔

”شاید میں اس لیے بھی زیادہ نروس ہو رہا ہوں کہ یہ میری پہلی جاب ہے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ کا بھی یہ پہلا تجربہ ہے۔“

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”میں اس معاملے میں خاصا تجربہ کار ہو چکا ہوں۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ کوئی بھی کام پہلی مرتبہ کیا جائے تو اعصاب پر اس کے ایسے ہی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟“

”میں کامرس گریجویٹ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کامرس ہی میں ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔ جاب کے ساتھ ساتھ۔“

”ایم بی اے کیوں نہیں؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر موقع ملا اور حالات نے اجازت دی تو ایم بی اے ٹرائی کروں گا۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”ورنہ کامرس میں ماسٹرز تو کہیں نہیں گیا۔“

”اللہ آپ کو کامیاب کرے خوش ولی صاحب!“ میں نے تہ دل سے کہا۔

”سب کچھ مجھ سے پوچھے جائیں گے۔“ وہ نیم شکایتی لہجے میں بولا۔ ”اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتائیں۔“

اِدھر اس کی بات ختم ہوئی اُدھر اس کے نام کی پکار پڑ گئی۔ ”مسٹر خوش ولی!“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر سرسری انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

”وش یو گڈ لک۔“

”تھینک یو۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں ویٹنگ روم میں بیٹھے جاب کے متمنی افراد کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ ہر چہرے اور اس چہرے کی آنکھوں میں آس اور امید کے دیے روشن تھے۔ پچھلے دو سال میں، میں نے روزگار کے سلسلے میں جس طرح ٹھوکریں کھائی تھیں ان کا احوال تلخ و ترش میری سنگین یادداشتوں کے خانے میں محفوظ تھا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے۔

انسان کے پاس چاہے کیسی بھی چھوٹی موٹی لولی لنگڑی نوکری کیوں نہ ہو وہ غم روزگار کے لیے اکسیر کا کام کرتی ہے۔ اللہ کسی کو بے روزگار نہ کرے!

ساڑھے دس بجے تک خوش ولی باہر نہیں نکلا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے بے ساختہ سوچا، یار یہ بندہ کہاں رہ گیا؟

اگلے ہی لمحے مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ میں کافی دیر سے ویٹنگ روم میں موجود تھا اور میرے سامنے آٹھ سے دس افراد اٹھ کر اندر کمرے میں گئے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی انٹرویو کے بعد باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ جس امیدوار کا انٹرویو ہو جاتا تھا اسے کسی دوسرے راستے سے باہر کی راہ دکھائی جاتی تھی۔ ہاں، یہی بات تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک امیدوار کمرے کے اندر موجود ہو اور دوسرے کو کال کر لیا جائے۔ فارغ ہونے والوں کو یقیناً کسی اور راستے سے باہر بھیجا جاتا تھا۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں مصروف تھا کہ ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”مسٹر اسد اللہ!“

میں اپنا نام سن کر چونکا اور پکارنے والی کی طرف دیکھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو انٹرویو کے لیے آنے والوں کو باری باری اندر بھیج رہی تھی۔ اس کی پکار پر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر چند سیکنڈ بعد میں کمرے کے اندر تھا۔

وہ ایک عالی شان کمرا تھا۔ کسی بھی بڑی کمپنی کے باس کا کمرا ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ایک کنگ سائز ٹیبل کی دوسری جانب متاثر کن شخصیت کا مالک ایک شخص بیٹھا تھا میں بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے مذکورہ شخص کے قریب پہنچا لیکن بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ پچھلے دو سال میں متعدد دفاتر میں انٹرویوز دے دے کر میرے تجربے میں یہ بات آئی تھی کہ اکثر باس خود کو زمینی خدا سمجھتے ہیں اور اپنی مرضی کے خلاف یا اپنی اجازت کے بغیر کسی عمل کو پسند نہیں کرتے۔ جب تک وہ خود بیٹھنے کو نہ کہیں یہ جسارت نہیں کرنا چاہیے۔

کرسی کی دوسری طرف موجود شخص نے خاصی معقولیت کا مظاہرہ کیا اور دبنگ انداز میں کہا۔

”مسٹر اسد اللہ تشریف رکھیں۔“

میں نے دھیرے سے ایک کرسی کھینچی اور شائستگی سے اس شخص کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی میز پر مختلف فائلیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ میری فائل اس نے کھول رکھی تھی۔ میں اپنی سی وی کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔

”مسٹر اسد اللہ!“ وہ میری سی وی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے بہت سی سی ویز دیکھی ہیں مگر آپ کی سی وی جیسی میری نظر سے نہیں گزری۔“

”سر!“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”میری سی وی میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟“

”دو سال میں صرف دو سال کے عرصے میں دس جگہ کام کیا ہے آپ نے۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یعنی کہیں بھی تین ماہ تک ٹک کر جاب نہیں کی اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”کسی کمپنی کو میں یا میرا کام پسند نہیں آیا اور کوئی کمپنی مجھے اچھی نہیں لگی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لہٰذا یا تو میں نکال دیا گیا یا میں نے خود چھوڑ دیا۔“

”اس نکلنے اور نکالنے کا کوئی بنیادی سبب بھی رہا ہوگا؟“ وہ پوری طرح میری جانب متوجہ تھا۔

”سبب کے بغیر اس دنیا میں کچھ نہیں ہوتا سر!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے معاملے میں بھی کوئی سبب یقیناً کارفرما رہا ہے۔“

”میں وہی سبب جاننا چاہتا ہوں؟“ وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”شاید میری صاف گوئی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”کوئی بھی غلط کام ہوتا دیکھ کر مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ میں اپنی زبان کو روک نہیں پاتا اور بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن اور مخالف بنا لیتا ہوں۔“

”ہوں......!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”اب یہی دیکھیں سر!“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں نے اپنی جابز کے حوالے سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور اس بات نے آپ کو حیران کر دیا کہ دو سال کے عرصے میں، میں نے کتنے

تجربات کر ڈالے ہیں۔ میرا یہ سچ میں جانتا ہوں میرے حق میں نہیں جاتا۔ اگر میں چاہتا تو یہاں غلط بیانی سے کام لے سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”مثلاً کس قسم کی غلط بیانی؟“ وہ میری باتوں میں دل چسپی لیتے ہوئے بولا۔

”میں نے دو سال کے عرصے میں اپنی دس جابز کا ذکر کیا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر میں چاہتا تو دو تین جابز کا تذکرہ کرتا۔ اس کا مجھے دہرا فائدہ پہنچتا۔“

”دہرا فائدہ۔“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ایسا کرنے سے آپ کی نظر میں زیادہ تجربہ کار ثابت ہو جاتا۔ دوسرے یہ تاثر قائم نہ ہوتا کہ میں کسی بھی سیٹ اپ میں آسانی سے ایڈجسٹ نہیں ہوتا۔“

”میں آپ کی سوچ سے اتفاق نہیں کرتا مسٹر اسد!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے آپ کے حوالے سے کوئی بھی نگیٹیو تاثر نہیں لیا۔“

”حیرت کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ عموماً تو وہی ہوتا ہے جو میں نے کہا ہے۔“

”میں آپ کی اس بات سے ضرور اتفاق کروں گا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”عموماً وہی ہوتا ہے جو اصول آپ نے بیان کیا ہے لیکن میں سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہوں اور آپ کی اسی سچ بولنے والی عادت کے طفیل میں نے آپ کو جاب کے لیے کنفرم کر لیا ہے۔“

”تھینک یو سر!“ میں نے ممنونیت سے بھرے لہجے میں پھر پوچھا۔ ”آپ کا نام سر؟“

”مجھے عاطف رشید کہتے ہیں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”میں اس کمپنی کا ایم ڈی ہوں۔“

”ایم ڈی“ کا سیدھا سیدھا مطلب مالک ہوتا ہے۔ میں نے عاطف رشید سے پوچھا۔

”سر! مجھے آپ کی کمپنی برہان ٹریڈرز میں کس پوسٹ پر کام کرنا ہوگا؟“

”آپ کو میں نے اپنی کمپنی کے لیے کنفرم نہیں کیا مسٹر اسد اللہ!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”پھر سر یہ انٹرویو کس سلسلے میں تھا؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے بڑے بھائی صاحب خالد رشید کی سائٹ ایریا میں فارما سیوٹیکل کمپنی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہیں ان کی کمپنی کے لیے منتخب کیا ہے۔“

”وہاں میں کیا کروں گا سر!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”بھائی صاحب کو اپنے اکاؤنٹ سیکشن میں ایک پڑھے لکھے اور معقول آدمی کی ضرورت ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔“

”لیکن سر! اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے میں نے پہلے کبھی کام نہیں کیا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نہ ہو کہ آپ کے بھائی صاحب کو میری کارکردگی سے مایوسی ہو۔“

”انہیں ہرگز مایوسی نہیں ہوگی!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں نے آپ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“

”یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے سر!“ میں نے احسان بھرے انداز میں کہا۔

”اصل میں بھائی صاحب کی کمپنی میں ایک تجربہ کار اکاؤنٹنٹ پہلے سے موجود ہے۔“ عاطف رشید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے دنوں ان صاحب کو فالج کا اٹیک ہوا تھا جس کے نتیجے میں ان کا دایاں بازو مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں مدد کے لیے ایک سمجھ دار اور تعلیم یافتہ شخص کی ضرورت ہے۔ یوں سمجھیں کہ......!“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”اسد صاحب! آپ یوں سمجھ لیں کہ اکاؤنٹنٹ کے کام میں ہاتھ آپ کے چلیں گے اور دماغ انور صاحب کا۔ انور صاحب ان اکاؤنٹنٹ کا نام ہے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔“

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے عاطف رشید یہ کہہ رہا ہو کہ انور صاحب کا دایاں ہاتھ مفلوج ہے اور میری کھوپڑی میں دماغ موجود نہیں؛ مگر میں نے اس کے ساتھ کسی قسم کی جرح بحث ضروری نہ سمجھی۔ مجھے کافی دنوں کی بے روزگاری اور خواری کے بعد نوکری مل رہی تھی۔ میرے لیے یہی بہت تھا۔ میں نے عاطف رشید کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے چند ہدایات دیں اور میں سلام کر کے اس کے آفس سے نکل آیا۔

واپسی کے لیے جب مجھے دوسرا راستہ دکھایا گیا تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ خوش ولی اور دوسرے لوگ انٹرویو کے بعد اس ہال سے کیوں نہیں گزرے تھے۔ جہاں جاب کے امیدوار اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

میں لفٹ کے ذریعے جب اس کثیر المنزلہ عمارت سے باہر آیا تو خوش ولی پر نظر پڑی۔ وہ بلڈنگ کے گیٹ پر موجود تھا اور میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ وہاں میرے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ تیزی سے میری سمت بڑھا اور اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

”کیا رہا یار......!“

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ایسے انداز میں مجھے دیکھا جیسے میرا نام جاننا چاہ رہا ہو۔ میں نے فوراً اس کی ضرورت پوری کرتے ہوئے کہا۔ ”اسد اللہ!“

”ہاں اسد اللہ! انٹرویو کیسا رہا؟“ وہ کرید نے والے انداز میں بولا۔

”اے ون!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”مجھے سائٹ ایریا میں واقع ان کی ایک فارما سیوٹیکل کمپنی کے اکاؤنٹنٹ ڈیپارٹمنٹ کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ کل سے جوائننگ ہے۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس سے پوچھ لیا۔

”آپ سے انہوں نے کیا کہا ہے؟“

”وہ بعد میں فون کر کے بتا دیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے تو یوں لگا ہے جیسے انہوں نے ٹال دیا ہے۔“

”دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ہے خوش ولی!“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرے انداز میں کہا پھر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”آؤ اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔“ بات کے اختتام پر میں نے ایک ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم مذکورہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے چائے سے شغل کر رہے تھے۔ خوش ولی سے آج میری پہلی ملاقات تھی اور پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے اپنا اپنا سا لگا تھا۔ بعض لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھتے ہی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہم انہیں سال ہا سال سے جانتے ہیں۔ خوش ولی کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا تھا۔

ابتدائی گفتگو میں مجھے اس کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق خوش ولی کا تعلق وادی ہنزہ سے تھا اور وہ پچھلے کئی سال سے اپنی فیملی کے ساتھ کراچی کے علاقے میٹروویل میں رہائش پزیر تھا۔ جہاں گلگت' چترال اور وادی ہنزہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی اکثریت آباد تھی۔ خوش ولی نے مجھے انٹرویو کے حوالے سے جو کچھ بتایا اس سے تو یہی سمجھ میں آتا تھا کہ اسے دوبارہ کال نہیں کیا جائے گا۔ بہر حال میں نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"مایوسی گناہ ہے خوش ولی!" میرے انداز میں اپنائیت کے ساتھ ہی بے تکلفی کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ "اگر یہاں بات نہیں بھی بنتی تو یہ جابز کی دنیا کا اینڈ نہیں ہے۔"

"شاید میں اس لیے زیادہ جذباتی اور اداس ہو رہا ہوں کہ یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"یہ پہلا تجربہ ہے مگر آخری نہیں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم اپنی سی وی کی ایک کاپی مجھے بھی دے دو۔ میں بھی تمہارے لیے کوشش کروں گا۔ ان شاء اللہ کہیں نہ کہیں بات بن ہی جائے گی۔"

"اسد یار! یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور تم میرے لیے کسی دیرینہ خیر خواہ کی طرح سوچ رہے ہو۔"

"میں بھی تمہاری ذات کے حوالے سے کچھ اسی قسم کے جذبات محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے صدق دل سے کہا۔ "لگتا ہے جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔"

"بالکل! میرا بھی یہی حال ہے اسد!" وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں ہمارے بیچ ایک مضبوط دوستی کا آغاز ہو رہا ہے۔"

"اور میں سمجھتا ہوں ہمارے درمیان دوستی اسی لمحے قائم ہو گئی تھی جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو ویٹنگ روم میں دیکھا تھا۔" میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے جوش بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں کے چہرے خوشی اور اطمینان کے ملے جلے تاثرات سے چمکنے لگے۔ یہ تاثرات صد فی صد خالص تھے۔

آئندہ دس پندرہ منٹ کے اندر ہمارے درمیان ڈھیروں باتوں کے علاوہ سیل نمبرز کا بھی تبادلہ ہوا۔ یہی طے پایا تھا کہ موبائل فون کے ذریعے آپس میں رابطے میں رہیں گے۔ خوش ولی نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بھی پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا تھا۔ میٹروویل بھی سائٹ کے علاقے ہی میں واقع ہے' خوش ولی نے اس فارماسیوٹیکل کمپنی کا نام سن رکھا تھا۔ جہاں کل سے میری جوائننگ تھی یہ ہم دونوں کے لیے اور بھی اچھا تھا۔

جلد ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو اپنے بارے میں مختصراً بتادوں تا کہ آپ میرے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔ آپ کو میری معیت میں ایک طویل عرصہ گزارنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس رنگین اور سنگین رفاقت کے دوران آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار ہو۔ مجھ سے تعارف آپ کا حق ہے اور میں اپنوں کی حق تلفی کے بارے میں غلطی سے بھی نہیں

سوچ سکتا۔

⁂

میرا تعلق اس معاشرے کے متوسط طبقے سے ہے۔ میں جب پیدا ہوا تو میرا نام اسد اللہ رکھا گیا۔ میں اپنے والدین کی پہلوٹھی کی اولاد ہوں۔ میری پیدائش کے چھے سال بعد میری چھوٹی بہن شازیہ نے اس دنیا میں آنکھ کھولی۔ میری والدہ خدیجہ بیگم ایک معروف غیر ملکی فارماسیوٹیکل کمپنی کی لیبارٹری میں کام کرتی تھیں۔ مذکورہ کمپنی ضدی قسم کے انفیکشن کے لیے اینٹی بائیوٹک میڈیسنز بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ میرے والد صغیر احمد ایک وکیل تھے مگر ان کے پاس برائے نام ہی کیسز ہوا کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی آمدنی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ تاہم والدہ صاحبہ کی تنخواہ اچھی خاصی تھی چنانچہ کسی نوعیت کے معاشی مسئلے کا سامنا نہیں تھا۔ زندگی بڑے خوش گوار انداز میں گزر رہی تھی۔ ہماری رہائش ناظم آباد کے علاقے پاپوش نگر میں تھی۔ گھر چھوٹا سا تھا مگر اطمینان بخش بات یہ تھی کہ وہ اپنا تھا۔ دو بیڈ اور ایک ڈائننگ کے اس مکان میں ہم چار افراد ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ وہ دن میری زندگی کے مثالی اور یادگار دن تھے۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ ہماری زندگی میں پہلا دکھ اس وقت داخل ہوا جب والد صاحب نے دوسری شادی کرلی۔ یہ سانحہ ہمارے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس وقت میں صرف دس سال کا تھا اور شازیہ محض چار سال کی۔ یہ صدمہ سب سے زیادہ تو امی کے لیے تھا کیونکہ ان کے احساسات و جذبات کو دو طرفہ کچل کر رکھ دیا گیا تھا۔ ابو نے جس عورت سے شادی کی تھی وہ امی کی بہت ہی گہری دوست تھی۔ اس عورت کا نام سلمٰی تھا۔ سلمٰی بھی لیبارٹری میں امی کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ لوگ امی اور سلمٰی کی دوستی کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، گوری چٹی، خوب صورت اور پرکشش عورت تھی اور بیوہ بھی۔

سلمٰی کی شادی کو کوئی ایک سال رہی ہوگی۔ پھر اچانک اس کے شوہر فرید خان کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد سلمٰی نے فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب کرلی تھی۔ پچھلے چار سال سے وہ امی کے ساتھ لیبارٹری میں تھی۔ ابو کا وہاں جانا ہوتا تھا اور اسی دوران میں سلمٰی اور ابو میں کوئی چکر چلا تھا۔ امی تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کی عزیز ترین دوست اس قسم کی حرکت کرے گی اور نہ ہی انہیں ابو کی جانب سے اس نوعیت کی گری ہوئی حرکت کی امید تھی۔ بہر حال امید اور نا امیدی سے کچھ نہیں ہوتا۔ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ جسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

شادی کے بعد سلمٰی نے لیبارٹری کی جاب کو خیر باد کہہ دیا تھا اور ابو کے ساتھ گلشن اقبال میں رہنے لگی تھی۔ ابو نے ابتدا میں اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ دونوں گھروں کو ذمے داری سے چلائیں گے لیکن امی اس موقع پر ہٹلر بن گئی تھیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ڈرامے بازی کی کوئی ضرورت نہیں۔" امی نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ "میں زندگی بھر تم دونوں کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔ میرے لیے تم دونوں مر چکے ہو!"

دونوں سے امی کی مراد ابو اور سلمٰی تھی۔ ابو نے کمزور سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں مجھ سے اور سلمٰی سے چاہے کتنی بھی نفرت ہو لیکن اسد اور شازیہ میری اولاد ہیں۔ میں ان سے ملنے یہاں آسکتا ہوں۔ ان کی کفالت کی......!"

"اس مہربانی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔" امی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "جس باپ کو اپنی اولاد کی ذمے داریوں کا احساس ہوتا ہے وہ اس قسم کی گھٹیا حرکتیں نہیں کرتے پھرتے۔ ہم نے آپ کی خدمت اور عزت میں کون سی کسر چھوڑی تھی۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ قابل معافی نہیں۔" امی لمحے بھر کے لیے رکیں پھر چٹانی لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ان بچوں کو پیدا کیا ہے تو ان کی پرورش کرنا بھی جانتی ہوں۔ میں کوئی لولی لنگڑی اور بے یارو مددگار نہیں ہوں۔ میں اتنا کما لیتی ہوں کہ یہ دونوں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ اللہ کا شکر کہ یہ گھر بھی میری ذاتی ملکیت ہے۔ آپ کو ان بچوں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں ماں اور باپ دونوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔"

اس وقت میری عمر دس سال تھی۔ شازیہ کو اس معاملے کی نزاکت کا ادراک چاہے ہو یا نہ ہو مگر میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا بہت برا ہو رہا تھا۔ امی کے اٹل اور دوٹوک انداز کے جواب میں ابو نے بس اتنا کہا۔

"ٹھیک ہے خدیجہ...... جیسی تمہاری مرضی!"

امی نے ان کے گھر سے نکلتے ہی دھاڑ سے دروازہ بند کردیا اور ہم دونوں بھائی بہن کو خود سے لپٹا کر رونے لگیں۔ امی کا رونا نہ تو دھواں دھار تھا اور نہ ہی اسے دھاڑیں مار کر رونا کہا جاسکتا تھا۔ یہ رونا بڑے طریقے اور سلیقے کا تھا۔ وہ اپنے سبک رفتار آنسوؤں سے ہمارے چہروں پر دکھ اور افسوس کے نادر نمونے پینٹ کر رہی تھیں۔ ان کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی دھمک مجھے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنے وجود پر محسوس ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ ہمیں اپنے بازوؤں کی نرم اور گرم گرفت میں بھینچ کر اپنے اندر اتارنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ میں نے امی کے رونے میں اتنی وارفتگی اور بے ساختگی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان کے دل و دماغ اور روح پر ان لمحات میں کیا گزر رہی تھی میں محض اس کے بارے میں اندازہ ہی قائم کرسکتا تھا۔ ان کے دکھ کو انہی کے لیول پر محسوس کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ جس پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے۔

میں نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک امی کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا جو میری بصارت کے لیے ایک انوکھا مشاہدہ تھا اور دل چسپ بات یہ کہ میں نے اس روز کے بعد بھی کبھی زندگی میں امی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ شاید انہوں نے زندگی بھر کے آنسو ایک ساتھ بہا ڈالے تھے۔ یہ آنسو بھی کتنے بے زبان، برداشت کا امتحان ہوتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا خونِ جگر کس کے لیے آنکھوں سے بہہ گیا۔

طوفان جب تھما تو امی ہم دونوں کو لے کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے باری باری ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا پھر ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے دلار سے سوال کیا۔

"میں تمہاری کیا لگتی ہوں؟"

ہم نے یہ یک زبان ہو کر حقیقت کا اظہار کردیا۔

"امی......!"

"صرف امی نہیں......!" انہوں نے یکے بعد دیگرے ہمارے چہروں پر موجود تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔ "میں اب تک تم لوگوں کی صرف امی تھی لیکن اب سے میں امی کے ساتھ ساتھ تمہارا ابو بھی ہوں۔ تمہارا ابو صغیر احمد تمہیں چھوڑ کر جاچکا ہے لیکن تم دونوں سے میرا یہ وعدہ ہے کہ میں تمہیں کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔"

شازیہ معصومیت بھری آنکھوں سے ٹکر ٹکر امی کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے اور میں جو بڑی حد تک اس صورتِ حالات کو سمجھ رہا تھا میں بھی جیسے امی کے سامنے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک ہمیں مختلف انداز کی نصیحتیں کرتی اور ہدایات دیتی رہی تھیں اور اس ''کلاس'' کے اختتام پر وہ ہمیں باہر گھمانے بھی لے گئی تھیں۔ ہم نے اس روز رات کا کھانا بھی باہر ہی کھایا تھا اور رات گئے واپس لوٹے تھے۔

اس دن کے بعد سے میں نے کبھی امی کی آنکھ میں آنسو اور زبان پر ابو کا نام دیکھا نہ سنا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابو کبھی ان کی زندگی میں آئے ہی نہ ہوں۔ ابو نے بھی اس دن کے بعد کبھی پلٹ کر ہماری خبر لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی آمد و شد جاری رہتی تو شاید صورت حالات مختلف ہوتی۔ لگتا تھا سلمٰی کو پانے کے بعد انہوں نے ہمیں فراموش کردیا تھا۔ ہم دونوں بھائی بہن ویسے بھی ابو کی نسبت امی سے زیادہ اٹیچ تھے۔ اس واقعے کے بعد ہم پر امی کی توجہ پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں کچھ ہی عرصے کے بعد ہم بھی ابو کو بھول گئے۔

امی ہمارے کھانے پینے، اوڑھنے پہننے اور خاص طور پر تعلیم کا بہت زیادہ خیال رکھے ہوئے تھیں۔ ناشتے میں سلائس، انڈا، مکھن سب کچھ موجود ہوتا۔ اسکول کے لیے لنچ بکس بھی پوری طرح بھرا نظر آتا تھا۔ یہ نہیں کہ چائے پاپا کھلایا اور چیز کے پیسے پکڑا کر گھر سے نکال دیا۔ وہ ہمیں اسکول پہنچانے کے بعد اپنی جاب پر جاتی تھیں۔ اسکول سے واپسی پر ہماری دیکھ بھال کا بھی انہوں نے مناسب بندوبست کر رکھا تھا۔ الغرض میری اور شازیہ کی زندگی میں کسی شے کی کمی نہیں تھی۔ امی کی محبت نے ابو کی یاد کو دھندلا دیا تھا۔

امی ہمیں زندگی کی ہر نعمت اور سہولت مہیا کرنے کے لیے جان توڑ محنت میں مصروف تھیں۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا کہ امی کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ پھر پتا چلا انہیں دمے کا مرض ہوگیا ہے۔ کچھ عرصہ دمے کی تکلیف کا ساتھ رہا پھر اچانک خون کی الٹی ہونے لگی ان کے مختلف نوعیت کے نصف درجن ٹیسٹ ہوئے جس کے نتیجے میں اندوہ ناک خبر سننے کو ملی کہ امی کو ٹی بی ہوگئی ہے اور وہ بھی خاصے خطرناک اسٹیج پر ہے۔ ان کا ایک پھیپھڑا بری طرح متاثر ہوچکا تھا۔ دمے کی ابتدا سے لے کر ٹی بی کی تشخیص تک چار سال کا طویل عرصہ حائل تھا۔ اس دوران ان کی فارماسیوٹیکل کمپنی کی جاب بھی چلتی رہی لیکن ٹی بی کی تشویش ناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے انہیں کمپنی سے فارغ کردیا گیا تا کہ وہ آرام و سکون سے علاج کرا سکیں۔

فارغ کرتے وقت فارماسیوٹیکل کمپنی نے امی کے تمام فنڈز بھی انہیں دے دیے تھے اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ جب وہ پوری طرح تندرست ہوجائیں گی اور ان کی خواہش بھی ہوگی تو انہیں دوبارہ اسی جاب پر رکھ لیا جائے گا۔ مگر میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک رسمی سی پیش کش تھی۔ جس پر بھروسا کرکے بیٹھ جانا سراسر حماقت ہوتی۔ امی نے تمام عمر محنت کرکے ہمیں یہاں تک پہنچایا تھا۔ اب میری باری تھی کہ اس گھر کی معاشیات کی ذمے داری اٹھاؤں۔ اس وقت تک میں انٹر سائنس کرچکا تھا۔ امی کی خواہش تھی کہ مجھے ڈاکٹر بنائیں مگر میں پڑھائی میں بہت زیادہ تیز نہیں تھا پھر امی کی بیماری کے باعث میں اسٹڈی پر زیادہ توجہ بھی نہیں دے سکا تھا لہٰذا انٹر کے امتحانات میں، میں اتنے نمبرز حاصل نہ کرسکا جو میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے ضروری تھے۔ میں نے پرائیویٹ بی اے کرنے

کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی حقیقت پسندی کا مظاہر کرتے ہوئے نوکری کی تلاش شروع کردی۔

ان دو سالوں میں، میں مختلف دفاتر میں لگ بھگ دس جابز ٹرائی کرچکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گھر میں ٹیوشن وغیرہ بھی پڑھا دیا کرتا تھا۔ جاب تو میرے لیے آنی جانی چیز تھی۔ مگر ٹیوشن کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ میں اکا دکا اسٹوڈنٹس ہی کو پڑھاتا تھا اور وہ بھی بغیر فیس کے مجھے تعلیم کا معاوضہ لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔

امی کا علاج باقاعدگی کے ساتھ جاری تھا۔ دمہ تو دم کے ساتھ ہی رہتا ہے جب تک انسان زندہ رہتا ہے یہ مرض بھی دوستی نبھاتا ہے۔ ٹی بی کا علاج مکمل ہوچکا تھا تاہم امی اب ڈیڑھ پھیپھڑے کے ساتھ زندہ تھیں۔ ایک پھیپھڑے کا جو حصہ متاثر ہوگیا تھا وہ ٹھیک نہیں ہوسکا تھا۔ متاثرہ حصے کے سکڑنے سے پھیپھڑے کا سائز آدھا رہ گیا تھا۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی امی کی طبیعت بگڑ جاتی تھی اور سال میں ایک آدھ بار انہیں اسپتال میں چند روز کے لیے داخل بھی کرانا پڑتا تھا جہاں خصوصی ٹریٹمنٹ دی جاتی تھی۔ انہیلر اور دوسری ادویہ تو سال کے بارہ مہینے چلتی رہتی تھیں۔

میں یہ سمجھتا تھا کہ امی کی بیماری میں سب سے بڑا ہاتھ ابو کی بے وفائی اور سلمٰی کی دوست نما دشمنی کا تھا۔ ٹی بی کا مرض اسی صدمے کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آیا تھا جو ہوا تھا وہ ہوچکا تھا اور ہوئے کو کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ میں اور شازیہ اب بڑے ہوچکے تھے۔ ہمارا فرض تھا کہ امی کا بھرپور خیال رکھیں اور ہم اپنا فرض بہت اچھے طریقے سے نبھا رہے تھے۔ شازیہ میٹرک کرچکی تھی اور گھر میں دو بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی اور میں گھر سے باہر معاش کے میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اللہ نے عزت دے رکھی تھی اور اچھا گزارہ ہورہا تھا۔ اگر انسان اپنی خواہشات کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع نہ دے تو کم آمدنی میں بھی تنگی ترشی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم بھی اسی حکمتِ عملی کو اپنائے ہوئے تھے۔ میرے ابو کو ہم سے بچھڑے کم و بیش بارہ سال بیت گئے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے ایک بار بھی پلٹ کر ہماری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں تھے اور جہاں تک میرا اور شازیہ کا تعلق تھا ہم نے کبھی ابو کو ڈھونڈنے یا ان سے ملنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ ہم بخوبی جانتے تھے کہ ہمارا ایسا کوئی بھی عمل امی کے زخموں کو ہرا کردے گا۔

ہم کسی بھی قیمت پر امی کو دکھی کرنے کا تصور نہیں کرسکتے تھے۔

❁......❁

اس روز جب میں گھر پہنچا تو میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ وہ عصر اور شام کے بیچ کا وقت تھا۔ شازیہ کی مجھ پر نگاہ پڑی تو زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑے وثوق سے بولی۔

''بھائی جان! لگتا ہے آپ کو نوکری مل گئی ہے۔''

''تمہیں بالکل ٹھیک لگا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کل صبح سے جاؤں گا۔''

''ارے بھئی، یہ بھائی بہن میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟'' کمرے کے اندر سے امی کی آواز ابھری۔

میں شازیہ کو ساتھ لے کر امی کے پاس پہنچ گیا اور انہیں اپنی آج کی کامیابی کی تفصیل سنا ڈالی۔ ان کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ انہوں نے شازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ نہیں رہی ہو، بھائی صبح کا نکلا اب واپس آیا ہے۔ اس کے لیے کھانے پینے کا کوئی بندوبست

کرو۔"

"بھائی جان بندوبست تو خود ہی کرلائے ہیں۔" شازیہ مٹھائی کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔"میں چائے بنالیتی ہوں۔"

"چائے بھی پیے گا۔" امی نے ممتا بھرے انداز میں کہا۔"پہلے کھانے کا انتظام کرو۔ مٹھائی تو سویٹ ڈش ہے کھانے کے بعد ہی کھائی جائے گی۔"

"امی! کھانا میں نے دن میں کھالیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"ابھی صرف چائے کی طلب ہورہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" امی نے روئے سخن شازیہ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"جاؤ چائے بنالا۔"

شازیہ کے وہاں سے ہٹنے کے بعد امی میری جانب متوجہ ہوگئیں۔"اسد! تم بتا رہے ہو کسی فارما سیوٹیکل کمپنی میں جاب ملی ہے مگر تم نے اس کمپنی کا نام نہیں بتایا ابھی تک۔"

میں نے مذکورہ کمپنی کا نام دہرانے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔"نام میں نے شروع میں ہی بتا دیا تھا شاید آپ نے غور نہیں کیا۔"

"اچھا اچھا.....!" وہ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔"بس اب تو یادداشت بھی ایسی ہوگئی ہے۔"

دن کا زیادہ تر حصہ امی بیڈ پر لیٹ کر گزارتی تھیں۔ گھر سے باہر جانا تو بالکل موقوف ہو کر رہ گیا تھا۔ اندر بھی نہایت کام کے تحت بیڈ سے اتر کر ادھر اُدھر حرکت کرتی تھیں یا پھر جب کوئی مزاج پرسی کو آجاتا تو وہ بیڈ پر ہی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی تھیں جیسا کہ اس وقت بیٹھ کر مجھ سے گفتگو کررہی تھیں۔

"امی! دعا کریں کہ یہ جاب چلتی رہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔"میں بار بار کے تجربات سے بےزار ہوگیا ہوں۔"

"اللہ پاک نے چاہا تو نوکری کہیں نہیں جائے گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔"یہ خاصی معروف فارماسیوٹیکل کمپنی ہے۔ یہ بتاؤ تم وہاں کام کیا کرو گے؟"

"فی الحال تو مجھے اکاؤنٹنٹ کے شعبے میں لگایا جا رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"تنخواہ کتنی دے رہے ہیں؟" امی نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"آٹھ ہزار روپے۔" میں نے بتایا۔"یہ ابتدائی تنخواہ ہے۔ جس شخص نے میرا انٹرویو کیا ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ تین ماہ کے بعد میری کارکردگی دیکھتے ہوئے اس تنخواہ میں بیس سے تیس فی صد تک اضافہ کردیا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" امی نے ایک گہری سانس خارج کی۔"لیکن میری ایک بات ذہن میں نقش کرلو اسد!"

"جی امی جی!" میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"انسان کی کارکردگی اس کے کام سے پہلے ہی شروع ہوجاتی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پراسرار انداز میں خاموش ہوگئیں۔

میں بولے بنا نہ رہ سکا۔"امی! میں سمجھا نہیں؟"

"میں سمجھاتی ہوں۔" وہ پرسوچ لہجے میں بولیں۔"انسان کام تو بعد میں شروع کرتا ہے پہلے اس کام کی نیت باندھتا ہے۔ اگر انسان کی نیت میں کھوٹ ہو تو وہ بھی معیاری اور کھرا کام کر ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں فرمایا ہے کہ عملوں (اعمال) کا دارومدار نیتوں پر ہے۔" وہ لمحے بھر کو رک کر سانس ہم وار کرنے لگیں پھر اپنی بات مکمل

کرتے ہوئے بولیں۔

"نیک نیت سے صالح عمل وجود پاتا ہے۔ تمہیں کمپنی کے جس شعبے میں لگایا جارہا ہے۔ وہ تو نیت کی امتحان گاہ ہے۔ کبھی ایک پائی اِدھر سے اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا امی۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔"آپ کو اپنی تربیت پر بھروسا ہونا چاہیے۔"

"مجھے اپنی تربیت پر بھروسا ہے مگر تجدید عہد وفا بھی ضروری سمجھتی ہوں۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولیں۔"اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ یہ کائنات کی ایک ٹھوس حقیقت ہے مگر ہر نماز میں اس آفاقی حقیقت کی تجدید کی جاتی ہے۔ میں نے تم دونوں کی تربیت کی ہے اور مجھے اس تربیت پر فخر بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم لوگوں کا کوئی عمل زندگی میں مجھے اور مرنے کے بعد میری روح کو شرمندہ کرے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا امی۔" میں نے بڑے وثوق سے کہا۔"آپ ان خدشات کو ذہن سے نکال دیں۔"

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا!" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔"اندیشے اور خدشات اچھی چیز نہیں ہیں۔ یہ شک اور غلط فہمی کو جنم دیتے ہیں۔ انہیں ذہن میں پنپنے نہیں دینا چاہیے۔ مگر انہیں کھرچ کر باہر پھینکنے سے پہلے چیک ضرور کرلینا چاہیے کیونکہ بعض خدشات کو حقیقت کا روپ دھارنے میں دیر نہیں لگتی۔ جس طرح روشنی میں سے تاریکی اور تاریکی میں سے روشنی جنم لیتی ہے بالکل ویسے ہی خدشات اور حقائق کے بیچ بھی بال برابر موٹائی کی ایک دیوار ہے۔ کسی وقت کچھ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس لیے آنکھیں اور کان ہر وقت کھلے رکھنا چاہئیں!"

امی بعض اوقات بڑی گہری گہری باتیں کرجاتی تھیں جنہیں سمجھنا ہما شما کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے امی کے ساتھ رہتے ہوئے زندگی گزر گئی تھی اس لیے ان کی فریکوئنسی کو کیچ کرکے اپنے ذہن کو ان کی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں مجھے کبھی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ البتہ شازیہ امی کی باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتی تھی۔

اسی وقت شازیہ چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں دو پیالی چائے اور ایک مٹھائی والی پلیٹ کو دیکھ کر امی چونک اٹھیں۔ انہوں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"شازیہ! کیا تم چائے نہیں پیو گی؟"

"پیوں گی امی۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"پھر ٹرے میں چائے کی دو پیالیاں کیوں ہیں؟" امی نے ٹرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"میں کچن میں پیوں گی۔" شازیہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"وہاں اکیلی بیٹھ کر کیوں پیو گی؟" امی کی حیرت دوچند ہوگئی۔

"اکیلی نہیں امی۔" شازیہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔"بھائی جان کی شاگردن آئی ہوئی ہے۔"

"اوہ تو فرحانہ ہے تمہارے ساتھ!" امی نے متاسفانہ انداز میں کہا۔"ٹھیک ہے پھر تو تم جاؤ اپنی دوست کے پاس۔"

شازیہ نے ایک ذومعنی نظر مجھ پر ڈالی پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں امی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

فرحانہ ہماری پڑوسن تھی یعنی پڑوسیوں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ میرے پاس فزکس اور کیمسٹری پڑھنے آتی

تھی۔ شازی شرارت سے فرحانہ کو میری شاگردن کہا کرتی تھی۔ شازیہ اور فرحانہ میں بڑی گہری دوستی بھی تھی۔ یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ فرحانہ مجھے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس نگاہ میں ایک استاد کے روایتی احترام کی جھلک نہیں بلکہ پسندیدگی کا یہ انداز ایک خاص زاویے سے تھا۔ میں اس کے دلی جذبات اور احساسات کو سمجھتا تھا مگر کبھی بھی اپنی کسی بات یا عمل سے فرحانہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ فرحانہ چونکہ شازیہ کی راز دار دوست تھی اس لیے ممکن ہے۔ فرحانہ نے شازیہ سے کچھ شیئر کر رکھا ہو۔ شازیہ اشاروں کنایوں میں مجھے چھیڑتی رہتی تھی لیکن اس نے کبھی کھل کر کوئی بات نہیں کی تھی اس لیے میں کنفرم نہیں تھا۔ بہرحال فرحانہ پستہ قامت کی ایک دل کش اور حسین لڑکی تھی جسے دیکھ کر کسی کا بھی دل دھڑک سکتا تھا مگر میں نے ہمیشہ اسے ایک اسٹوڈنٹ کی نظر سے دیکھا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں، میں نے امی کو ولی کے بارے میں بھی بتایا پھر کچرا چننے والے اس بچے کا ذکر بھی نکل آیا جس پر ظلم ہوتا دیکھ کر میں نے ظالم کے ہاتھ توڑنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نتیجے میں غصیلے بابو کی ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے، اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرو۔" پوری بات سننے کے بعد امی نے میٹھے انداز میں سرزنش کی۔ "اس مار پیٹ کی آخر کیا ضرورت تھی......!"

"وہ کم بخت جو اس بے چارے بچے کو وحشیانہ انداز میں زدوکوب کر رہا تھا......!" میں نے تلخی سے کہا۔ "کیا وہ درست تھا؟ کیا میں آنکھیں بند کر کے گزر جاتا؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا اسد!" وہ سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

"تم ظالم کا ہاتھ ضرور روکتے مگر اسے لہولہان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"بس امی ایسے مناظر دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں بزدلوں کی طرح کھڑا تماشا نہیں دیکھ سکتا۔"

"غصے کی حالت میں خود پر قابو رکھتے ہوئے رد عمل ظاہر کرنا اصل بہادری ہے بیٹا!" امی نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ "بزدل افراد غصے میں اپنے حواس کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ غصہ ایک ایسی آگ ہے جو انسان کی خفیہ توانائی کو کھا جاتی ہے۔ وہ توانائی جو عقل و دانش کا ایندھن ہے۔"

"امی! ایک بات تو بتائیں۔" میں نے امی کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "لوگ ظلم کیوں کرتے ہیں۔"

"تا کہ کائنات کا نظام چلتا رہے۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"اور ظالم کا ہاتھ روکنے کا کیوں حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بدستور گہری سنجیدگی سے بولیں۔ "تا کہ کائنات کے نظام میں توازن قائم رہے۔"

"امی! یہ کیا بات ہوئی۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"انسان کی زندگی نیکی اور بدی سے عبارت ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ "یہ اعمال ظالم اور مظلوم کے توسط سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دونوں قوتوں میں اگر توازن قائم نہیں رہے گا تو کائنات کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ دنیا انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ فرشتوں کے لیے نہیں اور انسان ظالم بھی ہوسکتا ہے اور ظالم کا ہاتھ

توڑنے والا بھی......!"

اس روز امی سے میری خاصی تفصیلی بات ہوئی جس نے میری عقل و شعور کے کئی بند در کھول دیے۔ رات کے کھانے کے بعد امی نے کہا۔

"اسد! آج تمہیں دیر تک نہیں جاگنا۔ صبح تمہاری نئی نوکری کا آغاز ہو رہا ہے۔ اگر رات کو نیند پوری نہ ہوئی تو کل آفس میں تمہاری کارکردگی متاثر ہوگی لہٰذا آج تمہیں جلدی سو جانا چاہیے۔" میں اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ دو بیڈ روم، ایک ڈائننگ روم۔ ایک بیڈ روم پر امی اور دوسرے پر شازیہ کا قبضہ تھا۔ میں نے ڈائننگ روم میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور رات کو سوتا بھی وہیں پر تھا۔ شازیہ کے پاس جو بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے وہ بھی انہیں اسی ڈرائنگ روم میں ڈیل کرتی تھی اور میں بھی اپنے ایک آدھ اسٹوڈنٹ کو ادھر ہی پڑھایا کرتا تھا۔ آج کل صرف فرحانہ مجھ سے پڑھنے آیا کرتی تھی۔ وہ انٹر سائنس کی اسٹوڈنٹ تھی اور فزکس یا کیمسٹری میں اسے جس نوعیت کی مدد کی ضرورت ہوتی وہ میں کر دیا کرتا تھا۔

میں اپنے زمانہ طالب علمی میں کوئی بہت اچھا اسٹوڈنٹ نہیں رہا تھا مگر وہ کہتے ہیں نا کہ انسان گاتے گاتے گویا بن جاتا ہے، سو میں بھی پڑھاتے پڑھاتے ٹیوٹر بن ہی گیا تھا۔

ایک چیز ہوتی ہے ضرورت اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے بھی اسی نظریے کی روشنی میں پڑھانا سیکھ لیا تھا۔ میرے پاس باقاعدہ کوئی جاب نہیں تھی۔ ٹیوشن کا سلسلہ اسی خیال سے شروع کیا تھا کہ اس سے اضافی آمدنی ہوگی مگر یہ خیال حقیقت میں خام ہی ثابت ہوا تھا اور اس میں بھی سراسر میں خود ہی کو قصوروار ٹھہراؤں گا۔ آمدنی کی نیت سے جو کام شروع کیا تھا اسے پیشہ ورانہ انداز میں آگے نہ بڑھا سکا۔ پتا نہیں، یہ میرے اندر کی کوئی خرابی تھی یا خوبی کہ میرا ذہن ٹیوشن فیس وصول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم کو بیچنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ بہرحال آپ اسے میرا پاگل پن کہیں یا کچھ اور میں اندر باہر سے پوری طرح مطمئن تھا کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ ٹھیک ہے گویا میرا ضمیر سکون میں تھا۔

میں سونے کے لیے لیٹا تو شازیہ نے آ کر بتایا۔

"آپ کی شاگردن آئی ہے۔"

یہ اطلاع دیتے ہوئے شازیہ کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ موجود تھی۔ بعض اوقات مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ فرحانہ نے اپنے دلی معاملات کے بارے میں شازیہ کو کچھ نہ کچھ ضرور بتا رکھا ہوگا یہ ٹھیک ہے کہ شازیہ ایک چلبلی اور شریر لڑکی تھی۔ مختلف نوعیت کی شیطانیوں میں اس کا بہت دل لگتا تھا لیکن یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ میرے سامنے فرحانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں مسکرا اٹھتی تھی اور شازیہ کی یہی اسپیشل ادا مجھے شبہے میں مبتلا کر دیا کرتی تھی۔

سیکنڈ کے دس ویں حصے میں یہ تمام تر مشکوک خیالات میرے ذہن سے گزرے اور میں نے شازیہ کی بات کے جواب میں کہا۔

"اس وقت وہ کیا لینے آئی ہے؟"

"یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔" شازیہ نے کہا۔ "وہ شام میں بھی آئی تھی مگر اس وقت آپ امی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ اس نے کافی دیر انتظار کیا پھر واپس چلی گئی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاید...... وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔"

ایک مرتبہ پھر شازیہ کی آنکھوں میں مجھے وہی شوخی نظر آئی جو فرحانہ کے ذکر کے ساتھ نتھی تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے.....اسے میرے پاس بھیج دو۔"

وہ "جی بھائی جان۔" کہتے ہوئے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

میں سونے کے لیے باقاعدہ کوئی بستر وغیرہ نہیں بچھایا کرتا تھا۔ بس ایک کشن یا کوئی تکیہ سر کے نیچے رکھا اور کارپٹ پر دراز ہوگئے۔ مجھے فرش پر سونا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں سال ہا سال سے نیچے ہی سو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں اور فرحانہ روبرو دو صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سنجیدہ مگر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولی۔

"سر! شازیہ نے بتایا ہے آپ سونے جا رہے تھے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں شازیہ نے غلط نہیں کہا۔"

وہ دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"سر! اتنی جلدی ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔"

اس کی حیرت بجا تھی۔ کراچی جیسے جیتے جاگتے شہر میں آدھی رات سے پہلے سونے کا تصور عجیب ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی لگتا ہے۔ اگرچہ جلدی سونا اور جلدی اٹھنا صحت و تندرستی کے دو بنیادی اصول سمجھے جاتے ہیں۔ مگر انسان اپنے حالات اور ماحول کے تقاضوں کے سامنے مجبور ہوکر بعض اوقات زندگی کے سنہرے اصولوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ نہ صرف فراموش کر بیٹھتا ہے۔ بلکہ ان اصولوں پر کار بند لوگوں کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتا۔ ابھی یہی دیکھ لیں کہ اگر کوئی رات کو جلدی سونے کا عادی ہے تو اسے پینڈو سمجھا جاتا ہے۔

"کوئی بات نہیں، گیارہ بھی بج ہی جائیں گے۔" میں نے فرحانہ کے سوال کے جواب میں کہا۔ "آپ بتائیں، مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"سر! مجھے پتا ہے کہ آپ کی جاب کنفرم ہوگئی ہے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں جب شام میں آئی تھی تو شازیہ نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔"

"تو میری جاب کنفرم ہونے سے تمہیں دکھ پہنچا ہے۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں سر!"

"پھر کیسی بات ہے۔" میں نے بدستور اسے سوالیہ نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے اور ابھی تک آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"مجھے آپ کی جاب کا دکھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا میں شام میں وہ مٹھائی کھا کر نہ جاتی جو آپ کی نوکری لگنے کی خوشی میں شازیہ نے مجھے کھلائی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میں دراصل اپنی پڑھائی کی وجہ سے پریشان ہوں اور اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنے آئی تھی۔"

"تو کریں بات؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کو کس قسم کی پریشانی ہے۔"

"سر! پہلے تو میں دوپہر میں آپ کے پاس پڑھنے آجایا کرتی تھی۔" وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ "اب جاب کی وجہ سے مصروف ہوجائیں گے تو میرا کیا بنے گا۔ آگے امتحانات بھی نزدیک آرہے ہیں۔"

بات کرنے کے دوران میں فرحانہ بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھ بھی رہی تھی۔ میں نے رسان بھرے

انداز میں کہا۔ ”امتحانات نزدیک آرہے ہیں تو زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ سہ پہر نہ سہی تو شام میں پڑھنے کے لیے آجانا میں نے چوبیس گھنٹے کی نوکری تو نہیں کرلی۔“

وہ میری بات پر مناسب توجہ دیے بغیر اپنی ہی دھن میں مستفسر ہوئی۔ ”سر! آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟“

”کون سا کام؟“ میں نے متذبذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کوچنگ سینٹر کیوں نہیں کھول لیتے؟“ وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے گھر میں؟“

”گھر میں بھی کھول سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو کہیں اور بھی یہ کام کیا جاسکتا ہے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”آج کل اس بزنس میں بہت کمائی ہے۔ آپ کو کسی جاب کی ضرورت ہی نہیں رہے گی اور دن کا زیادہ تر وقت گھر میں بھی گزرے گا۔“

”آئیڈیا تو آپ کا اچھا ہے فرحانہ!“ میں نے اس کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ میں یہ بات اچھی طرح محسوس کر چکا تھا کہ فرحانہ کو میری جاب والی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے نزدیک دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے مزید کہا۔ ”لیکن آپ کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہے کہ میں علم کو فروخت کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں نے ٹیوشن کو اگر ذریعۂ آمدنی بنانا ہوتا تو میرے پاس درجنوں اسٹوڈنٹس ہوتے۔ آپ ہی بتائیں‘ میں آپ سے کتنی فیس لے رہا ہوں؟“

”ایک پیسا بھی نہیں۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”حالانکہ میں نے آپ سے کئی بار کہا بھی ہے کہ......!“

”میں اپنی سوچ کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”میں اپنے مزاج سے مجبور ہوں فرحانہ......!“

”کوئی کوچنگ سینٹر جوائن کرلیں۔“ اس نے ایک اور تجویز دی۔ ”وہ لوگ کوچنگ سینٹر میں پڑھانے والوں کو باقاعدہ ایک ہینڈسم سیلری دیتے ہیں۔ کسی فیکٹری کی نوکری سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہے۔“

”اب جو بھی ہے‘ یہ فارماسیوٹیکل کمپنی والی جاب تو چلے گی فرحانہ!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ جب بھی مجھے گھر میں دیکھیں پڑھنے کے لیے آسکتی ہیں۔ یہ آفر صرف آپ کے لیے ہے۔“

اس نے میرے آخری جملے کو اچک لیا۔ ”کیوں سر! مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے فرحانہ کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن ہوگئے تھے اور وہ جذب کے عالم میں یک ٹک مجھے دیکھے چلی جارہی تھی۔ اس کے تیور دیکھ کر میرے خدشات یقین میں اور یقین‘ عین الیقین کی جانب قدم بڑھانے لگا تھا۔ ان لمحات میں امی کے یہ الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے تھے۔ خدشات اور حقیقت کے بیچ بال برابر موٹائی کی ایک دیوار ہوتی ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا‘ کب خدشات حقیقت کا روپ دھارلیں۔

میں ایک استاد والے اپنے پُرتکلف رویے کو برقرار نہ رکھ سکا اور ایک خاص انداز کی کنجوس فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرحانہ کے شوخ سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

”آپ میری سب سے زیادہ ذہین اور اچھی اسٹوڈنٹ جو ہو۔“

”سر!“ وہ بڑی بہادری کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔ ”کیا واقعی میں آپ کو اچھی لگتی ہوں۔“

”اس میں کیا شک ہے!“ میں نے الفاظ کے دامن میں پناہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھی چیز‘ سب کو اچھی تو لگے گی نا!“

”میں سب کی نہیں سر......!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”صرف آپ کی بات کر رہی ہوں۔ میں آپ کی رائے کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔“

”میں کہہ رہا ہوں نا‘ آپ بہت اچھی ہو۔“ میں نے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر یقین نہ آرہا ہو تو میں لکھ کر دے دیتا ہوں۔“

میں نے آخری جملہ مذاق کے رنگ میں کہا تھا مگر وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”نہیں سر! لکھ کر دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کی بات پر بھروسا ہے......!“

وہ مزید دس منٹ تک میرے پاس بیٹھی پھر واپس چلی گئی۔

جب تک میرے اور فرحانہ کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا‘ شازیہ نے ڈرائنگ روم میں جھانکنے یا کسی بھی بہانے ادھر کا چکر لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دانستہ ہمیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے رہی ہو۔ ورنہ شازیہ جیسی بے چین روح سے ایسے صبر و استقامت کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے پیچھے فرحانہ کا وجود روشن ہوگیا پھر اس کی ایک ایک معنی خیز بات یاد آنے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے فرحانہ کو اس حوالے سے سنجیدگی کے ساتھ لیا تھا۔ آج اس کی پسندیدگی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس پسندیدگی سے ایک خاص نوعیت کی چاہت جھلکتی تھی جو وہ میرے لیے اپنے دل میں رکھتی تھی۔ میں نے آج سے پہلے اتنی گہرائی سے اس کے جذبات کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ سوچتے ہی کہ فرحانہ میری ذات میں سنجیدگی سے دلچسپی لے رہی تھی۔ میں پریشان ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

پریشانی اس بات کی نہیں تھی کہ فرحانہ مجھ سے محبت کرتی تھی بلکہ میری الجھن کا سبب یہ تھا کہ رد عمل میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ محبت کا جواب محبت سے دینا تو ایک اصول کی بات ہے لیکن میں نے اس زاویے سے کبھی سوچا نہیں تھا اور وہ بھی اپنی ایک اسٹوڈنٹ کے لیے......!

میں فرحانہ کے بارے سوچتا اور الجھتا رہا پھر اسی کش مکش میں‘ ذہنی گرفتاری کے دوران جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

❂......❂

اگلے روز سے میری نئی جاب شروع ہوگئی۔

میری رہائش پاپوش نگر‘ ناظم آباد میں تھی اور فارماسیوٹیکل کمپنی سائٹ ایریا میں آمد و رفت نہایت ہی آسان اور سیدھی سادی تھی۔ انٹرویو کے دوران عاطف رشید نے مجھے ابتدائی سیلری اور اوقات کار کے بارے میں بتادیا تھا۔ میری ڈیوٹی صبح دس سے شام چھے بجے تک تھی۔ پہلے روز میں ساڑھے نو بجے ہی کمپنی کے آفس پہنچ گیا۔ میری تقرری کی اطلاع گزشتہ روز ہی وہاں پہنچا دی گئی تھی لہٰذا مجھے پہلی فرصت میں اکاؤنٹنٹ صاحب کے حوالے کردیا گیا۔ ایک ہاتھ سے مفلوج انور صاحب نے بڑے سرسری انداز میں میرا استقبال کیا اور ان کی ہدایت کے مطابق‘ میں نے کام شروع کردیا۔

دو تین روز میں' میں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ مجھے کس انداز میں انور صاحب کی معاونت کرنا ہے۔ کام سمجھنے کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ انور صاحب مجھ سے خاصے کھنچے ہوئے تھے۔ پہلے میں نے اس بے زار کن رویے کو ان کی بیماری کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ان کے ساتھ جس نوعیت کا حادثہ ہوا تھا اس کے نتیجے میں انسان کا جھنجلانا اور چڑچڑا ہو جانا لازمی تھا۔ میں کام کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی ان کا خیال رکھنے لگا لیکن چند روز بعد ہی انور صاحب کے رویے کا پول کھل گیا۔

مجھے اِدھر اُدھر کی اڑتی اڑتی خبروں سے پتا چلا کہ انور صاحب اس پوسٹ کے لیے اپنے بھانجے نور علی کو بھرتی کروانا چاہتے تھے مگر کمپنی کے مالک خالد رشید صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی عاطف رشید کی مدد سے یہ کام کیا تھا۔ انور صاحب کھل کر خالد رشید کی مخالفت تو نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ان کا رویہ میرے ساتھ غیریت والا ہو گیا تھا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ انور صاحب مجھے پسند نہیں کرتے' میں ایک عجیب سی اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ایک روز چھٹی کے بعد میں اجازت لے کر اپنے باس کے کمرے میں گھس گیا۔

میری خوش قسمتی کہ خالد رشید صاحب اس وقت اپنے کمرے میں اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور سوالیہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولے۔

''جی......! آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

خالد صاحب اپنے چھوٹے بھائی عاطف کی بہ نسبت قدرے سخت بلکہ خشک مزاج تھے۔ یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''سر! مسئلہ میرے ساتھ نہیں ہے۔''

''پھر کس کے ساتھ ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''انور صاحب کے ساتھ!'' میں نے بے دھڑک کہہ دیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگے۔

ان کے استفسار کے جواب میں' میں نے پوری تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتا دیا اور اس بات کا اضافہ بھی کر دیا کہ مجھے پتا چلا ہے' انور صاحب اپنے بھانجے کو اس پوسٹ پر لانا چاہتے تھے اسی لیے وہ مجھ سے چڑے ہوئے ہیں۔ خالد رشید نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور آخر میں کہا۔

''اس کمپنی کا مالک کون ہے؟''

''ظاہر ہے سر مالک تو آپ ہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور آپ کس کے ملازم ہیں؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔

''آپ کا سر!''

''بس تو پھر انور صاحب کے رویے کو بھول جائیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولے۔ ''آپ کو جس مقصد کے لیے رکھا گیا ہے اپنی توجہ اسی پر مرکوز رکھیں۔ میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر انور صاحب سے بات کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر!'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

ہر ادارے کا اپنا ایک سیاسی نظام بھی ہوتا ہے جہاں مختلف لابیز کام کرتی رہتی ہیں اور ہر لابی کے اپنے جاسوس بھی ہوتے ہیں۔ جو دوسری لابیز میں گھس کر اپنے مطلب کی خبریں نکالتے رہتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے ابھی چند روز ہی گزرے تھے۔ میں ابھی تک کسی بھی لابی کے ساتھ وابستہ نہیں تھا۔ مگر

انور صاحب کو وہاں کام کرتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا لہٰذا ان کے کسی جاسوس نے یہ خبر ان تک پہنچا دی کہ میں نے ان کے حوالے سے باس سے ملاقات کی ہے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی چڑ گئے۔

اب یہ ہونے لگا کہ وہ مجھ سے اکاؤنٹ کے کم اور دوسرے کام زیادہ لینے لگے۔ کسی بھی ڈیپارٹمنٹ میں افرادی قوت کی کمی پیش آ جاتی تو وہاں مجھے بھیج دیا جاتا اور اس معاملے میں ڈیلیوری ڈیپارٹمنٹ سب سے آگے تھا۔ آئے روز ان کا کوئی آدمی اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچ جاتا اور اکاؤنٹنٹ صاحب سے کہتا۔

''انور صاحب! دو گھنٹے کے لیے آپ کا باڈی بلڈر چاہیے۔''

''لے جائیں۔'' انور صاحب بڑی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے پھر مجھ سے فرماتے۔ ''اسد صاحب! ان کے ساتھ جائیں دیکھیں ذرا کیا مسئلہ ہے۔''

مجھے آغازِ جوانی ہی سے ورزش اور صحت مندانہ ایکٹی ویٹیز کا شوق رہا تھا۔ میں نے تن سازی (باڈی بلڈنگ) کے علاوہ ایروبکس بھی کر رکھی تھیں اور سیلف ڈیفنس کی ٹیکنیکس سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ جب بھی موقع ملتا میں ایکسرسائز ضرور کرتا تھا۔ میری صحت اور جسمانی بناوٹ کے پیش نظر کمپنی میں' میں ''باڈی بلڈر'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور اکثر ڈیلیوری کے لوگ مجھے انور صاحب سے ''مانگ'' کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے کیونکہ ان کے پاس محنت اور مشقت والا کام ہوتا تھا اور میں اس نوعیت کے کاموں سے ذرا نہیں گھبراتا تھا۔

ڈیلیوری کا اسٹاف مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کے انڈر کام کرتا تھا۔ روزانہ پہلے ہاف میں ڈیلیوری والی وینز ادویات کے کارٹن لوڈ کر کے سپلائی کے لیے نکل جاتی تھیں۔ یہ گاڑیاں عرف عام میں ''ڈیلیوری وین' کہلاتی تھیں لیکن دراصل یہ چھوٹے ٹرک تھے جو کمپنی سے ادویات کو ڈسٹری بیوٹر تک پہنچاتے تھے۔ پھر ڈسٹری بیوٹر اپنے نیٹ ورک کی مدد سے ان میڈیسنز کو شہر کے مختلف اسپتالوں اور میڈیکل اسٹور تک سپلائی کرتا تھا۔ ہماری فارما سیوٹیکل کمپنی کا براہِ راست ڈسٹری بیوٹر سے واسطہ تھا۔ ڈسٹری بیوٹر مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ کو اپنا ڈیمانڈ آرڈر نوٹ کرا دیتا تھا۔ اس آرڈر کے مطابق ادویات کے کارٹن کبھی ایک اور کبھی دو ڈیلیوری وینز میں لوڈ کر کے ڈسٹری بیوٹر کے گودام تک پہنچا دیے جاتے تھے۔ ڈیلیوری والے مجھے کارٹن اٹھانے کے لیے انور صاحب سے ''مستعار'' لے جاتے تھے۔ انور صاحب کا یہ رویہ مجھے اچھا تو نہیں لگتا تھا مگر میں ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے بڑی صفائی کے ساتھ اکاؤنٹ سیکشن سے ڈیلیوری ڈیپارٹمنٹ میں مستقل طور پر منتقل کر دیا گیا اور انور صاحب جوڑ جگاڑ کر کے اپنے بھانجے نور علی کو اپنے پاس رکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے کسی سے کوئی شکایت نہیں کی اور دل جمعی سے اپنے کام میں لگ گیا۔ خالد رشید صاحب سے بات کر کے میں دیکھ چکا تھا۔ اگر انور صاحب نے بھانجے کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا تو یقیناً یہ بات خالد رشید صاحب کے علم میں بھی ہوگی۔

میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ کسی تبدیلی میں اگر انسان کی اپنی کوئی نالائقی اور بدانتظامی شامل نہ ہو تو وہ تبدیلی قدرت کی طرف سے انسان کی بہتری' اصلاح اور اس نظام کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی

ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔

مجھے اکاؤنٹ سیکشن سے ڈیلیوری ڈیپارٹمنٹ میں منتقل ہوئے ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ میری چھٹی حس نے کسی بڑی گڑبڑ کا احساس دلا دیا۔ میں یہ تو نہ جان سکا کہ گڑبڑ کی نوعیت کیا ہے مگر مجھے یہ یقین ہوگیا کہ کمپنی کی ڈیلیوری وینز جو ادویات لے کر جاتی ہیں ان کے حوالے سے معاملات درست نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوگیا کہ ان معاملات کی خرابی مارکیٹنگ اور اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ شاید اسی لیے انور صاحب اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں اپنے بھروسے کا بندہ لانا چاہتے تھے۔ مجھے کوشش کرکے انہوں نے ڈیلیوری کے شعبے میں بھیج دیا تھا اور اپنے بھانجے کو میری جگہ سیٹ کرلیا تھا۔

یہ محسوس کرلینے کے بعد کہ میں جس سیٹ اپ میں کام کررہا ہوں وہاں کچھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی جاری ہیں میں اندر سے بے چین ہوگیا۔ اس بے چینی اور بے قراری کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مجھے جس ''گڑبڑ'' کا احساس ہوا تھا اس کی حقیقت مجھ سے اوجھل تھی۔ میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہورہا ہے وہ کمپنی کے مفادات کے خلاف ہورہا ہے لیکن چونکہ میرے پاس اس خرابی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لیے میں اپنی بے بسی پر کڑھ کر رہ جاتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کس سمت میں قدم اٹھاؤں۔

میری چھٹی حس نے مجھے جس خطرناک کھیل کا احساس دلایا تھا اس کے بارے میں ٹھوس معلومات دو مقامات سے حاصل کی جاسکتی تھیں۔ نمبر ایک اکاؤنٹس، نمبر دو مارکیٹنگ۔ نمبر ایک سے تو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا گیا تھا اور نمبر دو میں مجھے گھسنے کی اجازت نہیں تھی اور میں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے خاموش تماشائی بنا بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں اس خوف ناک معمے کو حل کرنے کے لیے ایک تیسرا دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش کی اور وہ دروازہ تھا ڈیلیوری وین۔

ڈیلیوری وین کے ساتھ عموماً تین افراد جایا کرتے تھے۔ ایک ڈرائیور اور دو لوڈر۔ میں نے ڈیلیوری وین پر اپنی ڈیوٹی لگوانے کی کوشش کی لیکن اس سعی میں مجھے بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس ناکامی نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کمپنی سے نکلنے کے بعد ڈیلیوری وین کے ساتھ کوئی غیر معمولی کارروائی کی جاتی ہے۔ کیا کارروائی اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے تجسس کی تسلی کے لیے ڈیلیوری وین کا خفیہ تعاقب کرنے کے بارے میں بھی سوچا لیکن میں اپنی اس سوچ کو قابل عمل نہیں بنا سکتا تھا۔

ایک تو میرے پاس تعاقب کا مناسب بندوبست نہیں تھا۔ میں بس میں یا ویگن میں سفر کرنے والا شخص تھا۔ رکشا ٹیکسی میں تعاقب کرنے کے لیے مجھے کسی نہ کسی بہانے کمپنی سے باہر نکلنا پڑتا اور میری غیر حاضری کو فوراً محسوس کرلیا جاتا اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں تھا کہ جب تک میں کمپنی سے نکل کر رکشا ٹیکسی پکڑنے میں کامیاب ہوتا، اس وقت تک ڈیلیوری وین میرے انتظار میں سڑک پر کھڑی رہتی کہ اسد صاحب! آپ جب تک میرا تعاقب شروع نہیں کریں گے میں یہاں سے ایک انچ ہلنے والی نہیں ہوں۔

امید اور ناامیدی کے درمیان ایک سانس کا فاصلہ حائل ہوتا ہے۔ اگر انسان ناامید ہونے سے پہلے ایک گہری سانس لے لے تو عین ممکن ہے اس سانس کے بعد کامیابی اس کے قدموں پر جبین نیاز رگڑتی پائی جائے۔ میں بھی مایوسی کی حدوں کو چھونے

والا تھا کہ میرے ذہن میں خوش ولی کا نام چمکا اور یوں محسوس ہوا میرے ذہن کی بیٹری چارج ہوگئی ہو۔ خوش ولی کے پاس موٹر بائیک تھی۔ تعاقب والا کام وہ بہ آسانی کرسکتا تھا۔ کافی دنوں سے میری اس سے بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس روز کمپنی سے چھٹی کے بعد میں نے اسے فون کیا۔ دوسری رنگ پر اس نے میری کال اٹینڈ کرلی اگلے ہی لمحے اسپیکر میں اس کی مخصوص آواز ابھری۔

''یار اسد! کہاں غائب ہو، کافی دنوں سے کوئی خیر خبر ہی نہیں؟''

اس کا شکوہ بجا تھا۔ میں پچھلے کئی روز سے اسے فون نہیں کرسکا تھا۔ میں نے بھی جواباً شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں نے کافی دنوں سے اگر تمہاری خیر خبر نہیں لی تو تم تو جیسے روزانہ ہی مجھے فون کرتے ہو نا۔''

''بس یار، کیا بتاؤں۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک میری جاب کا کچھ نہیں ہوا۔ اسی پریشانی میں ہوں۔''

''ویری گڈ!'' بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

''کیا مطلب یار!'' وہ تیز آواز میں بولا۔ ''تم میری بے روزگاری پر ویری گڈ کہہ رہے ہو یا پریشانی پر؟''

''بے روزگاری پر۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی یار!'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''یہ کس قسم کا مذاق ہے؟''

''مذاق نہیں، میں سنجیدہ ہوں یار!''

''سنجیدہ، مطلب میں اگر ابھی تک جاب لیس ہوں تو یہ تمہارے لیے خوشی کی بات ہے؟'' وہ بدستور ناراضی سے بولا۔

''فی الحال ایسا ہی سمجھو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت میں نے جس اہم کام لیے فون کیا ہے وہ تم بے روزگاری کی حالت ہی میں کرسکتے ہو۔''

''کون سا اہم کام؟'' اس کے کان کھڑے ہوگئے۔

یہ میں نے محاورتاً کہا ہے ورنہ میں سیلولر رابطے پر اس کے کان دیکھ نہیں سکتا تھا میری بات سن کر وہ کھڑے ہوئے ہیں یا بیٹھے ہی رہے ہیں۔ خوش ولی کے استفسار کے جواب میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں، میں نے اسے صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کردیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''یار اسد! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ کیا کل بھی ڈیلیوری وین مال لے کر نکلے گی؟''

''ہاں، کل سپلائی پروگرام میں شامل ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے پوچھا۔ ''یہ بتا سکتے ہو کہ ڈیلیوری وین کتنے بجے کمپنی سے نکلتی ہے۔ تمہیں اس بات کا اندازہ تو ہوگا۔''

''عموماً ڈیلیوری وین گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم اگر دس بجے تک فیکٹری کے قریب پہنچ جاؤ تو میں تمہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کردوں گا۔''

''یار میرا گھر تمہاری فیکٹری سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔'' خوش ولی نے کہا۔ ''میں ٹھیک دس بجے اپنے گھر میں ریڈی رہوں گا۔ جب ڈیلیوری وین لوڈنگ کے لیے لگے تو تم مجھے ایک مس کال کردینا، میں اپنی بائیک پر سوار ہوکر تمہاری فیکٹری کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پھر اس کا تعاقب کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' میں نے خوش ولی کی تجویز

سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”میں مس کال کے علاوہ تمہیں ایک میسج میں ڈیلیوری وین کا نمبر بھی سینڈ کردوں گا اس طرح تمہارے لیے وین کا تعاقب کرنے میں بہت آسانی ہوجائے گی۔“ لمحے بھر کے توقف کے بعد میں نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”تم نے دیکھا ہوگا‘ ہماری فارماسیوٹیکل کمپنی کے سامنے ہی ایک ہوٹل ہے۔ اگر تمہیں انتظار کرنا پڑے تو وہاں بیٹھ سکتے ہو۔“

ہاں‘ وہ ہوٹل میرے ذہن میں بھی ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں تمہاری فیکٹری سے لے کر ڈسٹری بیوٹر کے گودام تک اس ڈیلیوری وین کا تعاقب کروں گا اور جو بھی غیر معمولی بات نظر آئی۔ اس کی تمہیں رپورٹ دوں گا اور اگر......!“

”اگر کیا؟“ اس نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

”اگر اس تعاقب کے نتیجے میں کوئی ایسا ایشو سامنے آ گیا جو تمہاری ترقی کا باعث بن سکتا ہو تو پھر تم پر ”ٹریٹ“ ڈیو ہوجائے گی۔“ خوش ولی نے اصراری انداز میں کہا۔

”ڈن۔“ میں نے کہا۔ ”اگر اس پہاڑ کو کھودنے کے بعد چوہے کے بجائے کچھ ایسا برآمد ہوا جس کا تم نے ذکر کیا ہے تو میں تمہیں ایک شاندار ڈنر دوں گا۔“

مزید پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا اور رابطہ موقوف کردیا۔ اس روز میں بڑے سنسنی خیز جذبات و احساسات کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا لیکن میں نے دانستہ امی سے اس ایشو پر کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس معاملے کو ان سے چھپانا چاہتا تھا۔ دراصل ابھی تک میں خود کنفرم نہیں تھا۔ یہ معمہ حل ہوجاتا تو پھر میں ان سے تفصیلی بات کرتا۔

اس معاملے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی تھا شاید میں لاشعوری طور پر ایسا سوچ رہا تھا اگر امی کو میری اس تازہ ترین سرگرمی کی بھنک پڑ گئی تو وہ مجھے ایسے خطرناک معاملے سے دور رہنے کی تلقین کریں گی اور میں اب کسی بھی قیمت پر حتمی نتیجے تک رسائی حاصل کیے بغیر چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اگر امی بیچ میں کود پڑتیں تو میرا منصوبہ ادھورا رہ جاتا لہٰذا میں نے انہیں اپنی اس سرگرمی کی ہَوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

۞......۞

اگلے روز میں ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ فیکٹری پہنچا اور جیسے ہی مجھے کنفرم ہوا کہ ڈیلیوری وین ادویات کی لاٹ لے کر کتنے بجے فیکٹری سے نکل رہی ہے۔ میں نے اس حوالے سے خوش ولی کو مکمل معلومات فراہم کردیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کا ریپلائی میسج بھی آ گیا کہ میں فکر نہ کروں‘ وہ سب سنبھال لے گا میں مطمئن ہوگیا۔

میں نے اپنی حرکات و سکنات سے ایک لمحے کے لیے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ آج میں کسی خاص ”مشن“ پر ہوں۔ حسبِ معمول اپنے فورمین عظیم احمد کی ہدایات کے عین مطابق میں دوائیوں سے بھرے ہوئے کارٹن اٹھا اٹھا کو وین میں لوڈ کرتا رہا۔ جب لوڈنگ کا کام مکمل ہوگیا تو فورمین‘ ڈیلیوری وین کے ڈرائیور کو ایک طرف لے گیا اور اسے چند کاغذات تھمانے کے بعد نیچی آواز میں کچھ سمجھانے لگا۔

وہ دونوں مجھ سے اتنے فاصلے پر کھڑے تھے کہ میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ فورمین‘ وین کے ڈرائیور سے کیا بات کر رہا تھا لیکن ان لمحات میں میرا ذہن چونکہ ایک مخصوص انداز میں سوچ رہا تھا لہٰذا مجھے یہی لگا کہ فورمین‘ ڈرائیور کو وین میں لدی ہوئی ادویات کے حوالے سے خفیہ ہدایات دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈیلیوری وین فیکٹری سے روانہ ہوگئی۔

دوپہر تک کا وقت میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ مجھے خوش ولی کی کال کا انتظار تھا۔ بالآخر جب لنچ کا وقفہ ہوا تو میرا سیل فون تھرتھرا اٹھا۔ میں اپنے موبائل فون کو عموماً وائبریٹر پر رکھا کرتا تھا خصوصاً جب وہ میری جیب میں ہوتا تو سائلنٹ موڈ پر ہی رہا کرتا تھا۔ میں نے سیل فون کو جیب سے نکال کر دیکھا۔ ڈسپلے پر خوش ولی کا نام فلیش ہورہا تھا۔ میں نے فوراً ”یس“ کا بٹن پریس کرکے فون کو کان سے لگایا۔

”ہیلو باس کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

”رپورٹ بہت ہی سنسنی خیز ہے یار۔“ وہ اضطراری انداز میں بولا۔

”معاملہ اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہے۔ جہاں تک تم سوچ رہے ہو۔“

”کچھ پتا تو چلے۔“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”میں پچھلے تین گھنٹے سے تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنی دیر کہاں لگ گئی؟“

”تمہارے ہر سوال کا جواب ہے میرے پاس۔“ خوش ولی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن یہ باتیں اتنی حساس ہیں کہ فون پر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”ٹھیک ہے‘ میں چھ بجے چھٹی کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”آرام سے بات کرنے کے لیے چھ بجے کا انتظار کیوں کیا جائے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”تم سر میں شدید درد کا بہانہ کرکے فیکٹری سے نکل آؤ۔ میں اس وقت تمہاری فیکٹری سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد تمہیں اس بس اسٹاپ پر ملوں گا جہاں سے تم گھر جانے کے لیے بس میں بیٹھتے ہو۔“

”ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

آئندہ دس منٹ میں‘ میں نے فیکٹری سے نکلنے کا بندوبست کرلیا۔ خوش ولی کے مشورے کے مطابق‘ میں نے اپنے فورمین عظیم احمد کو بتایا کہ سر میں شدید درد ہورہا ہے تو اس نے خوشی سے مجھے چھٹی دے دی۔ میں بس اسٹاپ پر پہنچا تو خوش ولی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں ایک پر فضا‘ پر سکون ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ ویٹر جب آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں خوش ولی سے کہا۔

”یار! اب بتاؤ‘ کیا معاملہ ہے؟“

وہ نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یہ جعلی ادویات کا کوئی خطرناک کھیل کھیلا جارہا ہے۔“

”جعلی ادویات۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں یار؟“

”میں سمجھاتا ہوں۔“ وہ بدستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے جب حسبِ پروگرام ڈیلیوری وین کا تعاقب شروع کیا‘ تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ایک بند سوزوکی وین بھی ڈیلیوری وین کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ کبھی وہ سوزوکی وین مجھ سے پیچھے رہ جاتی اور کبھی ڈیلیوری وین سے آگے نکل جاتی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ میری طرح وہ بند سوزوکی وین بھی ڈیلیوری وین کے تعاقب میں تھی۔“

”بند سوزوکی وین!“ خوش ولی سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

”ہاں‘ بند سوزوکی وین‘ جیسی کہ مختلف کمپنیز اپنی

پراڈکٹس کی سپلائی کے لیے استعمال کرتی ہیں۔" وہ میری بات کا جواب دینے کے بعد وضاحت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔ "جب ڈیلیوری وین سائٹ ایریا سے باہر نکل آئی تو میں نے ایک نسبتاً کم مصروف سڑک پر مڑتے دیکھا۔ میں نے مناسب رفتار سے دونوں گاڑیوں کا تعاقب جاری رکھا کیوں کہ بند سوزوکی بھی ڈیلیوری وین کے پیچھے ہی اس سڑک پر مڑ گئی تھی۔ کچھ آگے جا کر میں نے محسوس کیا کہ ان دونوں وینز کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ پھر وہ ایک پُرسکون مقام پر آگے پیچھے رک گئیں۔ میرے وہاں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لہٰذا میں فطری انداز میں اپنی بائیک کو آگے بڑھا لے گیا تاکہ انہیں مجھ پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔"

اسی لمحے ویٹر چائے وغیرہ لے کر آ گیا چنانچہ خوش ولی کو وقتی طور پر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ ویٹر چائے اور لائٹ ری فریش منٹ سرو کر کے واپس چلا گیا تو میں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"میں تھوڑا آگے جا کر سگریٹ خریدنے کے لیے پان کے ایک کیبن پر رک گیا۔" وہ سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "وہ کیبن، وینز سے تھوڑے فاصلے پر تو تھا لیکن میں وہاں کھڑے ہو کر دونوں وینز کی کارروائی کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا اور پھر میری آنکھوں نے ایک نہایت ہی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز منظر دیکھا۔" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک جھرجھری لی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔

"اس بند سوزوکی وین کا عقبی دروازہ کھلا اور ڈیلیوری وین کے لوڈرز سوزوکی وین میں سے کارٹن نکال نکال کر ڈیلیوری وین پر چڑھانے لگے۔ اتنے فاصلے سے میں یہ تو نہیں دیکھ سکتا تھا کہ ان کارٹن میں کیا ہو سکتا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان کے اندر جعلی ادویات ہو سکتی تھیں جو اصلی ادویات میں شامل کر کے شہر بھر میں سپلائی کی جا رہی تھیں۔"

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "یہ تو بہت ہی خطرناک صورتِ حالات ہے۔"

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ "میرے اندازے کے مطابق آٹھ سے دس بڑے کارٹن جب بند سوزوکی وین میں سے ڈیلیوری وین کے اندر منتقل ہو چکے تو انتقالِ ادویات کا سلسلہ روک دیا گیا اور لوڈرز دوبارہ ڈیلیوری وین میں جا بیٹھے۔ اس دوران میں دونوں وین کے ڈرائیور اپنی سیٹوں سے ایک انچ نہیں ہلے تھے۔ منتقلی کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد دونوں دوبارہ چل پڑیں اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر میں بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔"

خوش ولی ایک مرتبہ پھر رکا اور چائے کی چسکی لینے کے بعد دوبارہ میری جانب متوجہ ہوا تو اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے سوال کر دیا۔

"اس کے بعد تم ڈیلیوری وین کا تعاقب کرتے ہوئے ڈسٹری بیوٹر کے گودام تک گئے ہو گے ہیں نا؟"

"نہیں۔" اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ نفی میں گردن ہلائی اور بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔ "جب میں نے ڈیلیوری وین کا تعاقب شروع کیا تھا تو میرا ارادہ گودام تک جانے ہی کا تھا لیکن اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا اور ڈیلیوری وین کو فراموش کر کے بند سوزوکی وین کے پیچھے لگ گیا۔ میرا یہ تعاقب پی آئی بی کالونی میں جا کر ختم ہوا۔"

"پی آئی بی کالونی؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں دوست!" اس نے ایک بوجھل سانس

خارج کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔ "سوزوکی وین ایک چھوٹے سے کارخانے کے سامنے جا کر رکی تھی۔ اس کارخانے میں بچوں کے کھانے کی مختلف چیزیں مثلاً چیونگم، ٹافی، پاپڑ، چپس اور جیلی وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پراڈکٹ برانڈڈ نہیں۔ یہ سب ایک روپے سے لے کر پانچ روپے تک مالیت کی چیزیں ہیں۔ وہ سوزوکی انہی پراڈکٹس کو مختلف دکانوں تک پہنچانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اب تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ تمہاری فارماسیوٹیکل کمپنی کی ڈیلیوری وین میں بچوں کی چیزوں کے آٹھ دس کارٹن رکھنے کی کیا تک بنتی ہے۔"

"خوش ولی! میں بھی تمہارے ہی انداز میں سوچنے پر مجبور ہوں۔" میں نے تشویش بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "یقیناً نقلی ادویات کو ہماری کمپنی کی ادویات کے ساتھ شامل کر کے ڈسٹری بیوٹر کے گودام تک پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ جعلی دوائیں پی آئی بی والے کارخانے میں تیار ہوتی ہیں یا کہیں اور سے انہیں اٹھا کر اس کارخانے میں پہنچایا جاتا ہے۔ یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتا چلایا جا سکتا ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں تم کل ہی اپنے باس کو صورت حال سے آگاہ کر دو۔" خوش ولی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہ لوگ اپنے طور پر چھاپا مار کر جب ڈیلیوری وین والوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گے تو پھر سب کچا چٹھا سامنے آ جائے گا کہ اس گھناؤنے کام میں کمپنی کے کون کون سے لوگ ملوث ہیں مجھے یقین ہے......!" لمحاتی توقف کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس کارنامے پر تمہارا باس اس قدر خوش ہوگا کہ تمہارا پروموشن پکا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو خوش ولی!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس سلسلے میں اپنے باس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیا مطلب!" اس نے حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر میں نے باس سے بات کی اور سازش کو بے نقاب کر کے مجرموں کے خلاف سخت ترین کارروائی کی گئی تو اس کھٹ راگ کے اختتام پر صرف میرا فائدہ ہوگا' یعنی مجھے کمپنی میں کسی بھی نوعیت کی ترقی دے دی جائے گی۔"

"تو......!" اس کی حیرت دو چند ہوگئی۔ "کیا تم اپنا فائدہ نہیں چاہتے؟"

"چاہتا ہوں مگر صرف اپنا نہیں بلکہ تمہارا بھی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں اسد!" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

"میرا باس خالد رشید میری سمجھ میں ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں سکا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی بہ نسبت عاطف رشید زیادہ سمجھ دار اور بردبار شخص ہے۔"

"کون عاطف رشید؟" اس نے بے ساختہ سوال کیا۔

"وہ شخص جس نے "برہان ٹریڈرز" میں اس دن ہمارا انٹرویو کیا تھا۔" میں نے بتایا۔ "عاطف رشید اس معاملے کو زیادہ بہتر انداز میں ہینڈل کر سکتا ہے۔ وہ خالد رشید سے زیادہ معقول اور مستعد شخص ہے۔"

"تو تم عاطف رشید سے بات کرنا چاہتے ہو؟" خوش ولی نے استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"میں نہیں ہم......!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کل صبح ہم دونوں عاطف رشید سے ملاقات کرنے جا رہے ہیں۔ اس سازش کو بے نقاب کرنے میں تم نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ میری ترقی تو ہوگی ہی' میں برہان ٹریڈرز میں تمہاری جاب بھی پکی کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"اوہ......! تم اس انداز میں سوچ رہے ہو!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"کل صبح ٹھیک دس بجے ہم برہان ٹریڈرز میں ملیں گے۔" میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "اور تم میری خواہش کا احترام کرو گے!"

"ٹھیک ہے یار! تم جیسا چاہ رہے ہو' میں ویسا ہی کروں گا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ "تو کیا کل تم ڈیوٹی پر نہیں جاؤ گے؟"

"میں نے شدید دردِ سر کا بہانہ کر کے چھٹی لی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس بہانے کو آگے بڑھاتے ہوئے صبح فیکٹری فون کر دوں گا کہ مجھے بخار ہوگیا ہے۔ لہٰذا ڈیوٹی پر نہیں آ سکتا کہو یہ آئیڈیا کیسا ہے؟"

خوش ولی نے توصیفی انداز میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔

✿......✿

رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں مسلسل جعلی ادویات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خوش ولی نے جو سنسنی خیز انکشاف کیا تھا اس نے میرے رگ و پے میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ میں نے نقلی دوائیوں کے بارے میں بڑی خوف ناک کہانیاں سن رکھی تھیں۔ پچھلے دنوں کسی اخبار میں' میں نے ایک سروے میں بھی پڑھا تھا کہ چند معتبر فارمیسی اور میڈیکل اسٹورز کو چھوڑ کر

تقریباً ہر جگہ کم یا زیادہ نقلی ادویات' اصلی کے ساتھ موجود تھیں۔ پیکنگ' ریپرز' بوتلیں' لیبلز' سب کچھ اصلی جیسا تھا لیکن اندر اصلی دوا نہیں تھی اسی لیے مریض مہنگی ادویات کئی روز تک استعمال کرنے کے بعد بھی صحت و شفا سے محروم رہتا تھا۔ جعل سازی کا یہ دھندا بہت سے جرائم پیشہ معزز افراد کی ملی بھگت سے ہو رہا تھا اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ سروے رپورٹ میں تو یہاں تک لکھا ہوا تھا کہ لیبلز اور پیکنگ وغیرہ اصلی کمپنیز سے چوری کروالی جاتی ہیں تاکہ بظاہر دیکھنے میں اصلی اور نقلی دوا میں کوئی فرق نظر نہ آئے۔ مریض بے چارہ تو وہی دیکھ سکتا ہے جو اس کی آنکھیں اسے دکھائیں گی۔ وہ کھانے سے پہلے دوا کا لیبارٹری ٹیسٹ کر کے اس بات کا اطمینان تو نہیں کر سکتا کہ وہ اصلی دوا لے رہا ہے یا اصلی کے جھانسے میں جعلی دوا اس کے معدے میں اتر کر اس کی بیماری کو دوام بخشنے جا رہی ہے۔ مذکورہ سروے رپورٹ کے مطابق' اس وقت شہر کے میڈیکل اسٹورز پر پچیس سے تیس فی صد نقلی یعنی دو نمبر ادویات موجود تھیں۔ یہ اوسط اگر ایک فیصد بھی تھا تو نہایت ہی افسوس ناک اور قابلِ مذمت تھا۔ یہ کھلم کھلا انسانی زندگیوں سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ اگر اس فعلِ قبیح کو انسانیت کی تذلیل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

میں نے پچھلے کئی روز سے اپنی فیکٹری کے اکاؤنٹ اور مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ میں جس قسم کا پراسرار تال میل دیکھا تھا اس سے مجھے یقین تھا کہ جعلی ادویات کے دھندے میں وہ لوگ گردن گردن تک دھنسے ہوں گے۔ ان کی مرضی اور آشیر باد کے بغیر یہ خطرناک کھیل جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال یہ جو کچھ بھی تھا صبح عاطف رشید صاحب کی ٹیبل تک پہنچنے والا تھا۔ ہماری اسٹوری میں جان تھی اور عاطف رشید جیسے کائیاں شخص سے مجھے پوری امید تھی کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا دے گا۔ جبھی میں نے خالد رشید کے بجائے عاطف رشید سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ "دھپ" کی مخصوص آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز گھر کے صحن کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے پوری توجہ اسی جانب لگا دی۔ اگلے ہی لمحے قدموں کی نہایت ہی دھیمی اور محتاط چاپ نے میری سماعت تک رسائی حاصل کر لی کوئی دبے پاؤں صحن میں چل رہا تھا۔

میں ڈرائنگ روم میں سوتے وقت دروازے کو بند نہیں کیا کرتا تھا۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ شاید شازیہ کسی ضرورت کے تحت اٹھی ہے لیکن جب میں نے پراسرار قدموں کی مخصوص چاپ کو ڈرائنگ روم کے دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے سنا تو میری حیرت تشویش میں بدل گئی۔ شازیہ اگر کسی کام سے رات میں اٹھی بھی تھی تو اسے ڈرائنگ روم کی جانب آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' تو پھر یہ کون تھا؟

اگلے ہی لمحے مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ میں نے چھوٹے قد کے ایک ہیولے کو ڈرائنگ روم کے اندر داخل ہوتے دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ فرحانہ تھی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ چاند کی روشنی کے باعث نیم روشن تھا۔ جبھی فرحانہ کو شناخت کرنے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی جب کہ میں ڈرائنگ روم کے جس حصے میں لیٹا ہوا تھا وہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آدھی رات کے بعد ایک جوان اور پرکشش لڑکی کی اپنے کمرے میں آمد کوئی معمہ نہیں تھا کہ جسے حل کرنے کے لیے عقل کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانے کی ضرورت پیش آتی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے یقین ہوگیا کہ فرحانہ رات کی

تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کس مقصد سے میرے پاس آئی تھی۔ میں اس کے عزائم کے تصور سے تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنے لگا۔

میں نے آنکھیں تو میچ لی تھیں مگر میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ ہم دونوں کے گھر کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً ہماری چھت سے ہوتے ہوئے زینے کے ذریعے صحن میں پہنچی ہوگی۔ وہ ماہِ نومبر کے اختتامی ایام تھے۔ گلابی جاڑے کی آمد آمد تھی۔ امی اور شازیہ اپنے اپنے کمروں میں پر سکون نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ یہی کیفیت فرحانہ کے والدین کی بھی ہوگی اور اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔

ملاقات کے لیے آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ مگر رات کی تاریکی میں اس کی آمد درجنوں سنسناہٹ بھرے سوالات کو جنم دے رہی تھی۔ میں فرحانہ کے احساسات اور جذبات کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھنے لگا تھا۔ جلد ہی مجھے تمام سوالات کے جواب مل گئے۔ کارپٹ پر فرحانہ کے قدموں کی چاپ تو نہیں ابھر رہی تھی تاہم اس کے بدن کی مہک نے مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میرے پہلو میں چند انچ کے فاصلے پر موجود ہے۔

مجھ سے پڑھنے کے دوران میں وہ کئی بار مجھ سے انچوں کے فاصلے پر آئی تھی اور بعض اوقات ہمارے بدن کے بعض حصے بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے لیکن اس وقت کسی سنسنی خیزی کا احساس نہیں ہوا تھا مگر ان لمحات میں مجھے اپنی سوچ میں کسی سونامی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنے چہرے پر اس کی زلفوں کا لمس اور اس کی سانسوں کی گرماہٹ محسوس ہوئی۔ مجھے اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی پھر اس نے اپنے تپتے ہوئے گداز ہونٹ میری پیشانی پر رکھ دیے۔

میرے تن بدن میں جیسے ایک بجلی سی کوند گئی۔ کسی صنفِ نازک کی جانب سے مجھے حاصل ہونے والا یہ محبت کا پہلا بوسہ تھا۔ اس وارفتہ بوسے کی شیرینی اور گداز مجھے اپنی روح کی گہرائی تک اترتا محسوس ہوا۔ میں کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا کہ اس جذباتی بھونچال میں بھی آنکھیں میچے کسی لاش کے مانند چپ چاپ پڑا رہتا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے بازوؤں نے میکانکی حرکت کی اور اگلے ہی لمحے پاڑ پر آئی ہوئی وہ متلاطم ندی میری آغوش میں سمٹ چکی تھی۔

وقت گویا ایک جگہ تھم کر ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ ہماری زبانیں خاموش تھیں مگر جذبات بول رہے تھے اور ایک دوسرے کو ٹٹول رہے تھے۔ فرحانہ کے رسیلے گداز ہونٹ گویا آگ کے انگارے تھے۔ میں ان ہونٹوں کی تپش میں اپنے احساسات کو سینکنے لگا۔ اس نوعیت کا یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ تجربہ زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے......!

پتا نہیں کتنا ہی وقت اسی جذبے کے عالم میں گزر گیا۔ پھر فرحانہ میری بانہوں کی گرفت میں کسمسائی اور مجھ سے الگ ہوتے ہوئے الجھی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔

”بس، میں مر جاؤں گی۔“

”یہ ایک بہادر کی موت ہوگی۔“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”تم نے رات کی تاریکی میں جس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اس پر تو تمہیں کوئی تمغا ملنا چاہیے۔“

بڑی عجیب سی بات تھی۔ ان لمحات میں نہ تو وہ

مجھے ”تم“ کہہ رہی تھی اور نہ ہی میں ”آپ جناب“ کا صیغہ استعمال کر رہا تھا۔ اس پر جوش ملاپ نے اس قسم کے سارے تکلفات مٹا دیے تھے۔ ہم کارپٹ سے اٹھ کر صوفے پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ تاریکی میں ہم ایک دوسرے کے چہرے کو وضاحت سے تو نہیں دیکھ سکتے تھے تاہم چند لمحات پہلے والی بدنی شناسائی نے من دتو کا فرق ختم کر دیا تھا اور ایک دوسرے کی پہچان کے لیے چہرے دیکھنا ضروری نہیں رہا تھا۔ ہم نہ دیکھ کر بھی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

وہ نہایت ہی دھیمی آواز میں مستفسر ہوئی۔ ”آپ کو میرا آنا برا تو نہیں لگا؟“

”بالکل نہیں، بلکہ بہت اچھا لگا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”مگر تم نے یہ بہت ہی خطرناک قدم اٹھایا ہے فرحانہ! اگر تمہارے والدین میں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو جانتی ہو کیا ہوگا؟“

”ہاں، جانتی ہوں۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن میں مجبور ہوگئی تھی یہ رسک میں نے آپ ہی کی وجہ سے لیا ہے۔“

”میری وجہ سے؟“ میرے لہجے میں حیرت در آئی۔

”ہاں اسد! میں آپ سے دوری برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”پہلے تو پڑھائی کے بہانے آپ دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ جب سے آپ نے جاب کی ہے، ہفتوں گزر جاتے ہیں آپ کی شکل دیکھے ہوئے آج میں نے جو خطرناک قدم اٹھایا ہے۔ یہ سب آپ کی محبت سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ آئی لو یو اسد!“ جذبات کی شدت سے اس کی آواز بوجھل ہوگئی۔

میں نے بازو دراز کر کے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں چاہت بھرے انداز میں اس کی پشت کو سہلانے لگا۔ وہ بڑے نشاط انگیز لمحات تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، زندگی ایک مقام پر کسی حسین اور دل نشین موڑ پر آ کر جامد ہوگئی ہو جیسے کسی ڈرامے کے اپی سوٹ کا آخری رومینٹک سین فریز ہو کر رہ جاتا ہے۔

وہ میرے سینے پر اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔ ”اسد! وعدہ کریں کہ آپ کبھی مجھ سے دور نہیں جائیں گے۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“

اس سے پہلے کہ میں فرحانہ سے کوئی وعدہ کرتا، باہر گلی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ بے ساختہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو کر تشویش ناک انداز میں ڈرائنگ روم کے دروازے کی سمت دیکھنے لگے۔ یہ ہمارا ایک فطری ردعمل تھا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کوئی نہیں تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز تو باہر گلی میں ابھری تھی۔ بہرحال یہ خاصی الجھن زدہ صورتِ حال تھی۔

”مجھے جانا چاہیے......!“ فرحانہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

میں بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہوگیا۔ قبل اس کے فرحانہ واپسی کی راہ پر ایک قدم بھی اٹھاتی، دوڑتے ہوئے قدموں کی مخصوص دھمک ہمارے گھر کے سامنے آ کر رک گئی۔ اگلے ہی لمحے بڑے طوفانی انداز میں ہمارے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

ہم ساکت کھڑے، وحشت زدہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے......!

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

قصوروار

محترم عمران بھائی،
السّلام علیکم!
آج کل کے حالات اور ملک میں پھیلی اور بڑھتی ہوئی بے حیائی کو دیکھتے ہوئے ' اللہ تعالیٰ کے احکامات کی روشنی میں یہ کہانی تحریر کی ہے۔ اس بات کے لیے معذرت چاہتی ہوں کہ انداز بیان کھلا ہوا ہے۔ مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ تاکہ ہر مسلمان عورت اور لڑکی کی سمجھ میں بات اچھی طرح سے آجائے۔ میں یہ بتا دوں کہ یہ بالکل سچی کہانی ہے اس کے کردار آج بھی موجود ہیں اور میڈیا پر بھی نظر آتے ہیں۔
یہ کہانی قرآنی آیات کے ترجمہ سورۃ النور پر مبنی ہے۔ کوشش کروں گی ہر ماہ اس طرح کی ایک کہانی ارسال کرسکوں۔

شہناز بانو
کراچی

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ تینوں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ ملازم نے کافی انہیں وہیں سرو کی۔ آج وہ بہت خوش تھے۔ شہر کے جانے پہچانے بزنس مین جبار توفیق کی اکلوتی بیٹی پکھراج نے آج اپنا ایم بی اے کمپلیٹ کرلیا تھا۔

"بھئی خوشی کے موقع پر میری جانب سے ایک گرینڈ پارٹی ہوگی۔ جس میں تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو مدعو کیا جائے گا۔" جبار توفیق نے ہاتھ اٹھا کر فخریہ لہجے میں کہا۔

"بالکل ہوگی۔" بیگم شاہانہ نے کہا پھر بولیں۔ "اچھا ہے ناں تمام ہائی کلاس کے گھرانوں کے لوگ میری پکھراج کو بھی دیکھ لیں گے۔ اس سے مل لیں گے اور پھر ہمیں بھی اس کا رشتہ تلاش کرنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔"

"واٹ یو مین مام؟" پکھراج نے چونک کر کہا۔

"آئی مین میری جان کہ اب تم اپنی اسٹڈیز تو مکمل کر ہی چکی ہو اور اب تمہاری شادی ہوگی۔ یہی عمر تو ہوتی ہے شادی کی لائف کو انجوائے کرنے کی۔ میری شادی لگ بھگ تمہاری عمر میں ہوگئی تھی اور دیکھ لو آج میری بیٹی جوان ہے اور میں بھی، سچ بتاؤ کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں تمہاری ماں ہوں بلکہ تمہاری بڑی بہن لگتی ہوں۔" اس کی ممی نے کہا۔

"آپ نے اپنے آپ کو مینٹین بھی تو رکھا ہے آئی لو یو مام۔" پکھراج پیار سے ماں کی جانب جھکی اور ماں کے گال کو چوم کر بولی۔ پھر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر مام مجھے آپ کی اس بات سے تھوڑا سا اختلاف ہے، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی میں زندگی سے انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ میں نے سوائے اپنی پڑھائی کے اور کچھ نہیں کیا۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے شادی کروا کے اپنے شوہر کے ساتھ خوب گھوم پھرو عیش کرو۔" ماں نے کہا۔

"نہیں مام بس میرا موڈ نہیں ہے شادی کرنے کا اور پلیز ابھی آپ کچھ عرصے کے لیے رہنے ہی دیں۔" پکھراج نے برا سا منہ بنا کے کہا۔

"تو پھر تمہارا کیا پلان ہے۔" جبار توفیق نے جو خاموشی سے ماں بیٹی کی گفتگو سن رہے تھے پہلی بار لب کشائی کی۔

"میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔" پکھراج نے کہا۔

"واٹ......! جاب کرو گی تم جبار توفیق کی بیٹی جاب کرے گی۔" جبار توفیق نے تیزی سے کہا۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے پاپا' آخر میں نے اتنی تعلیم کس لیے حاصل کی ہے؟" پکھراج نے کہا۔

"ہم نے تمہیں تعلیم جاب کرنے کے لیے تو نہیں دلوائی جاب کرنے کے لیے تعلیم غریب لوگ حاصل کرتے ہیں۔ انہیں اپنے گھر چلانے ہوتے ہیں اور جو سیلری تمہیں ملے گی وہ تم مجھ سے ہر ماہ لے لیا کرو۔ بس اس فضول خیال کو اپنے دماغ سے نکال دو۔" جبار توفیق نے کہا۔

"جسٹ فار انجوائے منٹ پاپا! پھر کچھ عرصہ میں زندگی کے اس رخ کو بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔" پکھراج نے لاڈ سے پاپا کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر کہا تو انہوں نے بے دلی سے ہاں کردی' پھر بولے۔

"اچھا بتاؤ کہاں جاب کرنا چاہتی ہو میں تمہارے لیے بات کرتا ہوں۔"

"ایسے تھوڑی پاپا۔" پکھراج نے کہا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک تھی ایک ایڈونچر کی چمک۔

"پھر......؟" پاپا نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میں خود جاب تلاش کروں گی اور بغیر آپ کے ریفرنس سے جاب اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر حاصل کروں گی۔"

"کیوں اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رہی ہو۔" توفیق نے کہا۔

"اسی میں تو اصل مزہ ہے پاپا۔" پکھراج نے کہا اور ہنستی ہوئی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

جبار توفیق کا تعلق ہائی کلاس فیملی سے تھا۔ ان کا بزنس ملک کے دوسرے شہروں کے علاوہ بیرون ملک پھیلا ہوا تھا۔ اولادوں میں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک بیٹی دی تھی۔

پکھراج کے تیکھے نقوش متناسب جسم اور خوب صورت بھنورا سی سیاہ آنکھیں' گلابی رنگت اور شولڈر پر بکھرے سیاہ ریشمی بال' وہ ہنستی تو اس کے گالوں پر پڑنے والے ڈمپل اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے تھے۔

جبار توفیق نے فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنی بیٹی کی کامیابی کی خوشی میں بہت شان دار ڈنر دیا۔ اسی روز کئی ماؤں نے اسے اپنے بیٹوں کے لیے پسند کرلیا تو کتنے ہی نوجوان اسے اپنا دل دے بیٹھے۔ مگر اس نے کسی کی جانب نہیں دیکھا۔

سب ہی پوچھ رہے تھے کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ مگر اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا کہ وہ جاب کرنا چاہتی ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بات بتانے پر سب کا ری ایکشن کیا ہوگا۔

دوسرے دن سے اس نے دلچسپ مشغلے کے طور پر اخبارات میں اشتہارات دیکھنے شروع کیے ایک دو جگہ اس نے درخواست بھیجی اس نے چند کمپنیوں میں انٹرویو بھی دیے مگر کہیں تجربہ مانگتے تو کہیں اس کی ڈیمانڈ پوری نہیں ہوتی۔

جبار توفیق نے اس سے پوچھا کہ اس کی جاب کا کیا ہوا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ کوشش جاری ہے جبار توفیق نے کہا کہ میں تمہیں جاب دلوا دیتا ہوں۔ جب تمہارا شوق پورا ہو جائے تو تم چھوڑ دینا۔ مگر اس نے سختی کے ساتھ منع کردیا کہ وہ یہ کام خود کرے گی اور اسے ایسا کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی بلکہ اسے بہت مزہ آ رہا ہے۔

فرصت کا باقی ٹائم وہ اپنی دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور گپ شپ کرنے میں لگا دیتی۔

بنیادی طور پر وہ ایک مضبوط کردار کی حامل تھی حالانکہ اس کے دوستوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل تھے۔ مگر اس کی دوستی میں مرد اور عورت کا فرق نہیں تھا۔ لباس کے نام پر وہ جینز اور شرٹ پہنتی تھی۔ کیوں کہ بچپن ہی سے اس کے ماں باپ نے اسے ایسا ہی لباس پہنایا تھا۔ اس لیے وہ اس کی عادی تھی۔ ایک فطری حیا جو عام طور پر لڑکیوں میں جوان ہونے کے بعد آ جاتی ہے اور وہ اپنے جسم کو دوسری نگاہوں سے چھپانے کا اہتمام شلوار قمیص اور دوپٹے کے ساتھ کرتی ہیں وہ پکھراج میں پیدا ہی نہیں ہوسکی تھی اور نہ ہی اسے اس بات کی پروا اور احساس تھا کہ اس تنگ لباس میں وہ دوسرے مردوں کی نگاہوں کی تسکین کا باعث بن رہی تھی۔ کبھی بغیر آستین کے ٹی شرٹ ہوتی تو کبھی سامنے سے اوپن چھوٹی سی شرٹ اس کا گورا جسم اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دوسروں کے سامنے ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حسن بھی ایسا دیا تھا جو ایک مرتبہ اسے دیکھ لیتا دوسری مرتبہ ضرور پلٹ کر دیکھتا۔ اسے اپنے اس حسن جہاں سوز کا احساس بھی تھا اور جب اس کے دوست اس کی تعریف میں اسے سیکسی کہہ کر مخاطب کرتے تو وہ ہنس دیتی۔

تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے بالآخر چار پانچ مہینوں کی کوششوں کے بعد اسے ایک فرم میں جاب مل گئی۔ یہ ایک غیر ملکی فرم تھی اور یہاں اسی طرح کی آزاد خیال اور ماڈرن لڑکی کی ضرورت تھی۔ ملازم لڑکیاں بے باک ہوں تو آنے والوں پر اچھا امپریشن پڑتا ہے۔

کیونکہ اسے جاب کا تجربہ نہیں تھا اس لیے اس کی سیلری اس کی توقع کے مطابق نہیں تھی۔ اس سے یہ کہا گیا کہ آپ یہاں کام کریں۔ آپ کے کام کو دیکھتے ہوئے چھ ماہ کے بعد آپ کی سیلری میں اضافہ کردیا جائے گا۔ اس نے یہ آفر قبول کرلی۔ کیونکہ سیلری اس کا مسئلہ نہیں تھا۔

وہ روزانہ پابندی سے فرم آنے لگی۔ فرم آنے کے لیے اس نے ایک چھوٹی سوزوکی کار اپنے استعمال میں رکھی۔ وہ دل لگا کے کام کر رہی تھی اسے یہاں کام کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ بہت جلد اس کی اپنے کولیگ سے دوستی ہوگئی۔ اس کا حسن اور بے باکی دیکھتے ہوئے فرم کا ہر شخص چاہے وہ عمر رسیدہ ہو یا جوان اس سے دوستی کا خواہاں تھا۔ اس کے بہت سے سینئر جو اس کے پاپا کی عمر کے تھے بلاوجہ ہی اسے اپنے روم میں بٹھا کر اس سے باتیں کیا کرتے اور وہ فخر سے اپنے گھر میں کہتی۔ ”میں سب کی چہیتی ہوں۔“

فرم میں خواتین کی تعداد اسے ملا کر تین تھی۔ باقی سب مرد ملازم تھے۔ وہاں پہلے سے ملازم دونوں لڑکیاں ہما اور نائمہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ جو ہمیشہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس فرم آتیں اور اتنے مردوں کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے سر پر دوپٹا لیے رہتیں۔ ان کی دوستی تو لڑکوں سے نہیں تھی۔ بس جتنی ضرورت ہوتی وہ بات کرلیتی تھیں۔

پکھراج جب فرم میں آئی تو دونوں نے اس کی بے باکی کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ لنچ کے اوقات میں وہ دونوں اٹھ کر ایک مخصوص روم میں چلی جاتیں جہاں وہ گھر سے ساتھ لایا ہوا لنچ کھاتیں اور نماز ادا کرتیں۔ اس کے برعکس پکھراج اپنے دوستوں میں گھری ہنسی مذاق کرتی رہتی یا پھر ان کے ساتھ باہر لنچ پر کسی ہوٹل میں چلی جاتی۔

باس بھی پکھراج پر مہربان تھے۔ اس سے کم سے کم کام لیا جاتا ہر لڑکا یہ چاہتا تھا کہ وہ پکھراج کے کام آ جائے تاکہ وہ اس کی پرکیف قربت حاصل کرسکے۔

ایک دو ماہ میں ہی پکھراج نہ صرف فرم کے مردوں میں ہر دل عزیز شخصیت بن گئی بلکہ پیون وغیرہ بھی اس کی ایک نگاہ غلط کے منتظر رہتے۔

☆......☆

وہ اپنی کوٹھری میں ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لیٹا تھا۔ کوٹھری میں گھور اندھیرا تھا مگر اس کے ذہن کے پردے پر پکھراج کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ وہ تصور کی آنکھوں سے اس کے دل کش حسن میں کھویا ہوا تھا۔ اس کا ملیح چہرہ‘ خوب صورت سیاہ آنکھیں‘ گلابی نرم ہونٹ‘ گلاب جیسے گال‘ صراحی نما گردن اور اس سے پھسلتی ہوئی اس کی نگاہیں اس کے سراپا کا طواف کرنے لگیں۔

اچانک ہی باہر سے کتوں کے لڑنے کی آوازیں بھی آنے لگیں اور اس کا تصوراتی محل لمحہ بھر میں گر کر چکنا چور ہوگیا۔ اپنے حسین تصور کے ٹوٹ جانے پر اس نے کتوں کو دو تین فحش گالیوں سے نوازا اور دوبارہ سے اپنے تصور کے تانے بانے بننے لگا۔

اس مرتبہ وہ پکھراج کو اپنے سامنے بیٹھا پا رہا تھا۔ اس سے محبت بھری باتیں کر رہا تھا۔ جواباً وہ بھی اس پر واری صدقے جا رہی تھی اور پھر اسی خوب صورت تصور میں اس نے اپنی خواہش کی تکمیل کرلی اور پھر کہیں جاکے اسے پرسکون نیند آئی۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا وہ روزانہ پکھراج کو دیکھتا تھا۔ مگر مخاطب کرنے یا اس سے بات کرنے کی اسے کبھی جرأت ہی نہ ہوسکی۔ وہ اس سے کیا بات کرتا اور کیسے کرتا۔ اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ مگر وہ اتنی حسین تھی اور ساتھ ہی بے باک اور بے پروا بھی کہ وہ اس سے تصور ہی میں عشق کرتا کرسکتا تھا۔

گاؤں میں اس کی بیوی اور پانچ بچے تھے۔ وہ انہیں وہاں چھوڑ کر روزی کمانے کے لیے شہر آیا تھا۔

اسے اپنی بیوی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اس کی عمر چالیس سال ہونے کو آئی تھی۔ بیوی اس سے چند سال ہی چھوٹی تھی مگر غربت نے اس کی جوانی جلد ہی چھین لی تھی۔ بچے جوان ہو رہے تھے اسے اپنی دونوں جوان بیٹیوں کی بھی فکر تھی۔ اس لیے اس نے کہہ سن کر اسے شہر بھیج دیا۔

حسین اور جوان عورت کسے اچھی نہیں لگتی۔ اس کی تو بیوی بھی حسین نہیں تھی۔ اس کی طرح کالا سیاہ رنگ اور بھدے نقوش وہ اس کے چاچے کی بیٹی تھی۔ باپ نے شادی کردی اس نے کرلی۔ پھر بچے بھی پیدا ہوگئے۔

مگر اسے گوری اور نرم و نازک عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ شہر آ کر اس نے ایسی بہت سی عورتیں دیکھیں۔ سڑکوں پر چلتی پھرتی‘ بازاروں میں ہر جگہ حسن بکھرا پڑا تھا۔ اس کی حریص نگاہیں ایسے جسموں سے لپٹ لپٹ جاتیں۔

☆......☆

اس دن اتفاق سے باس فرم نہیں آئے۔ جیلانی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو وہ بھی جلدی گھر چلے گئے۔ پکھراج کو ہما سے کوئی کام تھا اس لیے وہ اس کے پاس چلی آئی۔ تھوڑی دیر دونوں اس مسئلے میں الجھی رہیں۔ مسئلہ حل ہوا تو پکھراج نے مسکراتے ہوئے اسے تھینکس کیا تو ہما نے بے نیازی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

پکھراج واپس جاتے جاتے پلٹ آئی۔ اسے ہما کا رویہ عجیب سا لگا اور اسے خیال آیا کہ ہما اور نائمہ دونوں اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھیں۔ یہی سوچ کر وہ واپس پلٹی اور ہما کو مخاطب کرکے بولی۔

”ایکسیوزمی ہما!“

”جی کہیے۔“ ہما نے رکھائی سے کہا۔

”تم مجھ سے خفا ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں تو! کیوں؟“ ہما نے ہلکی سی حیرانی سے پوچھا۔
”میں نے نوٹ کیا ہے کہ میں نے جب سے فرم جوائن کی ہے تم دونوں مجھ سے دور دور رہتی ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“ پکھراج نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
پکھراج کا سوال سن کر ہما اور نائمہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا مگر پکھراج کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
”بتاؤ نا تم خاموش کیوں ہو۔“ پکھراج نے ہما کی معنی خیز خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔
”بھئی مس پکھراج ہماری اور آپ کی نہ دوستی ہے اور نہ ناراضگی اصل میں ہم میں اور آپ میں بہت فرق ہے۔ ہم یہاں کام کرکے پیسا کمانے کے لیے آتی ہیں۔ ہمارے والدین بہت باعزت لوگ ہیں۔ انہوں نے ہم پر یہ اعتبار کرکے یہاں بھیجا ہے کہ ہم یہاں صرف کام کریں۔ انجوامنٹ نہیں۔ آپ دوسرے مزاج کی ہیں اور ہم دوسرے مزاج کے۔“ ہما نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
”کیا مطلب ہے تمہارا......! کیا میرے والدین باعزت نہیں ہیں اور انہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ رہی بات صرف کام کرنے کی تو میں کام کو انجوائے کرتی ہوں اور بس۔ اس میں برائی کیا ہے۔“ پکھراج نے ہما کی بات کا برا مناتے ہوئے کہا۔
”یہ بات نہیں ہے مس پکھراج!“ ہما نے سنبھل کر کہا۔
”تو پھر کیا بات ہے؟“ پکھراج نے تیز لہجہ اپنایا مگر پھر سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔
”اگر آپ برا نہ مانیں تو صاف صاف بات کروں گی کہ آپ کی بے باکی ہمیں پسند نہیں ہے۔ مس پکھراج! ذرا یہ تو سوچیں کہ آپ ایک جوان خوب صورت اور مسلمان لڑکی ہیں اور ہمارے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ایک حد مقرر کی ہے۔ ہمیں ان حدوں کے اندر رہتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی ہے۔ آپ نے جو لباس پہنا ہوا ہے وہ ایک شریف لڑکی کو زیب نہیں دیتا اور نہ ہی ایسی لڑکیوں کو وہ عزت ملتی ہے جو ایک مسلمان عورت کو ملنی چاہیے۔
حدیث قدسی ہے (اس کا مفہوم یہ ہے)۔
”عزت تو اللہ کی اطاعت میں ہے۔ لوگ اسے شاہوں کے دربار میں ڈھونڈتے ہیں بھلا وہ کہاں پائیں گے۔“
تم اپنے حسن سے ہر مرد کو دعوت نظارہ دیتی ہو۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کرکے ان کی نفسانی خواہش کی تسکین کا سامان کرتی ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہارا دل صاف ہے کسی بھی لڑکے یا مرد کے لیے تمہارے دل میں کوئی برا خیال نہیں ہے۔ مگر تمہیں کیا معلوم کہ تمہیں دیکھ کر کسی مرد کے دل میں برا خیال نہیں آرہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مرد تمہیں دیکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تم اتنی حسین ہو کہ ہماری نگاہ ہی تمہاری جانب بار بار اٹھ جاتی ہے۔ مرد تو پھر مرد ہے۔ کیوں اپنے آپ کو اور انہیں گناہ گار کرتی ہو۔“ ہما نے متانت سے اپنی بات مکمل کی اور خاموش ہوگئی۔
پکھراج حیرانی سے ہما کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس قسم کی بات کبھی سنی ہی نہیں تھی۔ بچپن سے اس کی مما نے اسے جس طرح سے رکھا وہ ویسی ہی بن گئی مرد...... عورت...... اللہ کا فرمان وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ ہما کی زبانی سنی ہوئی ساری باتیں اسے بہت انوکھی اور عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے گریبان کی جانب بڑھ گیا۔
پھر پکھراج دیر تک ہما اور نائمہ سے باتیں کرتی رہی اور ان باتوں کے دوران اتنا سارا وقت گزر گیا۔ چھٹی کا ٹائم ہوگیا تو ہما اور نائمہ اسے اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گئیں اور پکھراج واپس اپنی ٹیبل پر آ گئی۔ آج تو باس بھی چھٹی پر تھے۔ اس کا ڈھیر سارا کام باقی تھا وہ اسے نمٹانے میں مصروف ہوگئی۔ اگر ہما کے پاس اتنا وقت ضائع نہ کرتی تو ٹائم پر کام ختم ہوجاتا۔ کل یقیناً باس اس سے یہ کام مانگیں گے اس کا ذہن ہما کے ساتھ ہونے والی باتوں میں بھی الجھا ہوا تھا۔ وہ کام شروع کرتی اور پھر ہما کی باتیں سوچنے لگتی۔ بیٹھے بیٹھے اسے پتا ہی نہیں چلا اور کافی وقت بیت گیا۔ اس کے اور دو کولیگ نے آفس سے جاتے ہوئے اس کے روم میں جھانک کر پوچھا بھی کہ ”کیا آج چھٹی کا ارادہ نہیں ہے۔“ تو اس نے کہا کہ آج وہ کام کمپلیٹ کرکے ہی جائے گی۔
ایک ایک کرکے تمام افراد چلے گئے اور آفس خالی ہوگیا۔ تب ہی پیون اندر آیا اور بولا۔
”میم آپ کتنی دیر اور بیٹھیں گی سب لوگ چلے گئے ہیں۔ سارا آفس خالی ہوگیا ہے۔“
”ارے واقعی کافی دیر ہوگئی ہے۔“ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر بولی۔ ”رشید تھوڑا سا کام اور رہ گیا ہے۔ وہ بھی ختم کر ہی لوں تم پندرہ بیس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔“
”ٹھیک ہے میم میں باہر ہی ہوں آپ کو کوئی کام تو نہیں۔“ اس نے کہا۔
”نہیں۔“ اس نے کاغذات پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا تو رشید باہر چلا گیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی اس کے دماغ میں ایک شیطانی خیال نے سر ابھارا۔ وہ سوچنے لگا کہ سارا آفس خالی ہے۔

صرف وہ اور وہ موجود ہے۔ جس کے تصور نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے۔

شیطان اسے مسلسل ترغیب دے رہا تھا کہ آج وہ اپنی شیطانی خواہش کو بلا روک ٹوک پورا کر سکتا ہے۔ اگر آج اس نے یہ زریں موقع ہاتھ سے گنوا دیا تو پھر دوبارہ شاید یہ موقع ہاتھ نہ آئے۔ پھر اس کا دماغ اسے سرزنش کرتا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ کوئی عام سیدھی سادی لڑکی نہیں ہے جو اس زیادتی کو چپ چاپ سہہ جائے گی۔ وہ پولیس سے اسے پکڑوا دے گی۔ شیطان نے کہا تم اپنی خواہش پوری کر کے یہاں ٹھہرنا ہی نہیں بھاگ جانا۔ کسی دوسری جگہ نوکری کر لینا۔

اپنی نفسانی خواہش اور دماغ کی جنگ میں شیطان جیت گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور فرم کے گیٹ پر جا کر باہر کا جائزہ لیا۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے اندر آیا اور کا داخلی دروازہ بند کر دیا اور دبے قدموں پکھراج کے روم کی جانب بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی اور اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ وہ تیزی سے دبے قدموں چلتا ہوا اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ پکھراج کو اس کی آمد کی ذرا بھی خبر نہ ہو سکی۔

اس کا سانس بہت تیز تیز چل رہا تھا۔ اس کے اندر کا وحشی درندہ پوری طرح بےدار ہو گیا۔ اس نے تیزی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر پکھراج کے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا وجود دبوچ لیا۔

اس اچانک حملے سے پکھراج بری طرح بوکھلا گئی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی فی الحال اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر اس جسیم اور بھاری بھرکم مرد کے آگے اس کی ایک نہیں چلی۔ وہ مچلتی رہی تڑپتی رہی مگر اس وحشی درندے نے اسے بری طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ وہ سامنے آیا تو اس نے اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا۔ وہ رشید تھا۔ اس کے آفس کا پیون جس کے بارے میں وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے وحشت کے عالم میں اس کا لباس بری طرح نوچا کھسوٹا اس کا سارا جسم زخمی کر دیا۔ اس کے جسم کے نازک حصوں کو اپنے دانتوں سے کاٹ ڈالا۔

پکھراج کی تمام تر مزاحمت دم توڑنے لگی۔ وہ رشید کے آگے گڑگڑانے لگی۔ منتیں کرنے لگی تب وہ وحشت زدہ غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”سالی روزانہ بن سنور کر آتی تھی۔ اپنے حسن کی جھلکیاں دکھا کر راتوں کی نیند حرام کر دی۔ آج ہاتھ لگی ہے تو میں کیوں پیاسا رہوں۔“

اور پھر وحشت کی شیطانی تکمیل کے ہوتے ہی پکھراج ہوش و حواس سے بےگانہ ہو گئی اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اس کے مام اور پاپا اسے ہوش میں آتا دیکھ کر تیزی سے اس کے نزدیک آئے۔ قریب ہی ایک پولیس انسپکٹر بھی کھڑا تھا۔ وہ بھی تیزی سے نزدیک آیا۔

پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ اذیت‘ وہ دکھ‘ وہ تکلیف‘ وہ بےعزتی اس نے ایک چیخ ماری اور رونے لگی۔

پولیس انسپکٹر آگے بڑھا تو ڈاکٹر نے اسے روک دیا کہ پہلے ان کا چیک اپ ضروری ہے ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد پیشنٹ کا بیان لے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نے اسے مزید ذہنی سکون کے انجکشن دیے۔ وہ غنودگی میں جانے لگی تو انسپکٹر نے ڈاکٹر پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر آپ نے انہیں پھر نیند کا انجکشن دے دیا۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے یہ اب ہوش میں آئی تھیں تو ان کا بیان تو لینے دیا ہوتا۔ مجرم تو اب نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوگا۔ ہمیں اس کے بارے میں یہی بتا سکتی تھیں۔“

”مجرم کو پاتال سے ڈھونڈ نکالنا آپ کی ذمہ داری ہے انسپکٹر اور میری ذمہ داری اپنی پیشنٹ کی صحت یابی ہے۔ آپ نے ان کی ذہنی حالت دیکھی تھی۔ اس حالت میں کس طرح بیان دے سکتی تھیں۔ آپ ایک دو گھنٹے مزید ویٹ کریں۔ اب جب انہیں ہوش آئے گا تو یہ پہلے سے بہتر حالت میں ہوں گی۔ پھر آپ ان کا بیان لے سکتے ہیں۔“

”اس کے ساتھ یہ سب اس کے آفس میں ہوا ہے۔ آپ آفس میں جا کے پتا تو کریں۔“ جبار توفیق نے ناراض لہجے میں کہا۔ اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کاش وہ شخص اس کے سامنے آ جائے تو وہ اپنے ہاتھ سے......!

”آپ بالکل بےفکر رہیں جناب ہم پوری تحقیقات کر رہے ہیں۔ بس ہمیں محترمہ کا بیان لینا ہے۔ تاکہ مجرم کا چہرہ بےنقاب ہو سکے پھر تو وہ کہیں بھی چلا گیا ہو۔ ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔“ انسپکٹر نے جواب دیا اور روم سے باہر چلا گیا۔

پکھراج کی مما مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ ایک تو بیٹی کی عزت داغ دار ہو گئی دوسرے اس وحشی نے جو سلوک اس کے ساتھ کیا تھا وہ کم از کم کوئی انسان نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھا اور اس نے ایسا سلوک پکھراج کے ساتھ کیوں کیا۔

”میں تو پہلے ہی اس کے جاب کرنے کے خلاف تھا۔ اس پر ہی ایڈونچر کا شوق سوار تھا۔ کر لیا اس نے اپنا شوق پورا لے لیا مزہ ایڈونچر کا۔ جب یہ بات ہمارے حلقۂ احباب میں پھیلے گی تو کیا عزت رہ جائے گی ان لوگوں کے سامنے ہماری۔ پولیس کیس بن گیا ہے اور یہ واقعہ ہوا بھی فرم کے اندر ہے ہم اس بات کو پھیلنے سے روک بھی نہیں سکتے۔ آج صبح تمام اخبارات اور نیوز چینل پر یہ خبر آ چکی ہے مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ انگلیاں اٹھائیں گے کہ کیا ضرورت پڑی تھی بیٹی کو جاب کروانے کی۔“ جبار توفیق چیخ چلا کر اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ بیوی پہلے ہی پریشان ہو رہی تھی۔ شوہر کی باتیں سن کر اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی۔

پکھراج چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ ہوش میں آ گئی۔ وہ چپ چاپ لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ ماں

اوئے تسی کتھے

ایک دفعہ ہمیں سابقہ یا سابق ٹیسٹ کرکٹر نذر محمد کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے اپنی ذاتی اور کھلاڑیانہ زندگی کے بہت سے واقعات سنائے مگر ایک واقعہ ایسا تھا کہ آج تک ان کی چھیڑ بنا ہوا تھا‘ کہنے لگے۔

1951ء میں پاکستان ایگلٹس کے ساتھ ولایت کے دورے پر تھے۔ وہاں ایک میچ کا پروگرام تبدیل ہو گیا۔ گلوسٹر شائر کے بجائے ہم داروک شائر کے ساتھ میچ کھیل رہے تھے۔ میں نے کوئی سونات آؤٹ کیا ہوا تھا۔ شہاب میرے ساتھ کھیل رہا تھا...... ٹی ٹائم پر ہم پویلین میں واپس آئے تو ٹام گریونی وہاں آیا ہوا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ ہمارا میچ تبدیل ہو گیا ہے چنانچہ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے...... ہیلو نذر...... ہیلو شہاب! اوئے تسی کتھے!

یہ اوئے تسی کتھے؟ اردو کا...... ارے تم کہاں...... ہوتا ہے۔ آج تک ہم لوگ نذر صاحب سے یہ پوچھا کرتے ہیں کہ گریونی نے ایسی اچھی پنجابی کہاں سے سیکھی تھی۔

(انتخاب کیا ہے امجد اسلام امجد صاحب کی کتاب شہر در شہر سے)

نے پیار سے اس کے بال سہلاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ ”وہ کون تھا جس نے اس کی یہ حالت بنائی ہے۔“ تو وہ دوبارہ ماں کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔

رونے کی آواز کمرے سے باہر گئی تو وہاں موجود انسپکٹر اندر آ گیا اور وہ پکھراج کے چپ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب پکھراج خاموش ہوئی تو انسپکٹر نے اس سے بات کی تو اس نے ساری بات انسپکٹر کو بتائی۔

”کیا وہ تمہارے آفس کا پیون تھا۔“ جبار توفیق مارے غصے کے کانپنے لگا۔

”انسپکٹر پلیز آپ اس پیون کو جلد از جلد گرفتار کریں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ اس کی سات پشتوں سے گنے نہیں جائیں گے۔“

”آپ بے فکر رہیں وہ سالا بھاگ کر جائے گا کہاں!“ انسپکٹر نے پرسوچ لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

......☆☆☆......

اس رات جب پکھراج گھر نہیں پہنچی تو اس کے والدین نے پہلے تو یہ سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کسی فرینڈ کے گھر چلی گئی ہوگی۔ یا باہر دوستوں کے ساتھ ڈنر کا پروگرام بن گیا ہوگا۔ مگر خلاف معمول جب زیادہ رات گزر گئی اور پکھراج کا کوئی فون بھی نہیں آیا تو انہیں تشویش ہوئی کیوں کہ دیر سے گھر واپس آنے کی صورت میں وہ ہمیشہ اپنی ماما کو فون کر کے بتادیا کرتی تھی۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ خود بار بار اس کے سیل فون پر ٹرائی کرتے رہے مگر بیل بجتی رہی اور فون ریسیو نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کی تمام دوستوں کے گھر فون کرلیے مگر کہیں سے تسلی بخش جواب نہیں ملا۔

جاگتے ہوئے اور مختلف جگہوں پر فون کرتے ہوئے ساری رات بیت گئی۔ مگر انہیں اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

چوکیدار باہر موجود تھا۔ پیون رشید جاتے ہوئے اس سے کہہ کر گیا تھا کہ سب لوگ جاچکے ہیں میں بھی اپنے گھر جارہا ہوں۔

دوسرے دن آفس میں لوگ آئے تو انہیں پکھراج اپنی تباہ حالی کے ساتھ بے ہوش ملی اور یہ خبر اس کے والدین کو ملی۔

چوکیدار کے پوچھنے پر پولیس کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آفس سے آخر میں جانے والا شخص رشید تھا۔ پھر اس کے بعد نہ کوئی اور آیا نہ گیا۔ اسے کچھ نہیں پتا کہ اندر کیا ہوا ہے۔

پولیس نے چوکیدار کو بھی گرفتار کیا۔ مگر دوسرے دن رشید آفس نہیں آیا اس لیے وہ بھی پولیس کے شک کے دائرے میں تھا اور اس کی غیر موجودگی اس پر شک کو تقویت دے رہی تھی اور اس شک کو یقین میں پکھراج کے بیان نے بدل دیا۔

اس کوٹھری میں پولیس نے چھاپا مارا مگر وہ وہاں نہیں ملا اس کے بارے میں یہ بات چوکیدار اور فرم والوں سے پتا چلی کہ وہ پنجاب کے ایک گاؤں سے نوکری کرنے کے لیے آیا تھا اور یہاں تنہا ہی رہتا تھا۔

پولیس کو یقین ہوگیا کہ وہ ضرور پنجاب اپنے گاؤں بھاگ گیا ہوگا۔ پولیس بسوں کے اڈے پر پہنچی اور رشید کی تلاش شروع کردی بالآخر ایک بس میں سوار ہوتے ہوئے رشید پکڑا گیا۔

اس نے پولیس کی مار سے پہلے ہی اپنے جرم کا اقرار کرلیا اور اپنے بیان میں کہا۔

”میں کیا کرتا‘ مجبور تھا۔ یہ جوان لڑکیاں اور عورتیں بن سنور کر باہر نکلتی ہیں۔ ان کا نوخیز اور جوان حسن دیکھ کر ہم مردوں کی نفسانی خواہشات بھڑکتی ہیں۔ یہ تو خود دعوت دیتی ہیں کہ ہمیں دیکھو ہم کتنے حسین ہیں کتنی جوانی اور لذت ہے ہمارے اندر......!

وہ خود شریف لڑکی نہیں تھی۔ میں اس کے حسن کو دیکھ کر اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس روز جب وہ آفس میں اکیلی رہ گئی تو میں اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔

میں تمام عورتوں کو ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اے مسلمان عورتوں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے یوں اپنے آپ کو بے حجاب کر کے مردوں کو امتحان میں نہ ڈالو۔

اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کو مانو اور حیا اختیار کرو۔ میں جوان بیٹیوں کا باپ ہوں۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ میں ان کا سامنا کس طرح سے کروں گا۔ مجھے پھانسی کی سزا دے دو۔ میں جینا نہیں چاہتا مگر اللہ کے واسطے اس بے حیائی اور عورتوں کی بے پردگی کو بھی موت دے دو۔ تا کہ آئندہ دوبارہ نہ کوئی عورت لٹے نہ مرد تنہا قصوروار ٹھہرایا جائے۔

☆......☆

سورۃ النور آیت نمبر 31 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ:۔

”اور اے نبی مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو ظاہر ہوجائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر‘ باپ‘ شوہروں کے باپ اپنے بیٹے‘ شوہروں کے بیٹے‘ بھائی‘ بھائیوں کے بیٹے‘ بہنوں کے بیٹے اپنے میل جول کی عورتیں‘ اپنے ملوک‘ وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہوجائے۔ اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو‘ توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“

اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس لیے اس بات سے روکا ہے تا کہ فساد نہ برپا ہو‘ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے۔ کسی بھی عورت یا لڑکی کو کیا معلوم کہ اس کی زیب و زینت کو دیکھ کر کسی مرد کے دل میں شیطانی خیالات آرہے ہیں۔ شیطان انسان کو ہمیشہ اس کی کمزوریوں سے ہی پکڑتا ہے اور جلد ہی ان کی کمزوریوں کے ذریعے انہیں گرفت میں لے کر گناہ میں مبتلا کردیتا ہے۔

اس کہانی میں رشید اکیلا گناہ گار نہیں تھا۔ پکھراج برابر کی قصوروار تھی۔ نہ وہ انجانے میں بار بار رشید کو گناہ پر اکساتی اور نہ اس کے ساتھ یہ حادثہ پیش آتا۔

آج اس معاشرے میں روزانہ ایسے ہی گھناؤنے واقعات ہو رہے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو بھلا کر مشرکوں‘ یہود اور نصاریٰ کی اندھی تقلید کر رہے ہیں اور اس گمراہی کی اندھی تقلید کو انہوں نے ماڈرن ازم کا نام دے رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت دے‘ اپنی رحمت سے ہمیں شیطان کا آلہ کار بننے سے بچالے اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچائے یہ نہ ہو کہ اپنے گناہوں کے سبب ہم روز قیامت اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نگاہیں نہ ملا پائیں۔

فلاپ ڈرامہ

برادرم عمران احمد،
امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔
طویل وقفہ کے بعد ایک کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ واقعہ اخبارات میں قارئین کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا' مگر اتنی تفصیل قارئین کے سامنے نہیں آئی ہوگی۔ مجھے یہ واقعہ اور ساری تفصیل اس کیس کے تفتیشی افسر نے سنائی جسے میں کہانی کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے یہ آپ کے مزاج پر پوری اترے گی۔

آپ کا اپنا
انور فرہاد
کراچی

منجو رات کے اندھیرے میں بڑی مشکل سے دیوار پھاند کر گھر سے باہر نکلا تھا۔ وہ اس گھر میں داخل بھی اسی طرح ہوا تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر اسی طرح مختلف گھروں میں داخل ہوتا تھا۔ ظاہر ہے جو دروازے کے راستے گھروں میں داخل نہ ہو وہ کسی اچھی نیت سے گھر میں داخل نہیں ہوتا۔ منجو بھی اچھے ارادے سے اس طرح داخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ چور تھا اور چوری ہی کی نیت سے چھپ چھپا کر گھروں میں داخل ہوتا تھا۔ آج جس گھر سے وہ انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں باہر نکلا تھا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے گھر کے کسی فرد نے دیکھ لیا تھا بلکہ اس کی گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ اس نے گھر کے ایک شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے اسے دیکھ کر شور نہیں مچایا تھا بلکہ خود منجو کی چیخ نکل گئی تھی۔ کیونکہ وہ کوئی زندہ سلامت بندہ نہیں تھا۔ بلکہ مردہ حالت میں تھا اور لاش بہت پرانی لگ رہی تھی۔ وہ گرتا پڑتا وہاں سے بھاگا۔ باہر آ کر اس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ کا شکر دل ہی دل میں ادا کیا۔ یہ اس گھر کا پچھواڑا تھا۔ جب بھی وہ کسی گھر سے کچھ حاصل کیے بغیر نکلتا تھا تو اسے بڑا افسوس ہوتا تھا مگر آج خالی ہاتھ لوٹنے پر اسے خوشی ہوئی تھی کہ مولا نے بخیریت لوٹا کر اس پر بڑا کرم کیا ہے۔ وہ کس کا گھر تھا جس میں وہ چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس اس گھر کو مناسب سمجھ کر وہ اس میں داخل ہوگیا تھا۔ دراصل یہ اس کے علاقے کا گھر نہیں تھا کبھی کبھی وہ اپنے علاقے سے باہر جا کر بھی چوریاں کیا کرتا تھا۔ وہ اس اندھیری گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آیا تو اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا ایک کپ چائے پی کر حلق کو تر اور اپنے حواس کو بہتر کرنا چاہیے۔ وہ ایک چھوٹے سے چائے خانے میں داخل ہوگیا۔ ابھی اس نے دو گھونٹ پی کر حلق کو تر ہی کیا تھا کہ "ارے منجو بادشاہ!" کی آواز پر چونک پڑا۔ اس کے سامنے گوتم کھڑا تھا اور پھر بغیر اجازت لیے وہ منجو کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت چائے خانے میں اِکا دُکا لوگ ہی تھے۔

"کیا بات ہے' آج تُو تفریح کر رہا ہے؟ دھندے پر نہیں گیا؟" گوتم نے بیٹھتے ہی سوال کر دیا تھا۔ منجو نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

"چائے پیے گا؟"

"ابے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

گوتم جس کا اصل نام گلزار تھا۔ مگر وہ گوتم کے نام ہی سے اپنے حلقہ احباب میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ منجو کا ہم شرب اور ہم پیشہ تھا۔ وہ بھی چوریاں کیا کرتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا گوتم کو اس گھر کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ بتانا چاہیے یا نہیں کہ گوتم ہی بول پڑا۔

"اگر تیرا اس تفریح کے بعد کچھ کرنے کا ارادہ ہے تو چل آج دونوں مل کر کچھ کرتے ہیں۔" اور منجو کے جواب سے پہلے خود ہی بولا۔

"ایک گھر میری نظر میں ہے شاید اس کا رہائشی کہیں گیا ہوا ہے۔ اطمینان سے اس کے سامان پر ہاتھ پھیر دیں گے۔"

"تجھے یقین ہے کہ اس گھر میں کوئی نہیں ہے؟"

"یقین ہے جبھی تو کہہ رہا ہوں۔ میں نے کئی دنوں تک دن کے وقت باہر سے اس کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ گھر؟" اور جب گوتم نے اس گھر کا حدود اربعہ بتایا تو منجو کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ گرتے گرتے بچا۔ "ارے باپ رے وہ گھر۔" اس کے منہ سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"کیوں کیا ہوا اس گھر کو؟ کیا تو اس گھر کے لوگوں کو جانتا ہے؟"

منجو نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جب تک اس کے اعصاب اس کے قابو میں نہیں آئے خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے گوتم کو سب کچھ بتا دیا۔ منجو کی باتیں سن کر اس نے کہا۔

"کیا تو سچ بول رہا ہے؟"

"یقین نہیں آتا تو خود جا کر دیکھ لے۔"

"میرا مطلب ہے' جسے تو نے دیکھا وہ کسی کی لاش تھی؟"

"سو فیصد لاش تھی۔ مسخ شدہ پرانی لاش۔ میں نے اپنے موبائل فون کی روشنی میں اچھی طرح سے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کا دوسرا بڑا ثبوت اس کے پاس سے اٹھنے والی سڑاند تھی۔"

تھوڑی دیر تک دونوں گم صم بیٹھے رہے پھر گوتم بولا۔

"اچھا ہوا تجھ سے اس گھر کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ وہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کس کی لاش ہے؟" اتنا کہہ کر وہ ذرا کا پھر پرخیال انداز میں کہا۔

"یار! ایسی لاش جس کی تدفین نہ ہونا ہے اس کی روح وہیں منڈلاتی رہتی ہے۔ اگر اس کا بھوت......!
میرا مطلب ہے اس کی بدروح......!"

"صاحب جی! اب جائیں ہم ہوٹل بند کریں گے۔" چائے خانے کے بیرے نے سامنے آ کر کہا۔ تو گوتم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ چائے خانے سے باہر آ کر گوتم بولا۔

"اس لاش کی اطلاع تھانے میں دے دینی چاہیے۔"

"اور تھانے والے اطلاع دینے والے ہی کی گردن پکڑ لیں گے۔" منجو نے کہا۔

"نا بابا نا' میں تو ایسی حماقت نہیں کرتا۔ وہ جس کی بھی لاش ہے پڑی رہے اس گھر میں۔ جہاں اتنے دنوں سے پڑی ہے وہاں اور کچھ دنوں تک پڑی رہے۔ اپنا کیا بگڑتا ہے۔"

اگلے روز منجو نے تو اس لاش کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیا تھا مگر گوتم کے اعصاب پر وہ لاش بدستور سوار تھی۔ وہ سوچ رہا تھا جو کچھ منجو بادشاہ نے کہا ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست مگر پولیس کو اطلاع دینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی جا کر رپورٹ لکھوائے اور بھی تو طریقہ ہے اور کچھ سوچ بچار کے بعد اس نے موبائل

فون سے علاقے کا نمبر ملا کر بناوٹی آواز میں کہا۔
"سنتری بادشاہ! ذرا کاغذ قلم نکالو۔"
"کیوں کیا بات ہے؟"
"ایک پتا آپ کو لکھوانا ہے۔"
"اچھا بولو کیا پتا ہے؟"
گوتم نے اس مصنوعی آواز میں اس گھر کا مکمل پتا لکھوا دیا پھر بولا۔
"سنتری بادشاہ! اس گھر میں آپ لوگوں کے لیے ایک تحفہ موجود ہے جا کر وصول کر لیجیے۔"
"کیسا تحفہ؟" پراشتیاق انداز میں پوچھا گیا۔
"ایک لاش......!"
"تم کون ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟"
"سفید چور......!"
"یہ کیا بکواس ہے؟" مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا کیوں کہ رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ تھانے دار نے جھلا کر ماؤتھ پیس کو دیکھا اور غصے سے اسے رکھ دیا۔ دوسری طرف گوتم نے اپنے موبائل سے سم نکال کر اسے ایک طرف اچھال دیا۔ یہ چرایا ہوا موبائل فون تھا۔
"سر کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟" سب انسپکٹر ارشاد نے پوچھا۔
"کوئی مسخرہ تھا۔ اب لوگوں نے پولیس سے بھی مخول کرنا شروع کر دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فون پر کہی ہوئی ساری بات بتا دی اور آخر میں کہا۔ "میں نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ تو جانتے ہو اس نے کیا کہا؟"
"کیا کہا۔"
"سفید چور۔"
سب انسپکٹر ارشاد مسکرایا۔ "وہ کالے چور کا محاورہ ہے نا سر! اس مخبر نے اس کی مناسبت سے اپنے آپ کو سفید چور کہا ہے۔" پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔
"اب آپ کیا کریں گے؟"
"اس سفید چور کو پکڑیں گے اس کا کھوج لگائیں گے اس کا نمبر ہمارے فون پر محفوظ ہے۔"
"نہیں سر! یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں اصل مسئلہ اس لاش تک پہنچنے کا ہے۔ اگر کسی نے ہمیں اطلاع دی ہے تو یقیناً اس گھر میں لاش ہو گی۔" اتنا کہہ کر وہ رکا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔
"لوگ ہم لوگوں سے اسی لیے تعاون نہیں کرتے کہ ہم انہیں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس کا جو نمبر آپ کے فون پر محفوظ ہو گیا ہے اس سے ہم کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔"
"تمہارا مطلب ہے ہم اس سفید چور کو چھوڑ کر اس لاش کا اتا پتا لگائیں۔"
"یس سر یہی میرا مقصد ہے۔"
"تو پھر تم ہی جاؤ یہ لو پتا اور اپنے ساتھ جس کو لے جانا چاہو لے جاؤ۔"
تھوڑی دیر کے بعد سب انسپکٹر ارشاد چند ساتھیوں کو لے کر مطلوبہ پتے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ پولیس کو وہاں دیکھ کر ارد گرد کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ "کس کا مکان ہے؟ یہاں کون رہتا ہے؟" انسپکٹر نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔
"اس وقت تو شاید اس مکان میں کوئی نہیں ہے۔" ایک بندے نے کہا۔
"البتہ یہاں سوجل شاہ رہتا تھا۔"
"یہ سوجل شاہ کون ہے؟ اور اب وہ کہاں چلا گیا ہے؟"
"وہ ایک عامل ہے۔" اس شخص نے کہا۔ "دو تین مہینے سے یہ گھر بند ہے۔ پتا نہیں گھر میں تالا ڈال کر کہاں چلا گیا۔"
"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس گھر میں ایک لاش موجود ہے۔"
"لاش......!" کئی حیرت میں ڈوبی آوازیں ایک ساتھ سنائی دی تھیں۔ پھر کسی نے کہا تھا۔
"کس کی لاش؟"
"یہ تو اس گھر میں داخل ہونے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔"
اور پھر محلے والوں کی مدد سے پولیس نے اس گھر کا تالا توڑ دیا۔ دو تین کمروں پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ بہت دنوں تک بند رہنے والے گھر میں جس طرح کی ایک گھٹن کا احساس ہوتا ہے یہاں بھی اس طرح محسوس ہوا تھا۔ کمروں میں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں موجود تھیں۔ پھر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ایک طرح کی بدبو محسوس کی جانے لگی اور پھر ایک کمرے میں انہیں واقعی ایک لاش مل گئی۔ جو خاصی پرانی لگ رہی تھی اور اس طرح مسخ ہو چکی تھی کہ اس کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے والوں نے فوراً ہی اپنی ناکوں پر رومال رکھ لیا تھا۔ کیونکہ لاش سے بڑی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ سب انسپکٹر ارشاد نے اس کمرے سے باہر جا کر اپنے موبائل فون سے تھانے دار کو لاش کی دستیابی اور اس کی کیفیت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ متعلقہ تفتیشی عملے کو اس پتے پر بھیجیں۔ پھر کمرے میں واپس آ کر ان محلے والوں سے مخاطب ہوا جو پولیس کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے۔
"یہ کس کی لاش ہے آپ لوگ کچھ بتا سکیں گے؟"
"لاش اس بری طرح مسخ ہو چکی ہے کہ اس کی شناخت کرنا بہت مشکل ہے۔"
"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ آپ لوگ لاش سے متعلق کچھ ایسی چیزوں پر توجہ دیں جن سے لاش کی شناخت میں مدد ملے۔ میرا مطلب ہے کچھ ایسی چیزیں جو جانی پہچانی ہوں یا دیکھی ہوئی معلوم ہوں۔"
"دراصل اس سڑاند میں کھڑا ہونا ہی دشوار ہے۔" ایک شخص بولا۔ "ایسے میں کچھ سوچنا سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔"
"وہ...... وہ......!" ایک دوسرا شخص لاش کے قریب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"وہ دیکھیے وہ بڑے بڑے منکے جو ٹوٹ کر لاش کے قریب بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی بڑے منکوں کی مالا سوجل شاہ کے گلے میں رہتی تھی۔" دوسرے محلے دار نے بھی ان منکوں کو دیکھا اور پہچانا۔
"ہاں ہاں یہ موٹے موٹے منکے تو سوجل شاہ کی مالا ہی کے لگتے ہیں۔ مگر مالا ٹوٹی ہوئی ہے اور اس کے گلے میں نہیں ہے۔"
"شاید قاتل سے دھینگا مشتی کے وقت مالا ٹوٹ گئی ہو اور اس کے منکے بکھر گئے ہوں۔" ایک اور بندے نے خیال ظاہر کیا۔
"اگر آپ لوگوں کے مطابق یہ سوجل شاہ کی ہی لاش ہے تو اسے کون قتل کر سکتا ہے؟"
"اللہ اس کی مغفرت کرے۔" ایک بڑے میاں بولے۔ "وہ اچھا آدمی نہیں تھا اسے کوئی بھی قتل کر سکتا ہے۔ اس کی بہت سے لوگوں سے دشمنی تھی۔"
"دشمنی کی وجہ؟"
"وہ حقیقتاً دو نمبر کا عامل تھا۔ لوگوں سے پیسے لے لیتا تھا مگر ان کا کام تشفی بخش طریقے پر نہیں کرتا تھا۔"
ذرا دیر بعد تھانے کا متعلقہ تفتیشی عملہ آ گیا جو لاش کی تصویریں لینے کے علاوہ دیگر ضروری کارروائیوں میں

مصروف ہوگیا۔ اس دوران انسپکٹر اور اس کے ساتھی گھر کی مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے اس سلسلے میں انہیں ایک خط ملا جس کے پوسٹ کیے جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ خط پر نواب شاہ کا پتا تحریر تھا اور کسی شمشاد علی کا نام لکھا تھا۔ انسپکٹر نے لفافہ چاک کر کے اندر سے لکھا ہوا خط نکالا خط کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

"بیٹے شمشاد علی! میں تم سے اور تمہاری والدہ سے معافی کا طلب گار ہوں اور اپنی بے راہ روی سے توبہ کر کے تم لوگوں کے پاس آنا اور رہنا چاہتا ہوں میرا موجودا دھندہ کسی دن میرے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے گا۔ اگر تمہاری ماں مجھے معاف کر دے تو میں تم لوگوں کے ساتھ باقی زندگی ایک بھلے مانس کی طرح گزارنے پر تیار ہوں۔ میرا خط پڑھ کر تمہیں غصہ تو آئے گا۔ میں تمہارا اور تمہارے بھائی بہنوں کا بھی مجرم ہوں کہ میں نے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے پر نہیں نبھائیں اور تم لوگوں کے لیے مسئلہ بنا رہا۔ مگر امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے اس خط کو پڑھ کر جواب دینے میں دیر نہ کرنا۔

فقط

تمہارا گناہ گار باپ

سجاد علی

اس خط کو پڑھ کر بات کچھ اور واضح ہوگئی تھی۔ لاش دیگر ضروری کارروائی کے لیے متعلقہ اسپتال پہنچائی گئی۔ لوگ سوجل کی اس طرح واقع ہونے والی موت کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گھر سے نکل گئے جب کہ سب انسپکٹر نے تھانے پہنچ کر تھانے دار کو خط اور اس پر لکھا ہوا پتا دکھا کر کہا۔ "یہ خط مقتول نے غالباً اپنی موت سے کچھ پہلے لکھا تھا جسے پوسٹ کرنے کی اسے مہلت نہیں ملی اور وہ قتل کر دیا گیا۔"

"یہ خط ہمارے لیے بہت کارآمد ہے۔ اس پر لکھا پتا جس تھانے کی حدود میں آتا ہے وہاں فون کر کے اس شمشاد علی کو ہم سے ملنے کے لیے کہو اور ایسا ہی کیا گیا۔ شمشاد علی پہلی فرصت میں نواب شاہ سے حیدر آباد آ گیا تھا۔ اسے اس کے باپ کے مرنے کی اطلاع دی گئی تو اسے کوئی افسوس نہیں ہوا۔

"سر جی! وہ تو ہمارے لیے بہت پہلے ہی مر گئے تھے۔" اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اسے اس کے نام لکھا ہوا خط دیا گیا۔ اسے پڑھ کر اس نے جیب میں رکھ لیا۔ اب بھی اس کے چہرے سے کسی دکھ یا صدمے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"پوسٹ مارٹم کے بعد میت آ گئی ہے۔ تم ایک نظر دیکھ کر اس بات کی تصدیق کر دو کہ یہ تمہارے باپ کی لاش ہے۔"

"آپ لوگوں نے اسے شناخت کرنے کے بعد ہی مجھے بلایا ہوگا۔ پھر اب مزید شناخت کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم ایک نظر دیکھ تو لو۔"

"دکھایئے کہاں ہے لاش؟"

میت اسپتال کے سرد خانے میں تھی۔ شمشاد علی کو دکھائی گئی تو اس نے کہا۔ "اس میں تو پہچاننے کی اب کوئی چیز ہی نہیں رہی بری طرح مسخ ہو چکی ہے۔"

"ذرا غور سے دیکھو۔ شاید کوئی چیز شناخت کے قابل ہو۔"

شمشاد بڑی ناگواری کی حالت میں وہاں کھڑا تھا اور اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہاں سے ہٹ جائے۔ اس کے باوجود اسے مزید رکنا پڑا اور اسے گلی سڑی میت پر گہری نظر ڈالنی پڑی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"یہ جو انگلیوں کی ہڈیوں میں بڑے نگوں کی چند انگوٹھیاں نظر آ رہی ہیں۔ یہ تو ویسی ہی ہیں جیسی وہ اپنی انگلیوں میں پہنا کرتے تھے۔"

پولیس کو مرنے والے کے بیٹے کی طرف سے بھی ایک ثبوت کے ذریعہ تصدیق کر دی گئی تھی کہ یہ میت سوجل شاہ کی ہی ہے۔ شمشاد علی جانے لگا تو اس سے کہا گیا۔

"تم اپنے باپ کی میت تدفین کے لیے لے جا سکتے ہو۔"

"ہم نے جب انہیں ان کی زندگی میں قبول نہیں کیا تھا تو اب انہیں اس حالت میں کیسے لے جائیں؟ ہمارا ان سے نہ تب کوئی رشتا تھا نہ اب ہے۔ آپ لوگ جو چاہے اس میت کے ساتھ کیجیے۔"

بہر حال اسے تھانے لا کر کچھ کاغذات پر دستخط کروا لیے گئے کہ یہ مسخ شدہ لاش اس کے باپ سجاد علی عرف سوجل شاہ ہی کی ہے۔ "یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ مرنے والا سوجل شاہ ہی تھا۔" انسپکٹر نے تھانے دار سے کہا۔ "اب آگے کا کیا پروگرام ہے؟"

"آگے کا کیا پروگرام ہوگا؟ اس کیس میں مزید سر کھپانے کا کیا فائدہ؟"

"فائدہ یا نقصان کی بات نہیں سر! مرنے والا مقتول تھا۔ اس لیے اس کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ تو ہمیں لگانا ہی پڑے گا۔ وہ چاہے جیسا ہی آدمی رہا ہو۔ ہمارا فرض تو یہی ہے کہ قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے تک پہنچایا جائے۔"

"تم اگر ایسا چاہتے ہو تو یہ ذمہ داری بھی تم ہی قبول کرو۔"

اور سوجل کے قتل کی تفتیش کی ذمہ داری باضابطہ طور سب انسپکٹر ارشاد ہی کو سونپ دی گئی۔ شمشاد علی نے گھر جا کر ماں اور بہن بھائیوں کو باپ کے مرنے کی

ردی تو ان پر بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ صفیہ بی بی نے برجستہ کہا۔ ”خس کم جہاں پاک۔“ اور جب مشاد نے بتایا کہ کوئی ڈھائی تین مہینے پہلے انہیں کسی نے ان کے گھر میں قتل کردیا تھا اور اب جو میت ملی ہے وہ سڑی گلی اور بدبودار ہے اور شناخت کے قابل نہیں رہی ہے تو اس کی ماں نے کہا۔ ”برے کا برا ہی انجام ہوتا ہے۔“ ذرا دیر بعد بیٹے نے جیب سے باپ کا خط نکال کر ماں کو دیا۔ جو غالباً موت سے کچھ پہلے لکھا گیا تھا اور جسے پوسٹ ہونا نصیب نہیں ہوا۔ خط پڑھ کر صفیہ بی بی کو پہلی بار افسوس ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اگر یہ خط مل جاتا تو شاید میں اسے معاف بھی کردیتی اور اپنے پاس رہنے کی اجازت بھی دے دیتی۔“ مگر اس جذبے کا اظہار انہوں نے بچوں کے سامنے نہیں کیا۔ بچوں سے بولیں۔

”ان کو ان کے گناہوں کی سزا تو ملنی چاہیے تھی نا۔ سو مل گئی۔ تنہائی میں دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے اور میت بے گوروکفن گلتی سڑتی رہی۔“

پاس پڑوس کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ صفیہ بی بی بیوہ ہوگئی ہیں تو کچھ خواتین ان سے پرسے کے لیے بھی آئیں اور ان سے عدت کے لیے بھی کہا۔

”عدت کس بات کی؟“ صفیہ بی بی نے بے دلی سے کہا۔ ”وہ تو ہمارے لیے بہت پہلے مر گیا تھا۔ مہینوں برسوں سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی ہمیں۔ میں اس کے سوگ میں کیوں عدت میں بیٹھوں۔“ اور وہ واقعی عدت میں نہیں بیٹھی۔ مگر عجیب بات تھی کہ اندر سے وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی ان کا دل بے طرح گھبراتا اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے اس گھر سے کہیں اور چلی جائیں اس گھر سے مرنے والے کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ ابتدا ہی سے تو ایسا نہیں تھا۔ انہیں خیال آیا کہ بہت دنوں سے وہ اپنے عزیزوں سے نہیں ملی ہیں۔ جب سے سجاد گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا وہی بچوں کی سرپرست اور نگراں تھیں اور ان کی پرورش و پرداخت ان کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے نواب شاہ سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ کراچی میں ان کی پھوپی اور ان کے بچے رہتے تھے۔ وہ اکثر بلاتے بھی تھے۔ اس لیے ایک دن وہ دو چھوٹے بچوں کو بغل میں دبا کر کراچی روانہ ہوگئیں۔ جاتے وقت کہا۔

”میں چند دنوں کراچی میں رہ کر واپس آجاؤں گی۔“

کراچی میں ان کی پھوپی ہی نہیں رہتی تھیں دور اور نزدیک کے بہت سے عزیز و اقارب آباد تھے۔ وہ پھوپی کے گھر آ تو گئی تھیں مگر یہاں آکر بھی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے دل کو سکون نہیں ملا ہے۔ وہی دل کی ویرانی، وہی طبیعت کی پریشانی انہوں نے اس کیفیت سے اپنے آپ کو نجات دلانے کے لیے اِدھر اُدھر جانا شروع کردیا۔ ان کی پھوپی نے بھی کہا۔

”اتنے دنوں کے بعد کراچی آئی ہو اس لیے سارے لوگوں سے جا کر ملاقات تو کرلو۔“ اس موقع پر صفیہ بی بی کو یہ بھی خیال آیا کہ آج کے اس مہنگائی کے دور میں میزبان پر غالباً مہمان بھی بوجھ ہوتا ہے۔ مگر اس بات پر انہوں نے دل چھوٹا نہیں کیا۔ خود ان کا دل بھی ایک جگہ رہنے کو نہیں چاہتا تھا اس لیے انہوں نے مختلف عزیزوں کے ہاں دو دو تین تین دنوں کے لیے رہنا شروع کردیا۔ اس دوران ایک دن صفیہ بی بی سرجانی ٹاؤن کے دور افتادہ علاقے خدا کی بستی سے گزر رہی تھیں کہ ایک ویلفیئر سوسائٹی کے ”کھانا گھر“ کے پاس لائن میں کھڑے کسی کو دیکھ کر

چونک پڑیں۔ اس کھانا گھر میں دو روپے کا ایک نان ملتا تھا جب کہ سالن مفت دیا جاتا تھا۔ یہ علاقہ انتہائی غریب لوگوں کا ہے اس لیے اس ویلفیئر سوسائٹی سے بہت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر پیٹ بھر کر کھاتے بھی ہیں اور گھر بھی لے جاتے ہیں۔ صفیہ بی بی اس ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے اسپتال سے دوائی لینے آئی تھیں۔ ان کی پھوپی زاد بہن کی نند نے ان سے کہا تھا کہ یہاں کا علاج بہت اچھا ہے جب کہ فیس برائے نام ہے۔ کھانا گھر اس اسپتال کے قریب ہی تھا۔ صفیہ بی بی نے برقع میں اپنا منہ اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ اس لیے ان کے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ وہ لائن میں کھڑے لوگوں کے پاس سے گزری تھیں۔ وہاں سے اسپتال جا کر اور اسپتال سے گھر آکر وہ دیر تک سوچتی رہیں اور دل ہی دل میں کہتی رہیں۔

”نہیں، نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے......!“ مگر اس شکل و صورت نے ان کے اندر کی بے چینی اور بے قراری میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ وہ وہاں سے پھوپی کے گھر ملیر واپس آگئیں مگر وہ صورت ان کی نگاہوں کے سامنے گھوم پھر کر آتی رہی۔ آخر انہوں نے اپنے بیٹے شمشاد علی کو موبائل فون پر اس صورت حال سے آگاہ کیا۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے امی۔“

”میرا تو خیال ہے میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“ ماں نے بیٹے کو یقین دلانے کی بڑی کوشش کی۔ جب کہ بیٹا کسی صورت یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بہر حال اس نے ماں کی ضد پر تھانے جا کر اس بات کا ذکر کیا۔

”کوئی اور شخص ہوگا بھائی!“ تمہاری امی کو مغالطہ ہوا ہے۔“

”میری والدہ نے جس شک شبہ کا ذکر کیا میں نے آپ کو بتا دیا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی۔“ کہہ کر شمشاد علی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تھانے میں تھوڑی دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ مگر کسی کے حلق کے نیچے یہ بات نہیں اترتی تھی۔ سب نے اس خیال کو رد کردیا۔ مگر سب انسپکٹر ارشاد اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس بات کا اظہار اس نے کسی سے نہیں کیا۔ وہ بس سوچتا رہا۔ جہاں 99 فیصد بات ممکن نظر نہیں آتی وہاں ایک فیصد ہو بھی تو سکتی ہے۔ اسی دوران عجیب اتفاق ہوا۔

کراچی سے اس کے دوست رضوان علی کے بیٹے کے ولیمے کا کارڈ آیا جس میں لکھا تھا تم نہیں آؤ تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ شادی بیاہ کی تقریبات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عام طور پر وہ ایسی تقریبوں کو تضیع اوقات سمجھ کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اس بار بھی اس نے یہی کیا۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رضوان کی ناراضگی وقتی ہوگی۔ بعد میں اسے منا لوں گا۔ مگر کچھ دیر بعد کچھ سوچ کر اس نے اچانک کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ رضوان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

”اگر تو نہیں آتا تو میں حیدر آباد جا کر تیرے تھانے میں تجھے گولی مار دیتا۔“

”اسی ڈر سے تو میں آگیا۔“ اور پھر دونوں نے قہقہہ لگایا تھا۔

اور پھر ولیمے کی تقریب سے فارغ ہو کر ایک دن سب انسپکٹر ارشاد سرجانی ٹاؤن خدا کی بستی پہنچ گیا۔ کھانا گھر اسے تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دن کے کھانے کا وقت تھا اور دو روپے کی روٹی، سالن مفت کے لیے لائن لگانے والے بھی اسے نظر آگئے تھے۔ اس نے ذرا فاصلے سے کھڑے

خبر دی تو ان پر بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ صفیہ بی بی نے برجستہ کہا۔ ''خس کم جہاں پاک۔'' اور جب شمشاد نے بتایا کہ کوئی ڈھائی تین مہینے پہلے انہیں کسی نے ان کے گھر میں قتل کردیا تھا اور اب جو میت ملی ہے وہ سڑی گلی اور بدبودار ہے اور شناخت کے قابل نہیں رہی ہے تو اس کی ماں نے کہا۔ ''برے کا برا ہی انجام ہوتا ہے۔'' ذرا دیر بعد بیٹے نے جیب سے باپ کا خط نکال کر ماں کو دیا۔ جو غالباً موت سے کچھ پہلے لکھا گیا تھا اور جسے پوسٹ ہونا نصیب نہیں ہوا۔ خط پڑھ کر صفیہ بی بی کو پہلی بار افسوس ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اگر یہ خط مل جاتا تو شاید میں اسے معاف بھی کردیتی اور اپنے پاس رہنے کی اجازت بھی دے دیتی۔'' مگر اس جذبے کا اظہار انہوں نے بچوں کے سامنے نہیں کیا۔ بچوں سے بولیں۔

''ان کو ان کے گناہوں کی سزا تو ملنی چاہیے تھی نا۔ سو مل گئی۔ تنہائی میں دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے اور میت بے گور و کفن گلتی سڑتی رہی۔''

پاس پڑوس کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ صفیہ بی بی بیوہ ہوگئی ہیں تو کچھ خواتین ان سے پرسے کے لیے بھی آئیں اور ان سے عدت کے لیے بھی کہا۔

''عدت کس بات کی؟'' صفیہ بی بی نے بے دلی سے کہا۔ ''وہ تو ہمارے لیے بہت پہلے مر گیا تھا۔ مہینوں برسوں سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی ہمیں۔ میں اس کے سوگ میں کیوں عدت میں بیٹھوں۔'' اور وہ واقعی عدت میں نہیں بیٹھی۔ مگر عجیب بات تھی کہ اندر سے وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی ان کا دل بے طرح گھبراتا اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے اس گھر سے کہیں اور چلی جائیں اس گھر سے مرنے والے کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ ابتدا ہی سے تو ایسا نہیں تھا۔ انہیں خیال آیا کہ بہت دنوں سے وہ اپنے عزیزوں سے نہیں ملی ہیں۔ جب سے سجاد گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا وہی بچوں کی سرپرست اور نگراں تھیں اور ان کی پرورش و پرداخت ان کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے نواب شاہ سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ کراچی میں ان کی پھوپی اور ان کے بچے رہتے تھے۔ وہ اکثر بلاتے بھی تھے۔ اس لیے ایک دن وہ دو چھوٹے بچوں کو بغل میں دبا کر کراچی روانہ ہوگئیں۔ جاتے وقت کہا۔

''میں چند دنوں کراچی میں رہ کر واپس آجاؤں گی۔''

کراچی میں ان کی پھوپی ہی نہیں رہتی تھیں دور اور نزدیک کے بہت سے عزیز و اقارب آباد تھے۔ وہ پھوپی کے گھر آتو گئی تھیں مگر یہاں آکر بھی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے دل کو سکون نہیں ملا ہے۔ وہی دل کی ویرانی، وہی طبیعت کی پریشانی انہوں نے اس کیفیت سے اپنے آپ کو نجات دلانے کے لیے اِدھر اُدھر جانا شروع کردیا۔ ان کی پھوپی نے بھی کہا۔

''اتنے دنوں کے بعد کراچی آئی ہو اس لیے سارے لوگوں سے جا کر ملاقات تو کرلو۔'' اس موقع پر صفیہ بی بی کو یہ بھی خیال آیا کہ آج کے اس مہنگائی کے دور میں میزبان پر غالباً مہمان بھی بوجھ ہوتا ہے۔ مگر اس بات پر انہوں نے دل چھوٹا نہیں کیا۔ خود ان کا دل بھی ایک جگہ رہنے کو نہیں چاہتا تھا اس لیے انہوں نے مختلف عزیزوں کے ہاں دو دو تین تین دنوں کے لیے رہنا شروع کردیا۔ اس دوران ایک دن صفیہ بی بی سرجانی ٹاؤن کے دور افتادہ علاقے خدا کی بستی سے گزر رہی تھیں کہ ایک ویلفیئر سوسائٹی کے ''کھانا گھر'' کے پاس لائن میں کھڑے کسی کو دیکھ کر

چونک پڑیں۔ اس کھانا گھر میں دو روپے کا ایک نان ملتا تھا جب کہ سالن مفت دیا جاتا تھا۔ یہ علاقہ انتہائی غریب لوگوں کا ہے اس لیے اس ویلفیئر سوسائٹی سے بہت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر پیٹ بھر کر کھاتے بھی ہیں اور گھر بھی لے جاتے ہیں۔ صفیہ بی بی اس ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے اسپتال سے دوائی لینے آئی تھیں۔ ان کی پھوپی زاد بہن کی نند نے ان سے کہا تھا کہ یہاں کا علاج بہت اچھا ہے جب کہ فیس برائے نام ہے۔ کھانا گھر اس اسپتال کے قریب ہی تھا۔ صفیہ بی بی نے برقع میں اپنا منہ اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ اس لیے ان کے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ وہ لائن میں کھڑے لوگوں کے پاس سے گزری تھیں۔ وہاں سے اسپتال جا کر اور اسپتال سے گھر آکر وہ دیر تک سوچتی رہیں اور دل ہی دل میں کہتی رہیں۔

''نہیں، نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے......!'' مگر اس شکل و صورت نے ان کے اندر کی بے چینی اور بے قراری میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ وہ وہاں سے پھوپی کے گھر ملیر واپس آگئیں مگر وہ صورت ان کی نگاہوں کے سامنے گھوم پھر کر آتی رہی۔ آخر انہوں نے اپنے بیٹے شمشاد علی کو موبائل فون پر اس صورت حال سے آگاہ کیا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے امی۔''

''میرا تو خیال ہے میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔'' ماں نے بیٹے کو یقین دلانے کی بڑی کوشش کی۔ جب کہ بیٹا کسی صورت یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بہرحال اس نے ماں کی ضد پر تھانے جا کر اس بات کا ذکر کیا۔

''کوئی اور شخص ہوگا بھائی!'' تمہاری امی کو مغالطہ ہوا ہے۔''

''میری والدہ نے جس شک شبہ کا ذکر کیا میں نے آپ کو بتا دیا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی۔'' کہہ کر شمشاد علی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تھانے میں تھوڑی دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ مگر کسی کے حلق کے نیچے یہ بات نہیں اترتی تھی۔ سب نے اس خیال کو رد کردیا۔ مگر سب انسپکٹر ارشاد اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس بات کا اظہار اس نے کسی سے نہیں کیا۔ وہ بس سوچتا رہا۔ جہاں 99 فیصد بات ممکن نظر نہیں آتی وہاں ایک فیصد ہو بھی تو سکتی ہے۔ اسی دوران عجیب اتفاق ہوا۔ کراچی سے اس کے دوست رضوان علی کے بیٹے کے ولیمے کا کارڈ آیا جس میں لکھا تھا تم نہیں آؤ تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ شادی بیاہ کی تقریبات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عام طور پر وہ ایسی تقریبوں کو تضیع اوقات سمجھ کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اس بار بھی اس نے یہی کیا۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رضوان کی ناراضگی وقتی ہوگی۔ بعد میں اسے منالوں گا۔ مگر کچھ دیر بعد کچھ سوچ کر اس نے اچانک کراچی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ رضوان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

''اگر تو نہیں آتا تو میں حیدرآباد جا کر تیرے تھانے میں تجھے گولی مار دیتا۔''

''اسی ڈر سے تو میں آگیا۔'' اور پھر دونوں نے قہقہہ لگایا تھا۔

اور پھر ولیمے کی تقریب سے فارغ ہو کر ایک دن سب انسپکٹر ارشاد سرجانی ٹاؤن خدا کی بستی پہنچ گیا۔ کھانا گھر اسے تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دن کے کھانے کا وقت تھا اور دو روپے کی روٹی، سالن مفت کے لیے لائن لگانے والے بھی اسے نظر آگئے تھے۔ اس نے ذرا فاصلے سے کھڑے

ہو کر لائن میں لگے لوگوں کا جائزہ لیا۔ مگر اسے کوئی شخص نظر نہیں آیا جو سوجل شاہ کی شکل وصورت کا ہو۔ اس کی موت کے بعد اس کے گھر سے جو چیزیں ملی تھیں ان میں اس کی تصویریں بھی تھیں۔ جنہیں تھانے والوں نے ریکارڈ کے طور پر رکھ لیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ وہاں کھڑا سوچتا رہا۔ پھر لائن کے قریب جا کر اچانک آواز دی۔ ”سجاد علی!“ ایک شخص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ مگر جلد ہی بے تعلق ہو گیا۔ جیسے کسی اور کو پکارا گیا ہو۔ پھر کسی دوسرے شخص نے کہا تھا۔

”یہاں شاید آپ کا مطلوبہ شخص موجود نہیں۔“

”وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ہمیں بتائیں شاید ہم آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”یہاں نہیں ہے تو جانے دیجیے۔“ کہتا ہوا سب انسپکٹر ایک طرف چلا گیا۔ وہ اس وقت سادا لباس میں تھا لیکن وہ کہیں دور نہیں گیا تھا۔ ایک محفوظ جگہ کھڑے ہو کر لائن کے لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ذرا دیر بعد وہ شخص جو سجاد علی کے نام پر چونکا تھا روٹی اور سالن لے کر واپس لوٹا تو بڑا سہما ہوا لگ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر متوحش نگاہوں سے دیکھتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ انسپکٹر ارشاد نے خاصے فاصلے سے اس کا تعاقب کیا۔ تھوڑی دور جا کر وہ شخص ایک جھونپڑی نما گھر میں داخل ہو گیا۔ ذرا توقف سے انسپکٹر اس گھر کے قریب جا کر چٹائیوں سے بنی دیوار سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینے لگا۔

”ارے یار! تو خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا ہے سجاد علی پورے کراچی میں ایک تیرا ہی نام نہیں۔ وہ آدمی کسی اور ہی سجاد علی کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے‘ ایسا ہو تو سکتا ہے مگر مجھے جانے کیوں بڑا ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس بات کا ڈر؟ تُو تو بہت کامیاب ڈراما رچا کر آیا ہے۔“

اس کے بعد انسپکٹر ارشاد نے اندر کی مزید گفتگو سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گھر کے پچھواڑے سے نکل کر سامنے آیا۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا سجاد علی ہی تھا۔ اسے دیکھ کر جس نے سجاد علی کہہ کر آواز دی تھی ایک دم گھبرا گیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”بات یہ ہے سوجل شاہ کہ تمہارا رچایا ہوا ڈرامہ ختم ہو گیا۔ اس کا ڈراپ سین ہو گیا۔“

اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر سب انسپکٹر کے ہاتھ میں دبا پستول دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاید انسپکٹر ارشاد نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی علاقے کے تھانے کا عملہ وہاں موجود تھا۔ سوجل شاہ نقلی عامل اور اس کے ساتھی کو بڑی آسانی سے گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا۔ تھانے جا کر اس نے کوئی شور شرابا نہیں کیا۔ بڑی شرافت سے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہی سجاد علی عرف سوجل شاہ ہے۔

چونکہ یہ کیس حیدر آباد کا تھا۔ اس لیے سب انسپکٹر ارشاد نے ملزم کو حیدر آباد لا کر اپنے تھانے دار کے روبرو پیش کر دیا۔ ”سر جی! یہ رہا مرنے والا سوجل شاہ۔“

”مگر وہ تو......!“

”جی ہاں‘ وہ وہ نہیں جس کا ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ جسے مار کر مارنے والے نے اپنی موت ظاہر کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی تھی اور خود بڑی آسانی سے فرار ہو گیا تھا۔“

”تو پھر وہ کون تھا جس کی مسخ شدہ لاش سوجل شاہ کے حوالے سے ملی تھی؟“ تھانے دار نے پوچھا۔

”یہ تو اب یہی بتائے گا۔“

”کیا تم نہیں جانتے تھے کہ کسی شخص کے قتل کا ارتکاب کتنا سنگین جرم ہے؟“ تھانے دار نے ملزم سے پوچھا۔

”جانتا تھا جی! مگر کیا کروں کبھی کبھی انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ......!“

”مجبوری‘ کیسی مجبوری؟“ پھر خود ہی بولا۔ ”اکثر بندہ خود ہی اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتا ہے۔ تم نے ایسا کیا کام کیا تھا کہ اس قدر مجبور ہو گئے؟“

”آپ درست کہتے ہیں میں نقلی عامل بن کر سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دیتا تھا۔ ایک شخص میرے پاس آیا کہ میری بیوی کو چل کر دیکھ لو۔ اس کی بیوی کو کسی قسم کا دورہ پڑتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ تمہاری بیوی پر ایک جن سوار ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کا جن بھگا دو۔“

جن اتارنے کے بہانے اس کی بیوک کی بے حرمتی کرتا رہا اور اس شخص سے پیسے بھی لیتا رہا۔ یہ شخص اور اس کا خاندان کسی دیہات سے آیا تھا اور بالکل جاہل اور بھولا بھالا تھا۔ میں نے اس شخص سے کہا۔

”جن بڑا زبردست ہے۔ اگر مکمل طور پر اسے مار بھگایا نہیں گیا تو وہ تمہارے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگرچہ میں خاتون کے دورے کی حالت میں بند کمرے میں اس کا جن اتارتا تھا۔ مگر جانے کیسے اسے مجھ پر شک ہو گیا اور ایک دن وہ میرے گھر میں آ کر مجھ سے الجھ گیا کہ تم دھوکے باز ہو اور جن اتارنے کے بہانے میری عزت سے کھیل رہے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا اور اس نے جیب سے چاقو نکال لیا اس وقت میرا دوست جمن بھی میرے پاس تھا۔ ہم دونوں نے بڑی مشکلوں سے اسے قابو میں کیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے مگر وہ چیخنے چلانے لگا کہ میں تمہارے بارے میں سب کو بتا دوں گا کہ تم نقلی عامل ہو‘ اس کا منہ بند کرنے کے لیے ہم دونوں نے جو اقدام کیا۔ اس کے نتیجے میں دم گھٹ کر وہ مر گیا۔“

”ارے یہ کیا ہو گیا۔“ جمن نے گھبرا کر کہا۔ اس پر میں نے کہا۔

”اچھا ہی ہوا یہ مر گیا۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔“

”مگر اب اس کا کریں گے کیا؟“ میرے دوست نے کہا۔

”جمن! ہم دونوں مل کر سوچتے ہیں۔“ اور ہم دونوں نے وہ ڈراما سوچا اور اس پر عمل کیا اور رات کی تاریکی میں خاموشی سے گھر میں تالا لگا کر ہم دونوں غائب ہو گئے۔ ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ ہمارے گھر میں تالا دیکھ کر کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ محلے داروں سے بھی ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ ہمیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ مرنے والے کی گمشدگی پر اس کے گھر والوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ جن نے اسے غائب کر دیا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ جب تک لاش گل سڑ نہیں جائے گی اس وقت تک اس بند گھر پر کوئی توجہ نہیں دے گا مگر......!“ مگر کہہ کر سجاد علی عرف سوجل شاہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”مگر آپ لوگوں کا بھی جواب نہیں کہ ہماری بے حد کامیاب منصوبہ بندی کے باوجود ہمارے ڈرامے کو فلاپ کر دیا اور ہمیں وہاں سے ڈھونڈ نکالا۔ جہاں ہمارے خیال میں کسی کا خیال بھی نہیں جا سکتا تھا۔“

انوکھا بندھن

محترم عمران احمد قریشی'

السلام علیکم!

محبت ایک عظیم جذبہ ہے' زندگی کی معراج ہے یہ واحد جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق خواہ وہ انسان ہو جنات یا جانور سب کو ودیعت کیا ہے مگر فی زمانہ ہم نے اسے مذاق بنا دیا ہے۔ آج اس کے معنی ہی تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ کہانی میری ایک کلاس فیلو کی ہے جو شاعرانہ خیالات کی حامل اور ادب نواز تھی۔ اس کی ادب نوازی اسے تباہی اور بدنامی کے گڑھے کے کنارے تک لے آئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مشعل تباہی سے بچ گئی اور آج سکھی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی داستان لکھوں تاکہ لڑکیاں اس سے سبق سیکھیں اور آنکھیں کھول کر زندگی کی گلیوں میں چلیں۔

والسلام

راوی: زرش

تحریر: مہتاب خان

سائٹ کراچی

وہ طوفانی محبت کا شکار ہوا تھا۔ ایسی محبت جو لمحوں میں بندے کو پچھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ محبت کیسے شروع ہوئی اس کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

اس دن ساحر اپنی لائبریری میں بیٹھا تھا اور اپنے نام آئے ہوئے خطوط پڑھ رہا تھا کہ اسفند آدھمکا۔ اس نے خطوط کا ڈھیر ایک طرف رکھا کیونکہ اب کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا' وہ دونوں بہت گہرے دوست تھے ان کی یہ دوستی بچپن سے اب تک قائم تھی۔ لوگ ان کی دوستی پر اکثر حیران ہوا کرتے تھے کیونکہ ان میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں تھی۔ ساحر انتہائی لاابالی اور کھلنڈری طبیعت کا مالک تھا اور اس پر شوبز سے وابستگی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا' اسے میوزک سے شروع ہی سے لگاؤ تھا اور اس وقت وہ ایک مشہور گلوکار تھا' جسمانی طور سے بھی وہ اسفند کے مقابلے میں دراز قامت اور کھلتے ہوئے رنگ کا مالک تھا جب کہ اسفند کچھ کتابی کیڑا قسم کا انسان تھا وہ کہانیاں وغیرہ بھی لکھا کرتا تھا اور شعر و شاعری سے بھی اسے بہت دلچسپی تھی جسمانی طور پر بھی وہ کچھ کمزور سا تھا۔ وہ کرسی پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کہیں چلتے ہیں یار! میں بہت بور ہو رہا ہوں۔"

"ابھی تو آیا ہے یار! بیٹھ میں تیرے لیے چائے کا کہہ دوں۔" ساحر اٹھتے ہوئے بولا۔

"تو کیا کر رہا تھا؟" اسفند نے پوچھا۔

"یہ کچھ خطوط آئے ہوئے تھے کافی دنوں سے میں نے سوچا کہ آج ہمت کر ہی لوں جواب طلب خطوں کا جواب دے ڈالوں اور باقی کو ان کی اصل منزل تک پہنچا دوں۔" اس نے ردی کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

"لا ادھر دے انہیں' میں بھی تو پڑھوں کتنی حسیناؤں کے خطوط آئے ہیں تیرے نام!" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی' ان دونوں کی دوستی کچھ ایسی ہی بے تکلفانہ تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے خطوط اس کی طرف بڑھائے اور خود کمرے سے چلا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ملازمہ نے چائے لا کر تپائی پر رکھی' وہ واپس کمرے میں آیا تو اسفند بڑے انہماک سے ایک خط پڑھ رہا تھا۔ تپائی پر رکھی ہوئی چائے نہ جانے کب سے پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

"کیا پڑھا جا رہا ہے اتنے غور سے۔" اس کا انہماک دیکھ کر ساحر کو ہنسی آ گئی تھی۔

"تیری کسی فین مشعل کا خط ہے۔ کیا لڑکی ہے یار! بہترین انداز تحریر ہے اس کا اور دیکھ شعر بھی کتنے اچھے لکھے ہیں اس نے تیرے لیے۔ یار! اس لڑکی کو خط لکھنا ہے دیکھ یہاں اس کا ایڈریس بھی موجود ہے۔" اس نے خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"پاگل ہوا ہے کیا! ایسے جذباتی قسم کے خطوط تو نہ جانے کتنے آتے ہیں ان کی جگہ وہاں ہے۔" اس نے ڈسٹ بن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ خط میں لے کر جا رہا ہوں' میں اسے تیری طرف سے خط لکھوں گا بس۔" اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا تھا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کر یار! کسی کے جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں۔" ساحر کے چہرے پر ناراضگی کے آثار تھے۔ وہ اس کی پروا نہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں اس معاملے کو سیریس نہیں ہونے دوں گا بس یونہی وقت گزاری کے لیے یہ خط و کتابت اگر ہوئی تو ہوگی۔ کیا پتا کہ وہ خط کا جواب ہی نہ دے۔"

"تجھے اس کے بارے میں کیا معلوم ہے؟ وہ کیسی ہے؟ اس کی عمر کیا ہے؟ کیوں خوامخواہ کی مصیبت مول لیتا ہے۔ خود بھی پھنسے گا اور مجھے بھی پھنسائے گا۔" ساحر مستقبل کے اندیشوں سے فکر مند ہو کر بولا تھا۔

"مجھے نہ جانے کیوں اس لڑکی میں دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے اس سے دوستی کرنی ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" اسفند بچوں کی طرح ضد کر کے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے تو نہیں مانے گا' تجھے جو کرنا ہے وہ کر لیکن خیال رہے کہ اپنی اور میری نیک نامی کو داؤ پر نہیں لگانا۔" وہ بالآخر ہار مانتے ہوئے بولا تھا۔

☆

وہ ایک پُر بہار شام تھی اور اسفند بڑی ترنگ میں تھا۔ ہر طرف بہار کے رنگ بھرے تھے۔ پھولوں پر تتلیاں منڈلا رہی تھیں اور آس پاس خوش بوؤں کے ڈیرے تھے ایسے میں اس نے مشعل کو لکھا۔ آپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیسی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ کچھ معلوم نہیں اور شاید کبھی معلوم ہو بھی نہ سکے لیکن آج اسے خوش رنگ کی شام میں ایک شعر میں سما کر آپ مجھ سے ملی ہیں۔ وہ شعر جو آپ نے اپنے خط میں میرے لیے بھیجا تھا۔ میں نے آپ کو محسوس کیا ہے۔ کاغذ پر پھیلے ہوئے الفاظ بھی کیا چیز ہوتے ہیں بظاہر ساکت ہوتے ہیں مگر ان میں ایک دنیا ہوتی ہے' ان میں رنگ' لمس اور جذبے حرکت کرتے ہیں۔ یہ مزاج کا آئینہ ہوتے ہیں' جو انجان لوگوں کو ایک دوسرے سے یوں منسلک کر دیتے ہیں' جیسے وہ زمانوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں' آج جو آپ اپنے الفاظ کے ذریعے مجھ سے ملی ہیں تو گو کہ آپ میرے لیے اجنبی ہیں لیکن لگتا ہے کہ میں آپ کو پہلے سے جانتا ہوں۔ اسفند نے ایک بار لکھنا شروع کیا تو پھر لکھتا چلا گیا اور آخر میں چند شعر بھی ٹانک دیے۔ یہ خط اس نے اسی دن پوسٹ کر دیا تھا۔

اسفند کو اس بات کی امید نہیں تھی کہ خط کا جواب آئے گا اور کئی اندیشے اسے ستا رہے تھے کہ نہ جانے

خط اس تک پہنچے گا یا نہیں۔ خط پر ایڈریس اس نے ساحر کے گھر کا ہی دیا تھا اور اس کے علاوہ یہ خط اس نے ساحر کے نام سے ہی لکھا تھا' اسے خوش گوار حیرت ہوئی جب ایک ہفتہ بعد ساحر نے اس کا خط لاکر اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا' وہ خوشی سے پھولے نہیں سمار ہا تھا' اس نے ساحر کو گھما دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے کہ جب انٹرنیٹ' موبائل فون وغیرہ عام نہیں ہوئے تھے۔ مشعل نے اپنی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

"السلام علیکم! آپ کا خط پا کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی مجھے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ مجھ جیسی عام لڑکی کو آپ خط لکھیں گے۔ جتنے خوب صورت آپ خود ہیں اور آپ کی آواز ہے۔ اتنی ہی خوب صورت آپ کی تحریر ہے۔ آپ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ کاغذ پر پھیلے ہوئے الفاظ انسان کا آئینہ ہوتے ہیں جو ہمیں بہت کچھ دکھاتے ہیں' صرف دکھاتے ہی نہیں سناتے اور محسوس بھی کراتے ہیں' یہ الفاظ ہی تو ہیں جو کہیں تخت وتاج گراتے ہیں تو کہیں ریگزاروں میں گلستان کھلاتے ہیں' انہی الفاظ کے سبب خون کے رشتے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں تو کبھی بدترین دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ جی ہاں! آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ شعر پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ سچ پوچھیں تو آپ کے الفاظ نے مجھے آپ کی شخصیت سے بھی زیادہ متاثر کیا ہے' مجھے ان میں ایک ہم ذوق شخص کی خوش بو آئی ہے اور میں آپ کو جواب لکھنے بیٹھ گئی۔"

اس خط کے بعد تو پھر خطوط کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ اس کی دلچسپی پر ساحر کو بھی لطف آنے لگا تھا۔ اس کا کہانیاں لکھنے اور شعر وشاعری کا شوق تبدریج خط لکھنے کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ ادب سے وابستگی کے سبب اس کی تحریر میں نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ مشعل کو خط لکھتے ہوئے اسے بڑا لطف آتا اور اس کا جواب اسے مزید لطف اندوز کرتا تھا۔ وہ بڑے اچھے ذوق کی مالک تھی' وہ اسے خط لکھتے ہوئے خاصا محتاط رہتا تھا۔

ان کے درمیان خط وکتابت کا یہ سلسلہ تقریباً چھ سات ماہ جاری رہا ہے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا' جیسے ایک نامعلوم سا بندھن اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ جب اس کا خط نہ آتا تو اسے اپنے اندر ایک خلاء سا محسوس ہوتا تھا اور جب خط آجاتا تھا تو اپنا آپ اسے مکمل لگنے لگتا۔

وہ اکثر سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے' وہ کیا کہہ رہا ہے' کہیں وہ اس کی محبت میں گرفتار تو نہیں ہو رہا تھا' ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا' نہ اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا اور پھر اس کی منگنی بھی تو اس کی کزن سے ہو چکی تھی' ابھی تو ابتداء تھی' لیکن پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو معاملات اس کے بس سے باہر ہو جائیں گے' کوئی ایسا سفر شروع ہو جائے گا جس میں رکنا یا واپسی کا سوچنا محال ہو گا۔ ابھی تو کچھ نہیں بگڑا تھا ایک معمولی سی غیر اہم سی کسک تھی اور ایک دلیرانہ کوشش سے اس کسک کو دل و دماغ سے جھٹکا جا سکتا تھا اور پھر اس نے اس کسک سے چھٹکارا پانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور خود کو زندگی کے ہنگاموں میں گم کر لیا تھا کہ ایک دن ساحر تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے پاس آیا اور کہا۔

"آج تیری مشعل سے بات کر کے آ رہا ہوں۔"

وہ بڑے جوش میں نظر آ رہا تھا۔

"مشعل سے کب؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"ابھی کوئی ایک گھنٹے پہلے اس کا فون میرے گھر کے نمبر پر آیا تھا نہ جانے اس نے میرا فون نمبر کہاں سے حاصل کیا' کافی دیر تک تو اس نے مجھے سسپنس میں رکھا' اپنا نام ہی نہیں بتا رہی تھی پھر اس نے اپنے خطوط کے ایک دو حوالے دیئے کچھ شعر پڑھے تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے' میں نے فوراً اسے پہچان لیا کہ وہ مشعل تھی۔ اپنے پہچان لیے جانے پر وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی' دس منٹ بات کی تھی اس نے......" ساحر نے اسے تفصیل بتائی۔

اگلے دو ہفتوں میں ایک بار مشعل کا فون آیا تھا اور دو مرتبہ ساحر نے اسے فون کیا تھا۔ ساحر نے دل کھول کر اس سے باتیں کی تھیں۔ ساحر کی مشعل میں یہ دلچسپی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ اس ٹیلی فونک گفتگو میں اس نے مشعل کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنی تصویر بھیجے گی۔ وہ دونوں ہی مشعل کی تصویر کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے مگر تصویر نہیں آئی تھی۔ مشعل شاید اس صورت حال سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس دن ساحر اس کے پاس آیا اور کہا۔

"یار! اپنے اسٹائل میں اسے ایک دھانسو قسم کا خط لکھ' ایسا کہ وہ پڑھ کر تڑپ جائے اور پہلی فرصت میں اپنی تصویر روانہ کر دے۔"

"کیا؟ اسے تڑپانے کے لیے خط میں زہر ڈال دوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"تُو زہر بھی ڈال سکتا ہے اور شہد بھی' یہ مجھے پتا ہے۔ اس میں کچھ شاعری واعری بھی لکھ دے۔" وہ بولا تھا۔

"دیکھ تُو اپنی بات سے پھر رہا ہے تُو نے خود کہا تھا کہ اس معاملے کو سنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔" اسفند نے تنبیہ کی تھی۔

"دیکھنے میں کیا حرج ہے یار......!" وہ بے پروائی سے بولا تھا۔

اس روز ایک طویل خط اس نے پوری توجہ سے لکھا تھا اور تصویر کے لیے ساری بے تابی اور جھنجلاہٹ اچھے طریقے سے لفظوں میں سمونے کی کوشش کی تھی۔ خط ارسال کرنے کے چند دن بعد ہی وہ اہم خط آ گیا تھا' جس میں اس نے ساحر کی ضد کے سامنے ہار مانتے ہوئے اپنی تصویر ارسال کی تھی۔

وہ دن دونوں کے لیے بڑی مسرت کا تھا۔ ان دونوں کی رائے تھی کہ اگر یہ واقعی مشعل کی تصویر ہے تو بہت خوب صورت ہے۔ اس تصویر میں جو چیز اس کے چہرے سے بھی پہلے نظر آئی تھی وہ اس کی معصومیت تھی۔ اسفند کے لیے ایک حیران کن بات اس کی کم عمری تھی' اتنی چھوٹی عمر میں اتنے پختہ خیالات بے شک قدرت کا عطیہ ہی تھے۔

اگلے تین چار ماہ میں اس رومانی تعلق نے کئی مدارج طے کیے تھے۔ وہ خط لکھتا رہا اور مشعل کی طرف سے آنے والے جواب ساحر اسے دیتا رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی اور شدت سے مشعل کے خیالات میں الجھتا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش شدت پکڑتی جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح مشعل سے ملے لیکن کیسے اور کیونکر؟ وہ محبت کی تلاطم خیز لہروں کے نرغے میں خود کو پاتا تھا۔

❀......☆......❀

ایک دن یوں ہوا کہ ساحر تیزی سے اس کے کمرے میں آیا اور اسے اٹھا کر گھما ڈالا اور یہ خوش خبری سنائی تھی کہ وہ مشعل سے ملنے جا رہے ہیں۔ اسفند کا دل تو یہ سُن کر دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ سچ ہے کہ محبت ہی قدرت کا سب سے بڑا کرشمہ ہے' جس تن لاگے سو تن جانے' محبت کے ہی ذریعے انسان پر زندگی کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔ کائنات کا عکس

اسی آئینے میں تو نظر آتا ہے۔

مشعل نے ساحر سے فون پر سارے معاملے طے کر لیے تھے کہ کب اور کہاں ملنا ہے۔ اسفند کے دل میں ہزاروں اندیشے جنم لے رہے تھے' اس نے ساحر سے کہا۔

"یار! اسے حقیقت کے بارے میں کیسے بتائیں گے اور اس کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ میں تو اس بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔"

"ابھی تو صرف اس سے ملتے ہیں' اچانک اسے سب کچھ بتانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ آہستہ آہستہ میں اسے حقیقت سے آگاہ کردوں گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ مگر اس کے دل کو اس بات سے اطمینان نہیں ہوا تھا۔

"کہیں کسی مسئلہ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔" اس نے فکرمندی سے کہا تھا۔

"اوئے کچھ نہیں ہوتا تُو فکر نہیں کر۔"

☆

اگلے روز سہ پہر کو وہ دونوں تیار ہو کر مشعل سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ اس نے ملنے کے لیے ناظم آباد میں واقع ایک غیر معروف سے ریستوران میں انہیں بلایا تھا۔ ریستوران میں داخل ہو کر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا مشعل انہیں کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک خالی ٹیبل پر وہ دونوں بیٹھ گئے' ریستوران اس وقت تقریباً خالی تھا۔

"تُو نے یہ تو بتایا نہیں کہ اس نے کپڑے کس رنگ کے پہنے ہوں گے۔" اسفند نے پوچھا۔

"گلابی' نیلا...... وہ آ گئی.....!" ساحر نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

اسفند نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ وہ لڑکی جس کے سپنے کئی ماہ سے اس کی آنکھوں میں سجے تھے اور جس کا خیال دھڑکن کی طرح اس کے سینے میں رہتا تھا۔ آج اس خوش گوار سہ پہر بڑی ادا کے ساتھ ان کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک اور بھی لڑکی تھی' مشعل کی طرح وہ بھی شلوار قمیص میں تھی۔ سرو قد مشعل نے قدرے گھبرائے ہوئے انداز میں اردگرد نگاہ دوڑائی۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو چکے تھے۔ پھر اسفند نے مشعل کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نوٹ کیے تھے اس کی نگاہ ساحر پر پڑی اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

آپس میں سرگوشیاں کرتی دونوں لڑکیاں ان کے پاس آ گئی تھیں۔ چہرے جو عموماً دور سے خوب صورت نظر آتے ہیں' نزدیک آنے پر ان کی خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں لیکن مشعل کے حوالے سے ایسا نہیں ہوا تھا' وہ قریب آ کر مزید خوب صورت لگی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے دل کش چیز اس کے چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت تھی۔ اس کی ساتھی لڑکی اس سے عمر میں ایک دو سال بڑی لگتی تھی۔ وہ بھی مشعل کی طرح گوری رنگت والی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

اسفند بڑی محویت سے مشعل کو دیکھ رہا تھا' نجانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی تھی۔ مشعل نے ایک لمحہ کے لیے اس کی سمت دیکھا تھا پھر اس کی گھنی پلکوں نے بوجھل ہو کر اس کی آنکھوں کو چھپا لیا تھا اور دوسرے لمحے وہ ساحر کو دیکھنے لگی تھی۔ ساحر بھی مشعل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا' خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو مشعل نے ہمت کر کے نگاہ اٹھائی اور انہیں سلام کیا۔ جواب میں بہ یک وقت ان دونوں نے بھی یہی الفاظ دہرائے۔ اس پر دونوں لڑکیاں مسکرا دیں' مسکراہٹ نے ماحول

کے تناؤ کو خاصا کم کیا تھا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" ساحر نے رسمی جملہ کہا۔

"ہمیں بھی......!" مشعل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا پھر کچھ دیر ریستوران میں بیٹھے رہے چائے پی کچھ اسنیکس کھائے تھے۔ اسی دوران رسمی بات چیت ہوتی رہی۔ ریستوران سے نکل کر وہ سڑک کے کنارے کنارے چل دیے۔ وہ بولی۔

"یہاں پاس میں ایک بڑا خوب صورت پارک ہے آئیے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

ساحر بولا۔ "آپ کی پسند ہے خوب صورت تو ہوگی ہی۔"

"آپ کے خطوط کی طرح اور آپ کی باتیں بھی خوب صورت ہیں۔" وہ ذرا شرما کر بولی تھی اور باتیں کرنے کے لیے یہ واقعی بڑی مناسب جگہ تھی۔ سایہ دار درخت تھے اور ان کے نیچے لکڑی اور پتھر کے بنچ تھے۔ پاس ہی موجود کینٹین سے ایک لڑکا فوراً ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"آپ کیا لیں گی؟" ساحر نے دونوں لڑکیوں سے پوچھا تھا۔

"یہ سوال تو ہمیں پوچھنا چاہیے تھا آپ ہمارے مہمان ہیں۔" مشعل نے سادگی اور بے تکلفی سے کہا تھا۔

"ان صاحبہ کا تعارف تو آپ نے کروایا ہی نہیں؟" ساحر نے مشعل سے کہا۔

"یہ میری وہی کزن ہیں جن کا تذکرہ میں نے اکثر اپنے خطوط میں کیا تھا۔"

ساحر نے اسفند کی طرف دیکھا ایک لمحہ کے لیے وہ گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

"یہ میری کزن صلہ ہے، ہم دونوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ میرے ساتھ ہی پڑھ رہی ہیں۔" ساحر نے مشعل کے منع کرنے کے باوجود چائے، سینڈوچ اور پیٹیس وغیرہ منگوا لیے تھے۔ پھر وہی باتیں شروع ہو گئیں جو دیرینہ تعلق کے بعد پہلی بار ملنے والے کرتے ہیں۔ آپ کا فلاں خط ایسا تھا، فلاں خط ویسا تھا۔ آپ کی فلاں باتیں مجھے اچھی لگیں، فلاں خط کا جواب بہت دیر میں ملا اور میں نے بہت انتظار کیا۔ آپ کے بارے میں فلاں وقت میں نے یہ سوچا تھا، آپ کے بارے میں فلاں فلاں اندازے درست ثابت ہوئے۔

ساحر اور مشعل باتیں کر رہے تھے اور اسفند محسوس کر رہا تھا کہ یہ وہ گفتگو نہیں جو کرنا چاہیے تھی، اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا اور سننا چاہیے تھا۔ وہ ان کہی کہانیاں جو ابھی ادھوری تھیں۔ اس نے انہیں موقع فراہم کرنے کی غرض سے مسکراتے ہوئے صلہ سے کہا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرے ساتھ پارک کی سیر کو چلیں، یہ واقعی بہت خوب صورت پارک ہے۔"

"وائی ناٹ!" اس نے اٹھلا کر کہا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں روش پر چلتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تھے۔

دھیرے دھیرے ان کی گفتگو کا رخ مشعل اور ساحر کی طرف مڑ گیا تھا۔ صلہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"اسفند صاحب! مشعل آپ کے دوست سے واقعی بہت محبت کرتی ہے۔ وہ اس معاملے میں کافی آگے نکل گئی ہے۔ نہ جانے آپ کے دوست اس معاملے میں کتنے سنجیدہ ہیں۔"

"اس کی سنجیدگی کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کہ وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے یہاں موجود ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

"کیا ساحر بھائی اس حد تک سنجیدہ ہیں کہ وہ مشعل سے شادی کرلیں گے، وہ ایک عام سی لڑکی ہے جب کہ وہ ایک مشہور آرٹسٹ ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدہ ہیں۔"

"کیا ان کے گھر والے بھی اس شادی پر راضی ہو جائیں گے۔"

اسفند نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "جب میاں بیوی راضی تو......"

وہ بھی مسکرائی تھی وہ دونوں ایک گھنے پیڑ کے نیچے لکڑی کی ایک بنچ پر جا بیٹھے اور باتیں کرنے لگے تھے۔ مستقبل کے حوالے سے اسفند کی معلومات میں کافی اضافہ ہوا تھا۔ خطوط سے اسے یہ تو پتا تھا کہ مشعل کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور وہ اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتی ہے، وہ صلہ کی باتیں سن رہا تھا مگر اس کا تمام دھیان ساحر اور مشعل کی طرف تھا وہ مسلسل انہیں دیکھ رہا تھا۔ ہَوا سے مشعل کے خوب صورت بال بار بار اڑ کر اس کے گالوں کو چھو رہے تھے اور وہ انہیں سنبھالتی ہوئی ساحر سے باتیں کرتی ہوئی بڑی دل کش لگ رہی تھی۔ وہ کسی بات پر مسکراتی تو کبھی شرماتی پھر تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ساحر بے تکلف ہوتا جا رہا تھا اور اس کے انداز میں کچھ بے باکی سی اس نے محسوس کی تھی۔

واپسی پر ساحر بہت خوش تھا اور اسفند کے کمرے میں آتے ہی وہ اسے آج کی تفصیل بتانے بیٹھ گیا تھا۔ اسفند بھی یہ سب سننے کے لیے بے تاب تھا۔

"وہ بہت پیاری ہے یار! اس کی باتیں بھی بڑی دلچسپ تھیں۔ بس مجھے ایک پرابلم ہوئی کہ وہ بار بار

خطوط کا حوالہ دے رہی تھی۔"

"اور کیا کہتی وہ؟" اسفند نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔

اس کے متغیر چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ "کچھ جلنے کی بُو آ رہی ہے۔"

"نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ کھسیا گیا تھا۔

"میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ اسے حقیقت کے بارے میں کیسے بتائیں گے اور اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ صلہ بتا رہی تھی کہ وہ اس معاملے میں بہت سیریس ہے۔ تُو بتا، تُو کہاں تک سنجیدہ ہے؟" اس نے غور سے اسفند کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تجھے تو پتا ہے میری منگنی ہو چکی ہے، میں اس سے شادی تو نہیں کر سکتا، میرا خیال کہ اس معاملے کو یہیں ختم کر دیتے ہیں۔" اسفند کے لہجے میں کچھ اداسی در آئی تھی۔

"ایک دو ملاقاتیں اور کریں گے پھر خدا حافظ کہہ دیں گے۔" ساحر بڑی بے دردی سے بولا تھا۔

"اسے حقیقت بتائے بغیر خدا حافظ کہہ دیں گے۔" اسفند نے معنی خیز نظروں سے ساحر کو دیکھا تھا۔

"اس سے بھلا کیا ہوگا، نہ تو تُو اس سے شادی کرے گا اور نہ ہی تو اس معاملے میں سنجیدہ ہے، تفریح ہی تو کرنی ہے تو وہ تُو کر رہا ہے میرے ساتھ مل کر۔" اس نے پھر بغور اسفند کو دیکھا تھا۔

"بس اب تو خود ہی اس سے مل، میں نہیں جاؤں گا تیرے ساتھ، خوامخواہ کباب میں ہڈی بننے کا کیا فائدہ۔" اسفند نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"بکواس بند کر ایک بار اس سے مل کر اسے حقیقت ضرور بتاؤں گا پھر دیکھتے ہیں کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔"

پھر وہی فاصلے درمیان میں آ گئے تھے جو محبت کرنے والوں کا مقدر ہوا کرتے ہیں۔ آج حسب وعدہ اسے آنا تھا اور ان دونوں نے اس کے گھر کے قریب سڑک پر اس کا انتظار کرنا تھا۔ ساحر نے سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے اپنی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ آج وہ تنہا آئی تھی اس نے سادہ لیکن خوش رنگ لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ کسی مومی گڑیا کی مانند نظر آ رہی تھی، اس کا سراپا بہت دل کش تھا۔

"کہاں چلنا ہے؟" گاڑی میں ساحر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مشعل نے سادگی سے کہا تھا۔

"کوئی فلم دیکھتے ہیں۔" اسفند نے تجویز پیش کی۔

"ابھی فلم کا ٹائم کہاں ہوا ہے۔" ساحر بولا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ فلم کا ٹائم ہونے تک گھوم پھر لیتے ہیں پھر فلم دیکھنے چلیں گے۔ میں گھر سے ایک سہیلی کی برتھ ڈے کا بہانہ کر کے آئی ہوں، شام تک مجھے گھر پہنچنا ہے۔" اس نے خبردار کیا تھا۔

سیر سپاٹے کرتے، کھاتے پیتے سہ پہر کے قریب ایک سینما گھر پہنچے، جوں جوں وقت گزر رہا تھا وہ ایک دوجے سے بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ اسفند نے مشعل سے پوچھا۔

"بھئی آج آپ کی ساتھی دکھائی نہیں دے رہیں۔ کہاں ہیں محترمہ؟"

"تمہیں محترمہ کی اتنی فکر کیوں لاحق ہو گئی ہے؟" ساحر نے معنی خیز لہجہ میں کہا تھا۔

"نہیں میں تو اخلاقاً پوچھ رہا تھا۔" اسفند نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔

یہ ایک رومانی فلم تھی، فلم کے دوران اسفند نے محسوس کیا کہ مشعل کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی،

وہ ان دونوں کے درمیان بیٹھی تھی وہ غیر محسوس طور پر ساحر کی طرف سے ہٹ رہی تھی اور اسفند کی طرف جھک رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا ساحر کا ہاتھ مشعل کی کرسی کے ہتھے پر رکھا تھا' وہ اس کے کان میں سرگوشیاں کررہا تھا۔

واپسی پر عجیب سی جھنجلاہٹ اسفند پر طاری تھی۔ راستے میں ساحر نے اسفند کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی' اس کی یہ خلاف معمول خاموشی اسے کھل رہی تھی لیکن اس نے اس کی باتوں کا کوئی مناسب جواب نہیں دیا تھا۔ آخر ساحر بولا تھا۔

''دیکھ یار! آج تو اس سے بات کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا۔ ایسا کرتا ہوں کہ ابھی جا کر میں فون پر اسے سب کچھ بتا دیتا ہوں۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اسفند کو اس کے گھر کے سامنے اتارا تو اسفند نے اسے چائے کی آفر کی جسے ساحر نے رد کردیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اسفند کا موڈ سخت آف تھا وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ اب ان کے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ اگر کوئی پروگرام بنا بھی تو وہ بہانہ بنادے گا۔ اگلے روز ساحر نے اسفند کو فون کیا اور کہا۔

''یار! فون پر یہ سب کہنا مجھے مشکل لگ رہا ہے' ایسا کرتے ہیں کہ کہیں پکنک کا پروگرام بناتے ہیں' وہاں موقع دیکھ کر اسے سب کچھ سچ سچ بتادیں گے۔''

اسفند نے کہا۔ ''تم لوگوں کی جو مرضی پروگرام بناؤ میں اس میں شامل نہیں ہوں گا' مجھے معاف ہی رکھو۔''

پھر انہوں نے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور فون بند کردیا تھا۔

اگلے روز دس بجے کے قریب مشعل کا فون اسفند کے پاس آیا تھا۔ ساحر نے غالباً اس کا نمبر دے دیا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ اگر آپ پکنک پر نہیں آئیں گے تو پھر ہم بھی نہیں آئیں گے وہ اس کے سر ہوگئی تھی کہ اسے ضرور آنا پڑے گا پھر اس نے صلہ کو فون دے دیا تھا۔ صلہ بھی اسے منانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے بیماری کا بہانہ بنانا چاہا تو وہ بھی نہ چلا' بہرحال اسے ہاں کرتے ہی بن پڑی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس دن وہ پکنک پر روانہ ہوئے تھے۔

راستے سے کھانے پینے کا سامان لے کر گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ دونوں لڑکیاں دل کش نظر آرہی تھیں تاہم مشعل زیادہ دل کش نظر آرہی تھی۔ آج موسم بھی بہت خوش گوار تھا' ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی' گنگناتا' ہچکولے لیتا' ٹھاٹھیں مارتا سمندر سامنے تھا۔ کچھ دیر ساتھ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ساحر نے مشعل کے کان میں کوئی سرگوشی کی دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جانب چل دیئے۔ وہ ساحر کے پہلو میں چلتی ہوئی بہت دل کش لگ رہی تھی۔ اسفند اور صلہ کچھ فاصلے پر بیٹھے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اسفند نے کہا۔

''یہ دونوں کتنی جلدی ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے ہیں کہ لگتا ہے نہ جانے کب سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

صلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ساحر صاحب کے لکھے ہوئے خطوط میں نے بھی پڑھے ہیں' وہ جو بھی لکھتے تھے دل سے لکھتے تھے اور دل سے لکھی ہوئی بات ضرور اثر کرتی ہے' یہ انہی خطوط کا اثر ہے۔''

اسفند ایک لمحہ کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ اب سہ پہر ہونے والی تھی اور انہیں بھوک ستا رہی تھی' کھانے کے دوران مشعل کے بالوں کی کچھ لٹیں اس کے چہرے کی طرف پھسل آئی تھیں۔ وہ بے حسین نظر آرہی تھی۔ ساحر اب مشعل کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کررہا تھا اور وہ بھی ذرا جھجک کے ساتھ یہی لفظ استعمال کررہی تھی۔ ساحر کے بارے میں اسفند جانتا تھا کہ وہ صرف جسمانی محبت کا قائل تھا' ایسی محبت جو صرف جسم سے شروع ہوکر جسم پر ہی ختم ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کی محبت میں جسم کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن کچھ لوگوں کے معاملے میں یہ اتنا حاوی ہوتا ہے کہ خوش بُو دار جذبے کہیں دور چلے جاتے ہیں۔ اسفند کو عجیب کوفت کا احساس ہوا تھا۔ گھر آکر وہ دیر تک اپنے کمرے میں بند رہا اور اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

اس کے سامنے وہ فائل پڑی تھی جس میں مشعل کے لکھے ہوئے خط رکھے تھے' وہ بستر پر نیم دراز ہوکر انہیں پڑھنے لگا یہ کوئی درجن بھر خط تھے' ہر خط پر تاریخ درج تھی۔ نیلے' گلابی اور سبز رنگ یہ خوش بُو دار خطوط اس نے بڑی توجہ اور محبت سے لکھے تھے۔ اس نے ترتیب وار خط پڑھنے شروع کیے۔ گزرا ہوا پورا دور اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ شروع کے چند خطوط میں روزمرّہ کے چھوٹے موٹے واقعات تھے۔ زندگی کے بارے میں فلسفیانہ باتیں تھیں' اشعار تھے۔ یہ خط اس نے دوبارہ پڑھے تو اسے اور بھی اچھے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان خطوط میں چلتی ہوئی پُرخلوص دوستی کی لہر بھی محسوس ہوتی تھی۔ بعد کے خطوط کچھ مختلف ہوگئے تھے لیکن ان میں بھی شائستگی' ادبیت اور لطافت موجود تھی۔ شاید یہ اسفند کے خطوط کا اثر تھا کہ اس نے اس کی تھوڑی سی بے باکی اور پرتپش رومانیت کو نہ صرف برداشت کیا تھا بلکہ انہیں بتدریج اپنے دل میں بھی جگہ دی تھی۔

اس کے ذہن میں مشعل کے ساتھ گزرے ہوئے روز و شب گھومنے لگے اور ساحر کا قدرے بے باک رویہ یاد آیا' سینما ہال میں فلم کے دوران مشعل بے آرام ہوئی تھی شاید ساحر نے اس کے ساتھ کچھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔ بہرطور یہ اس کا ظرف تھا کہ کسی موقع پر بھی اس نے ساحر کی دل شکنی نہیں کی تھی۔ اب اس نے تسلی سے ان خطوط کو پڑھا اور پھر ان میں پائے جانے والے دھیمے پن کا موازنہ اس رویہ سے کیا جو ساحر نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا تو اسے اس میں کئی خلاء نظر آئے۔ اس نے مشعل کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی بے نام سا ناتہ ہے' جس کی جڑیں آج بھی اس کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہیں۔ کوئی بات ہے جو ختم ہوکر بھی ختم نہیں ہوئی تھی' کوئی ڈور تھی جو ٹوٹ کر بھی اس کے پاس تھی۔ یہ ڈور شاید ہم ذوقی اور ہم مزاجی کی ڈور تھی' یہ انسیت اور ہمدردی کی ڈور تھی جو ایک انسان ایک دوسرے اچھے انسان کے لیے محسوس کرتا ہے یا پھر یہ کوئی ایسا تعلق تھا جو خوب صورت لفظوں کے تبادلے سے پروان چڑھا تھا اور اب وہ اس ڈور کو توڑنا چاہتا تھا' اس تعلق کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ایک سنگین جرم سرزد ہوا تھا' مشعل کو دھوکا دینے کا جرم' اس جرم کی سزا اسے بھگتنا تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ مشعل کے لیے اس کی محبت یا انسیت اسے جو بھی نام دیں کم ہوگئی تھی یہ تو موجود تھی بلکہ اب تو یہ جسم کے ایک ایک رگ و ریشے میں بس چکی تھی۔ اس کے دل سے آواز آتی تھی کہ محبت صرف پالینے کا نام ہی تو نہیں ہے' ایک دوسرے کو کھو دینے کا نام بھی تو محبت ہے۔ یہ دل نشین احساس کتنا اہم ہوتا ہے کہ دنیا میں کہیں کسی جگہ ایک ایسا شخص موجود ہے جو آپ کو سوچتا ہے' آپ کے لیے آہیں بھرتا ہے اور آپ کے لیے اس کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں' نہ یہ ملنے سے کم ہوتا ہے نہ جدا ہونے سے ختم ہوتا ہے۔

وہ سوموار کا دن تھا' جب صلہ کا فون اسفند کے پاس آیا تھا' ایک ملاقات کے دوران صلہ نے اس

سے اس کا فون نمبر لے لیا تھا۔ اس نے خاصی گھبرائی ہوئی آواز میں اسے بتایا تھا۔

"آج مشعل تنہا ساحر سے ملنے اس کے گھر گئی ہے' نہ جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے' جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے۔" اس نے اسفند سے پوچھا تھا کہ اس ملاقات کا اسے پتا تھا یا نہیں۔ ساحر نے اس ملاقات کو اسفند سے پوشیدہ رکھا تھا' یہ بات باعث تشویش تھی۔ پکنک والے دن کے بعد اس کی ملاقات یا بات ساحر سے نہیں ہوئی تھی اور اسی دن اس نے بتایا تھا کہ اس کے گھر والے اسلام آباد جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ساحر گھر میں اکیلا ہی ہوگا۔ خطرہ کی گھنٹی بج چکی تھی' اس نے صلہ کو ساحر کے گھر کا ایڈریس بتایا اور اسے وہاں فوراً پہنچنے کی ہدایت کرتے ہوئے خود بھی تیزی سے ساحر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مشعل خطرے میں تھی۔

وہ ساحر کے گھر پہنچا اور ڈور بیل بجائی تو چوکیدار نے گیٹ کھولا' وہ دندناتا ہوا اوپر ساحر کے کمرے تک پہنچا' دروازہ بند تھا۔ اس نے دو تین بار دستک دی' آخر دروازہ کھلا اور ساحر کی صورت نظر آئی' اسے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ دروازہ بند کردے گا لیکن اسے اتنی مہلت نہیں ملی' اسفند نے اسے دھکا دیا اور کمرے میں داخل ہوگیا' اس نے دیکھا کہ بستر پر مشعل بے سدھ لیٹی ہوئی تھی' وہ غالباً ہوش میں نہیں تھی شاید اسے کوئی نشہ آور چیز دے کر بے سدھ کیا گیا تھا۔ ساحر کو سنبھلنے میں تھوڑا سا وقت لگا اور وہ تیزی سے اسفند پر جھپٹا اور اسے دھکے دینے لگا وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ اسفند نے محسوس کیا کہ وہ اس وقت نشہ میں تھا۔ اسفند نے اسے ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔

"دغا باز! دیکھ لی تیری یاری! تیری نیت کا فتور تو میں نے بہت پہلے محسوس کرلیا تھا' تُو نے جب اس کی خوب صورتی دیکھی تو تُو بے ایمان ہوگیا۔ تُو میرا یار نہیں رہا۔ اس کے بعد تُو نے جو بھی قدم اٹھایا اپنی ہوس کے لیے اٹھایا۔" شور شرابے کی آواز سُن کر مشعل ہوش میں آ گئی تھی اور چکراتے ہوئے سر کو تھامے سکتے کی کیفیت میں بیٹھی سب دیکھ اور سُن رہی تھی۔ اسی دوران صلہ بھی کمرے میں آ چکی تھی اس کی سانس تیز بھاگنے کی وجہ سے پھولی ہوئی تھی۔ ساحر نے اسفند کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"دھوکا میں نے نہیں تُو نے دیا ہے اسے میرے نام سے جھوٹے خط لکھتا رہا ہے' بول جواب دے تُو نے ایسا نہیں کیا؟"

صلہ مشعل کو سنبھالنے میں مصروف ہوگئی تھی' مشعل کا دل رو رہا تھا اور شاید پورا جسم رو رہا تھا۔ اسے کیا بتاتا' کیا سمجھاتا۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے پاس پسٹل ہو اور وہ ساحر کو گولی مار کر اپنی کنپٹی میں بھی گولی اتار لے۔ جو غلطی اس سے سرزد ہوئی تھی' اس کی سزا اسے ملنی چاہیے تھی۔ اچانک ساحر خود کو اس سے چھڑا کر زینوں کی طرف بھاگا وہ اس کے پیچھے دوڑا اور راستے میں اسے جالیا۔ طیش اور جھلاہٹ کے عالم میں خود کو چھڑانے کے لیے اس نے اسفند کو دھکیلا' وہ ٹیرس کے حفاظتی جنگلے کی نوکیلی سلاخوں پر گرا تھا' اسے بڑی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں رنگ برنگے تارے ناچ رہے تھے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران ساحر جا چکا تھا اور مشعل اور صلہ اس کے پاس آ گئی تھیں۔ اسے اپنے کندھے پر ہلکی سی نمی کا احساس ہو رہا تھا' اس نے گردن کے عقب میں ہاتھ لگا کر دیکھا تو ہاتھ پر خون دکھائی دیا'

سر کے پچھلے حصہ سے بھی خون بہہ رہا تھا' یہ کافی شدید چوٹ تھی۔ گرتے وقت جنگلے کا کوئی کنارا اسے لگا تھا۔ تاہم اس نے اپنی یہ حالت ان پہ ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ نہ ہی یہ بتایا تھا کہ اس کے سر کے عقبی حصے سے خون رس رہا ہے۔ اسے چکر آرہے تھے۔ صلہ نے اسے اٹھنے میں مدد دی اور اسے بغور دیکھا اور بولی۔

"ہائے اللہ! آپ تو بہت زخمی ہیں' خون بہہ رہا ہے۔" وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی تھی مگر اس طرح بات پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ "اگر آپ وقت پر نہ آجاتے تو پتا نہیں کیا ہوجاتا اس کے ساتھ......" صلہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

مشعل کا رنگ ابھی تک زرد تھا اور چہرے پر اندیشوں کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی آخر روہانسی آواز میں بولی۔

"آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ......" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خود کو روک لیا۔ اسے سر کے پچھلے حصے میں اب شدید درد محسوس ہو رہا تھا' چوٹ ٹھنڈی ہوکر مزید تکلیف دہ ہوگئی تھی۔ پتا نہیں اسے ان زخموں میں تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی اگر تھی بھی تو یہ لذت آمیز تکلیف تھی۔

کمرے میں موجود فرسٹ ایڈ کے سامان سے صلہ نے اس کی مرہم پٹی کردی تھی۔ موجودہ صورت حال میں اس کی شخصیت مشعل کے سامنے مسخ ہوگئی تھی۔ جو کچھ اس کے سامنے آیا تھا وہ ہرگز قابل معافی نہیں تھا وہ سوچتا رہا اور عرق ندامت میں ڈوبتا رہا۔ گھر سے باہر نکلتے ہی مشعل کا ایک فقرہ گونج کی طرح اسفند کے کانوں سے ٹکرایا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ......؟"

چند لمحے بعد اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں......"

"لیکن میں سمجھ بھی گئی ہوں اور جان بھی گئی ہوں۔" وہ اسی انداز میں بولی' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"کک...... کیا جان گئی ہو؟" اس کی کھوپڑی میں جھماکے ہو رہے تھے' وہ سمجھ گیا تھا کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "تم ایک سال تک مجھے ساحر بن کر خط لکھتے رہے' بہت اچھا تماشا کیا ہے تم نے۔ کتنا بڑا دھوکا دیا ہے تم نے۔ کتنا بے رحم ناٹک رچایا ہے تم نے۔ پڑھے لکھے ہوکر ایک تھرڈ کلاس آوارہ گرد کا سا کردار ادا کیا ہے تم نے اور ایسا کرتے ہوئے ایک سال میں تمہیں ایک بار بھی شرم نہیں آئی۔ ایک بار بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ تم کتنا بڑا دھوکا دے رہے ہو اور اس دھوکے کا کسی کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔" وہ چپ تھا۔ اس کے پاس کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے۔ وہ پھنکاری۔ "کیا سمجھتے ہو تم لوگ عورت کو؟ ایک کھلونا! اس سے تفریح کی' اس سے کھیلا' توڑا اور پھر بے کار سمجھ کر پھینک دیا۔ ایسا کرتے ہوئے تم اپنی ماؤں' بہنوں کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ کوئی ان کے ساتھ ایسا بے رحم تماشا کرے' اس طرح ان کے ساتھ تفریح کرے' انہیں اجاڑے' برباد کرے تو کیسا لگے گا تمہیں۔ بتاؤ کیسا لگے گا تمہیں......؟" اس کی آواز بھرا گئی تھی' اس نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔ وہ رونے لگی اور جب ایک بار اس کے آنسو نکلے تو پھر نکلتے ہی چلے گئے۔ یوں لگا جیسے کسی سیلابی پانی کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ صلہ نے اسے دلاسہ دیا اور کہا۔

"بس چپ ہوجاؤ مشعل! کیوں تماشا بنا رہی ہو'

ہم سڑک پر کھڑے ہیں' لوگ کیا سوچیں گے؟''

وہ اپنی جگہ سکتہ کی سی کیفیت میں تھا۔ ایسے شخص کی طرح جس پر اچانک فرد جرم عائد کردی گئی ہو اور اس کے پاس صفائی کے لیے کوئی دلیل نہ ہو۔ پھر اسفند کی طرف دیکھے بغیر وہ بولی۔

''بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں' میں آئندہ آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔''

گھر پہنچ کر وہ بستر پر گر پڑا۔ شام تک اسے تیز بخار ہوگیا۔ گردن اور کندھے پر کچھ سوجن بھی ہوگئی تھی۔ اس کے ذہن میں مشعل کے تیز و تند الفاظ مسلسل گونج رہے تھے۔ اس نے شکر ادا کیا کہ گھر میں کوئی نہیں تھا' سب ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے ورنہ ان کے سوالات کا جواب دینا اس کے لیے مشکل ہوجاتا۔

اس کا سارا دن تکلیف میں گزرا تھا اور کچھ کھایا پیا بھی نہیں گیا تھا۔ اس نے جیسے تیسے درد دور کرنے کے لیے دوا کھائی اور بے سدھ ہوکر پڑا رہا۔ اسے کندھے میں شدید درد محسوس ہورہا تھا' اندازہ ہورہا تھا کہ زخم میں انفیکشن ہوگیا ہے۔ بخار کی شدت بھی شاید اسی لیے بڑھ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اسے بھی نیند آگئی تھی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وال کلاک دن گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کی آنکھ کسی آہٹ کے سبب کھلی تھی۔ اس کی امی کمرے میں آئی تھیں۔

''کیا ہوا اسفند! طبیعت خراب ہے کیا؟''

''ہاں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کیا لڑائی ہوئی ہے کسی سے؟'' انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔'' وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''رات تم نے بتایا نہیں۔''

''میں سوگیا تھا۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

ناشتے کے بعد اس کی امی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں۔ اگلا آدھا گھنٹہ ڈاکٹر بے حد مصروف رہے تھے' انہوں نے اس کے زخموں کا معائنہ کرکے اور اچھی طرح صاف کرکے بینڈیج کی' دو انجکشن لگائے اور کھانے کے لیے بھی دوا دی۔ انجکشن لگنے کے بعد وہ خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔

❁......☆......❁

سہ پہر کے قریب وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا' دوسری طرف صلہ تھی' صلہ نے اس کی خیریت دریافت کی اور کہا۔

''نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس پورے واقعے میں آپ بے قصور ہیں' یہی بات میں مشعل کو بھی سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں۔'' جواباً اس نے کہا۔

''میں اس قابل تو نہیں کہ مشعل کا سامنا کرسکوں لیکن اگر ہوسکے تو ایک آخری ملاقات ضرور کرنا چاہتا ہوں تاکہ انہیں سب کچھ صاف صاف بتاسکوں۔ پلیز ہوسکے تو اس سلسلے میں میری مدد کریں۔''

اور صلہ نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اس آخری ملاقات کا انتظام کردے گی۔ نہ جانے محبت کرنے والے اس آخری ملاقات کا اہتمام کیوں کرتے ہیں۔

اور پھر صلہ نے نہ جانے کیسے ملاقات کا انتظام کیا تھا' یہ اس کی کسی دوست کا گھر تھا جس کا شوہر ملک سے باہر تھا' وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ بچے اس وقت اسکول گئے ہوئے تھے۔ صلہ نے نہ جانے کیسے مشعل کو اس ملاقات پر آمادہ کیا تھا۔ اس

نے ہمارے لیے مکمل پرائیویسی فراہم کی تھی۔ کمرے میں اس وقت وہ اور مشعل تنہا تھے' صلہ اٹھ کر اپنی دوست کے پاس چلی گئی تھی جو اس وقت کچن میں مصروف تھی۔

وہ ایک صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی' اس کا رنگ زرد ہورہا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کی آنکھوں سے بہت سے پردے اٹھ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا وہ تو ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی تھی جو ایک سیدھی سادی زندگی گزارنے کی خواہاں تھی وہ تو اپنے لیے ایک باعزت جیون ساتھی کا تصور کررہی تھی لیکن یہاں تو سب کچھ تہہ و بالا ہوگیا تھا' سب کچھ جل کر خاک ہوا جارہا تھا۔ اسفند نے دیکھا اس کی خوب صورت پیشانی پر پسینے کی چمک تھی۔

وہ چند لمحے متذبذب رہا پھر اگلے ایک گھنٹے میں اسے سب کچھ تفصیل سے بتادیا کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اس کے ساحر کے نام آئے ہوئے خط سے لے کر اس کے خطوط لکھنے تک' پہلی ملاقات سے لے کر اس واقعہ تک جس نے سب کچھ ختم کرکے رکھ دیا تھا' سب کچھ اس کے گوش گزار کر ڈالا۔ وہ اس ساری روداد کو بے حد حیرت اور دکھ کے عالم میں سنتی رہی' دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ وہ بھی صرف سچائی بیان کررہا تھا اپنی طرف سے کوئی قطع و برید اس نے نہیں کی تھی۔ یہ سب اس کو بتا کر وہ خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے اورنج جوس کے گلاس رکھے تھے۔ مشعل کی ناک سرخ تھی اور اس کی آنکھوں کے کنارے بار بار نم ہوجاتے تھے۔ اس کی بات اختتام کو پہنچی تو مشعل کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے چہرہ گہرے غم کی تصویر ہوگیا' اس نے کہا۔

''میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا تھا' لیکن حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے دل کڑا کرنا پڑتا ہے' میں نے بھی دل کڑا کیا ہے۔''

''میری تو پوری زندگی ہی برباد کردی آپ نے......'' اس کی آواز میں عجیب سا کرب تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی زیادہ سنجیدگی تھی کہ اس سے بات کرنے کی اسے ہمت نہیں ہورہی تھی۔ وہ کچھ دیر چپ بیٹھی رہی پھر تیزی سے اٹھ کر اندر جانے لگی۔

''مشعل!'' اس نے آواز دی۔ وہ ٹھٹک کر مڑی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کہاں جارہی ہو؟'' اس نے اس کے قریب آکر پوچھا تھا۔

اس کی نم آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ آئے۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ کچھ کہنے لگی ہے' مگر پھر اس نے رخ پھیر لیا اور جھٹکے سے آگے بڑھی' وہ پھر اس کے پیچھے گیا اس مرتبہ اس نے اس کا بازو پکڑا۔

''میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا' کچھ کہو مجھے برا بھلا ہی سہی۔''

''تم مجھے روکنے والے کون ہوتے ہو' چھوڑ دو مجھے۔'' وہ مکمل بے رخی سے بولی تھی۔ ''پلیز مجھے جانے دو۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''تمہارے شکوے تو ساحر سے ہوں گے میں نے تو ہمیشہ تمہارا بھلا ہی چاہا ہے کم از کم مجھے......''

''مجھے تم دونوں سے کوئی سروکار نہیں' چلے جاؤ یہاں سے' میں کسی کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی' کسی کی بھی نہیں...... دفع ہوجاؤ یہاں سے......'' وہ اسے دھکیلتے ہوئے چلائی۔ ''کوئی غلط نہیں' میں ہی غلط ہوں' مجھے سزا پانے دو' مرجانے دو مجھے......'' وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا۔

''میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔''

وہ ہذیانی انداز میں اسے جھنجوڑنے لگی پھر نجانے اسے کیا ہوا اس نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا پھر دوسرا...... اس کا دوسرا تھپڑ اس نے روک لیا تھا' اس کی کلائی اس کے ہاتھ میں تھی وہ کلائی چھڑانے کے لیے زور لگانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ رو رہی تھی اور ہیجانی انداز میں دہرا رہی تھی۔

"چھوڑ دو مجھے...... پیچھے ہٹ جاؤ...... دور ہو جاؤ۔"

اس نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی' نہ ہی اسے خود سے دور ہونے دیا' پھر اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا وہ دھاڑیں مار کر روتی ہوئی اس کے سینے لگ گئی' اس پر ڈھے سی گئی' وہ چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں رہا پھر اسے اپنے ساتھ لگا لیا وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر روتی چلی گئی۔

مشعل اس طرح اس کے سینے سے چمٹی تھی کہ اس کے جسم کا حصہ ہی بن گئی تھی' اس کے گرم آنسو اس کی قمیص کو بھگو رہے تھے۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ وہ دونوں دو ڈرامائی کرداروں کی طرح ایک دوسرے کی بانہوں میں کھڑے تھے۔

اس نے اس کو خود سے علیحدہ کرنے کی تھوڑی سی کوشش کی لیکن اس کا انداز دیکھتے ہوئے ترک کر دی' وہ اس وقت ہیجانی کیفیت کا شکار تھی۔ وہ تقریباً دس منٹ تک روتی رہی تھی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ اسفند......؟" وہ گلوگیر آواز میں بولی تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"انجان مت بنو! تم الفاظ لکھنا جانتے ہو' ان کا مطلب بھی سمجھتے ہو پھر ان کی طاقت کو کیوں نہیں سمجھ سکے۔ کیوں نہ جان سکے کہ تمہارے لکھے ہوئے لفظ صرف تمہارے ہیں وہ کسی اور کا آئینہ نہیں بن سکتے؟" وہ بڑے جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔

اسفند کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیا۔ "تم نے کھیل کھیل میں کچھ خط لکھے اپنے لفظوں سے ایک رشتہ بنایا تمہارے لیے یہ محض ایک شغل تھا' تم نے یہ نہ سوچا کہ تمہارے اس شغل نے کسی کی زندگی میں کیا کردار ادا کیا ہے' کتنا برباد کیا ہے۔ تم نے مجھے ہی نہیں خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔"

"ہاں مشعل! تم ٹھیک کہتی ہو مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔" اس نے کراہ کر کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں تھپڑ مارا۔ میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا' مجھے سزا دو اسفند! تم بھی مجھے مارو۔" اس نے خود کو سنبھالا اور گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں سزا تو تمہیں ملنی چاہیے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔" وہ چپ رہی جیسے اس کی طرف سے سزا سنائے جانے کی منتظر ہو۔ اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"سزا یہ ہے کہ تم میری محبت کا اقرار کرو ابھی اسی وقت۔"

اس کے کومل جسم میں ایک پیاری سی لرزش نمودار ہوئی پھر وہ بولی۔

"میں تم سے پیار کرتی ہوں۔" کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی' تھوڑا سا توقف کر کے وہ پھر بولی۔

"اب سے نہیں بہت پہلے سے شاید تب سے جب تمہارا پہلا خط ملا تھا۔"

وہ اپنے لیے اس کے بے پناہ جذبے کو محسوس کرتا رہا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہے آنکھیں بند کر کے ہر طوفان سے ٹکرا سکتی ہے۔ مشعل نے عجیب دل گداز لہجے میں کہا تھا۔

"اسفند! ہم ملیں گے نا!"

"اگر جذبے سچے ہیں تو ضرور ملیں گے۔"

"کہیں کوئی دیوار تو ہمارے درمیان نہیں آ جائے گی؟"

"ارادے مضبوط ہوں تو دیواریں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔" وہ پورے یقین سے بولا تھا۔

☆

وہ واپس گھر پہنچا تو امی ابو کا رویہ بہت کھنچا کھنچا سا تھا' خاص طور پر امی بہت دل گرفتہ نظر آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس کی غیر موجودگی میں ساحر کا فون آیا تھا اور اس نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کر دی تھی' کچھ اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر...... ابو نے خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی تھی اور پھر کمرے سے چلے گئے تھے' وہ سر جھکائے بیٹھا سب کچھ سنتا رہا تھا۔ امی کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ ان سے کچھ نہیں چھپائے گا اپنے اور مشعل کے حوالے سے سب کچھ صاف صاف بتا دے گا اور ان سے کہے گا کہ اب وہ اس کے بارے میں خود فیصلہ کریں اور پھر اس نے ایسا ہی کیا' اس محترم ہستی سے کچھ بھی نہ چھپایا' دل کی ہر واردات ان کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے سب کچھ بڑی رقت آمیز شفقت سے سنا تھا اور آخر میں رونے لگی تھیں۔

"اسفند! ہم نے کیا سوچا تھا تمہارے لیے اور تم کس طرف چل پڑے ہو' یہ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟"

"مجھے خود خبر نہیں ہوئی امی! لیکن میں آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا' پھر پتا نہیں کیسے آپ ہی وہ کچھ ہوتا چلا گیا جو مجھے مشعل کے قریب لے گیا۔"

امی نے ایک گہری سانس لی' ان کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوپر والے نے ہمیں سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔" وہ خاموش رہا تھا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔ "اب بتاؤ کرن اور اس کی ماں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "امی! میں جانتا ہوں کہ آپ کرن کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتی تھیں' میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن ایک بات میں آپ سے سچ سچ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے بیچ کوئی گہرا تعلق کبھی پیدا نہ ہو سکا۔"

"تمہارے ابو سے بات کر کے دیکھتی ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔" انہوں نے اداس لہجے میں کہا تھا۔

ابو اس سے زیادہ بات نہیں کر رہے تھے وہ جتنی بات کرتا بس اتنا جواب دیتے تھے اور وہ بھی خراب موڈ میں ان کی خفگی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

وہ تمام حالات کو بخوبی سمجھ رہا تھا اور پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ اب وہ حالات کو بدل دے گا' یہ ایک انوکھا عزم تھا۔ ایک انجانی تحریک تھی وہ خود کو بالکل نیا محسوس کر رہا تھا' تازہ دم اور پُرجوش۔ یہ کیسی توانائی تھی' ہاں یہ محبت کی توانائی تھی۔ بے شک محبت ہی ایسا انوکھا جذبہ ہے اور پھر واقعی اس نے حالات بدل ڈالے۔ مشعل سے شادی کر کے اسے گھر لے آیا تھا۔ ابو کی ناراضگی بھی دیر تک قائم نہیں رہ سکی تھی۔ مشعل نے اس کے گھر میں آتے ہی سب کے دل جیت لیے تھے۔

⌘

قسط نمبر 4

گردش

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

محبت کی روایتی تکون سے شروع ہونے والی یہ خونی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جاتی ہے۔ اس میں کرپٹ سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کہلانے والے مجبور و مقہور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سودے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے پانی پر کھینچی گئی لکیر کی طرح نا پائیدار ہوتے ہیں۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

ریستوران کی ٹیبل پر پڑے ہوئے اخبار میں جب میں نے اپنے بارے میں وہ خبر پڑھی تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی اور مجھے پورا یقین تھا کہ یہ خبر اسی ذلیل کمینے رشوت خور پولیس افسر انور خان نے دی ہوگی۔ کرائم رپورٹر تھانہ انچارج سے رابطے میں رہتے ہیں اور تھانے سے جڑی چٹ پٹی مزے دار خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جیسے پانچ بچوں کی ماں نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اپنے شوہر کو قتل کردیا اور آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی' کہیں کسی جوان اور غریب لڑکی کے ساتھ گینگ ریپ ہوگیا اور پولیس والے انہیں نے خبریں فراہم کرتے رہتے ہیں۔

میری یہ خبر تو انور خان نے خود فون کر کے اخبار کو دی ہوگی۔ اخبار میں صاف صاف میرا پیشہ اور نام چھپا تھا۔ اس شہر میں کتنے ہی میرے جاننے والے ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے میرے بارے میں کہ میں نے اپنے بوڑھے باپ کو قتل کردیا اور جوان بہن کو لے کر لاپتا ہوگیا۔ آخر میرے بوڑھے باپ نے ایسا کیا جرم کیا تھا یہ سوال ہر ذہن میں آئے گا۔

میرے اسپتال کے ڈاکٹر خالد لطیف جنہیں میں نے کل ہی اپنا استعفیٰ دیا تھا اور ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی میں نے استعفیٰ کا کوئی جواز پیش نہیں کیا تھا۔ وہ آج کا اخبار پڑھ کر اس جواز کو سمجھ جائیں گے جو میں ان سے چھپا رہا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اصول پرست انسان پولیس کو میرے بارے میں انفارم کردے کیونکہ ان کی نگاہ میں' میں ایک قتل کا مجرم تھا اور فرار ہو رہا تھا۔

اس روح فرسا خیال کے آتے ہی میں فوراً ہی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ میرا مزید وہاں ٹھہرنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے جیسے تیسے چائے ختم کی اور کاؤنٹر پر بل خود ہی ادا کرنے چلا گیا۔ بل ادا کر کے میں جیسے ہی پلٹا تو جیسے زمین نے میرے قدموں کو جکڑ لیا۔

میری نگاہ داخلی دروازے کی جانب اٹھی اور میں نے وہاں سے پولیس کی وردی میں ملبوس چند سپاہیوں کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا میں سمجھ گیا کہ اب میری خیر نہیں اپنے بوڑھے باپ کے قتل کے الزام میں اگر میں جیل گیا تو شاید زندگی بھر باہر آنے کا موقع نہ ملے۔

میں نے تیزی کے ساتھ اپنے چہرے کا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے ریستوران کے پچھلی طرف والے دروازے کی جانب دیکھا وہاں کچن بنا ہوا تھا اور اس کی سائڈ کی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا لوہے کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ شاید یہ دروازہ ملازمین کے آنے جانے یا خورد و نوش کا سامان لانے کے لیے بنایا گیا تھا۔

دروازے کے نگاہ میں آتے ہی میں پوری طرح سے گھوم گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

اس سارے کام میں تیس سیکنڈ کا عرصہ لگا ہوگا۔ میں اب دروازے کے سامنے موجود تھا اور میری پشت پر کچن کے سائڈ والی دیوار تھی میں فوری طور پر پولیس والوں کی نگاہ سے چھپ گیا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ دروازے پر صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ تالا نہیں لگا تھا میں نے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کچن کی کھڑکی جو اسی دیوار پر موجود تھی مجھے کسی نے اندر سے دیکھا اور آواز لگائی۔

”اے......! کون ہے؟“

میں نے آواز پر کوئی دھیان نہیں دیا اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھنے حماقت کی اس سے پہلے کہ وہ شخص مزید مجھ سے کوئی سوال کرتا یا باہر نکل کر آتا میں نے کنڈی کھول لی اور باہر نکل گیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی تا کہ فور طور پر کوئی میرے پیچھے نہ آ سکے۔ اب مجھ تک پہنچنے کے لیے اس کو ہال عبور کر کے کافی لمبا چکر کاٹ کر ادھر آنا تھا اور جب تک وہ یہاں پہنچتا میں اس کی پہنچ سے کافی دور نکل جاتا۔

باہر جا بجا گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، مگر شکر تھا کہ دروازے کے سامنے کی جگہ صاف ستھری تھی۔ جہاں یہ ریستوران بنا ہوا تھا۔ اس کی لائن میں اور بھی دوسری عمارتیں تھیں اور یہ سب کا پچھلا حصہ تھا۔ اس لیے یہاں پر کسی نے صفائی رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دوسری سائڈ پر چلنے لگا گندگی کی وجہ سے مجھے پیر رکھنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ویسے بھی میں بنیادی طور پر بہت نفاست پسند واقع ہوا ہوں اور گندگی اور بدبو مجھے برداشت نہیں ہوتی۔ مگر جب جان پر بنی ہو تو انسان گندگی میں تیر کر بھی اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ کافی لمبی گلی تھی۔ بالآخر میں اسی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ جگہ مین روڈ سے دور تھی۔ البتہ یہاں ایک ذیلی سڑک بنی تھی۔ جہاں اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ میں مین روڈ کی جانب جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں ریستوران کے سامنے پولیس کی موبائل کھڑی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب تک میری گرفتاری کے لیے پولیس نے جگہ

جگہ ناکہ بندی کر دی ہو۔

میرا اپنا موبائل تو فتح محمد اور اس کے ساتھیوں نے چھین لیا تھا یہ ایک معمولی اور سیکنڈ ہینڈ موبائل تھا جو کل ہی مجھے گولی استاد نے دیا تھا۔

میں ایک جگہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ لے دے کے ایک گولی استاد ہی تھا جو مسلسل میرے اس کڑے اور برے وقت میں میرے کام آ رہا تھا۔

میں نے گولی استاد کو فون کیا اور جلدی جلدی اس سے سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ میری بات سن کر گولی استاد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔

”کیا ہوا گولی استاد؟ اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو میں کچھ اور سوچتا ہوں۔“ میں نے تیزی سے اپنے چاروں جانب نگاہیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

”ارے نہیں شاہ زمان مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت میں نتھیا گلی میں ہوں اور تم پنڈی میں۔ تم تک پہنچنے میں مجھے ٹائم لگ جائے گا اور تمہارا اس جگہ سے فوری طور پر نکلنا بہت ضروری ہے دراصل میری گیراج میں کام کرنے والا شہزاد گاڑی کے کام سے کرنل حفیظ کے گھر گیا ہوا ہے۔ جس جگہ تم موجود ہو وہ جگہ کرنل کے بنگلے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں شہزاد کو ابھی فون کر کے کہتا ہوں کہ وہ تمہیں وہاں سے پک کر لے اور یہاں لے آئے میں اسے تمہارا فون نمبر بھی دے دوں گا تا کہ تم اسے صحیح لوکیشن بتا سکو۔“ گولی استاد نے بات ختم کر کے لائن کاٹ دی۔

میں سوچ رہا تھا کہ واقعی اگر گولی استاد خود مجھے لینے آتا تو اسے کافی ٹائم لگ جاتا یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس کا ایک بندہ یہاں پنڈی میں موجود ہے قدرت خود بخود میری مدد کر رہی تھی۔

ابھی میں سوچوں میں گم کھڑا تھا اور فکر مندی سے سب جانب نگاہیں دوڑا رہا تھا تب ہی ایک اجنبی نمبر سے مجھے کال آئی۔ میں نے فون فوراً ریسیو کر لیا آنے والی کال شہزاد ہی کی تھی۔ اس نے مجھ سے جگہ کنفرم کی اور کہا کہ وہ پانچ منٹ میں ہی میرے پاس آ رہا ہے۔

میرے پاس انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن کے گزر رہا تھا۔

اسی وقت کسی اسکول کی چھٹی ہو گئی اور بچوں کا ایک جم غفیر باہر آنے لگا ایک لحاظ سے یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا۔ میں انجانے میں اسکول کی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اب اتنے سارے بچوں کے رش میں فوری طور پر میرے دیکھے جانے کے امکانات کم تھے۔

اور پھر ایک لال رنگ کی آلٹو کار مجھے اپنی جانب آتی ہوئی دکھائی دی۔ اسکول کے قریب گاڑی آ کے رک گئی پہلے تو میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی کہ ہو سکتا ہے کوئی اپنے بچوں کو لینے کے لیے آیا ہوگا مگر جب ڈرائیور گاڑی سے باہر نکلا تو میں نے اسے پہچان لیا وہ شہزاد تھا اور میری تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

شہزاد سے میری بات چیت تو نہیں تھی مگر میں اسے شکل سے پہچانتا تھا گیراج میں ہی میں نے اسے دیکھا تھا فائزہ کی نماز جنازہ اور تدفین میں بھی وہ شریک تھا۔

شہزاد کو پہچان کر میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ میں نزدیک پہنچا تو اس نے مجھے دیکھ لیا وہ فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھنے میں لمحہ بھر بھی دیر نہیں کی میرے بیٹھتے ہی شہزاد نے گاڑی کو تیزی سے بھگانا شروع کر دیا اب ہم واپس نتھیا گلی کی جانب سفر کر رہے

تھے۔

شہزاد نے راستے میں بتایا کہ کرنل حفیظ گولی استاد کے بہت پرانے کسٹمر ہیں۔ ان کے پاس کئی اور گاڑیاں ہیں۔ مگر انہیں اپنی سب سے پرانی گاڑی بہت عزیز ہے۔ اس میں جب بھی گڑبڑ ہوتی ہے وہ گولی استاد کے پاس آتے ہیں۔ اب وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ خود گاڑی لے کر نہیں آتے بلکہ گولی استاد کو فون کردیتے ہیں اور گولی استاد کسی بندے کو بھیج دیتا تھا۔ ویسے عموماً وہ ہی کرنل حفیظ کے کام کے لیے آتا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب' اگر آپ کہیں تو میں آپ کے بارے میں کرنل صاحب سے بات کروں۔ ہوسکتا ہے وہ آپ کی کوئی مدد کرسکیں۔'' شہزاد نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر ایک نظر میرے سنجیدہ چہرے پر ڈالی اور کہا۔

''نہیں۔'' میں نے تیز اور سخت لہجے میں کہا۔ میرے لہجے کی تیزی اور سختی کو محسوس کر کے شہزاد کا چہرہ عجیب سا ہوگیا۔ مجھے فوراً ہی اس بات کا احساس ہوگیا تو میں نے حتی الامکان اپنا لہجہ نارمل کیا اور کہا۔

''نہیں شہزاد تم بھول کر بھی میرا ذکر کسی سے نہیں کرنا یاد رہے کسی سے بھی نہیں' شاید تمہیں میری پوزیشن کا اندازہ نہیں ہے۔ ظلم وستم میرے اوپر ڈھایا گیا ہے اور جن لوگوں نے یہ ظلم کیا ہے انہوں نے ہی مجھے مجرم بنا کے دنیا کے سامنے پیش کردیا ہے۔ میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اپنی صفائی پیش کروں۔ فی الحال تو میں اپنی جان بچالوں ان لوگوں سے پھر کہیں پرسکون جائے پناہ حاصل کر کے اپنی زندگی کا آگے کا لائحہ عمل ترتیب دینا ہے۔ میرے جسم کا رواں رواں انتقام کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ میرا سب کچھ لٹ گیا میرے پاس ماں باپ' بہن بھائی سب لوگ مجھ سے چھین لیے گئے تھے۔ میں پتا نہیں کتنی ڈھیٹ ہڈی ہوں جو اپنوں کے لاشے اٹھانے کے بعد بھی زندہ ہوں۔''

یہ سب کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی اور میں چپ ہوگیا۔

''مجھے معاف کردیجیے ڈاکٹر صاحب میں تو دل سے یہ چاہ رہا ہوں کہ آپ کو انصاف ملے یہ دنیا بڑی ظالم ہے اور ایک ایسے سمندر کی مانند ہے جہاں منہ کھولے بڑی مچھلیاں اور مگر مچھ چھوٹی مچھلیوں کو نگل رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اور گولی استاد آپ کے اپنے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہر وقت ہر پل ہیں۔ آپ کو جب بھی اور جیسی بھی ضرورت ہوگی ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔'' شہزاد نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''بہت بہت شکریہ میرے بھائی' واقعی تم اور گولی استاد میرے محسن ہو اگر تم لوگ نہ ہوتے تو میرا کون پرسان حال ہوتا اور نہ میری بہن کو کفن اور مٹی ملتی۔'' میں نے لاکھ روکنے کے باوجود گالوں تک بہ آنے والے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر باتوں باتوں میں راستا بھی کٹ گیا اور میں خیریت سے گولی استاد کی ورکشاپ واپس آ گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا۔ گولی استاد نے اپنا بستر میرے برابر میں لگا لیا تھا۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ میں اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا تھوڑی دیر بعد گولی استاد نے پوچھا۔

''کیا سوچ رہے ہو' شاہ زمان؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ ان لوگوں سے انتقام لینے کے لیے کوئی ایسا محفوظ پلان بناؤں کے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کچھ سوچا تم نے؟'' گولی استاد نے کہا۔

''وہی تو سوچ رہا ہوں تمہارے دماغ میں ہے کوئی آئیڈیا؟'' میں نے گولی استاد سے پوچھا۔

''آئیڈیاز تو بہت سے ہیں مگر ان پر عمل کرنا تمہارے جیسے انسان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔'' گولی استاد بستر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہ کہنے سے کیا مطلب ہے کہ تمہارے آئیڈیے پر عمل کرنا میرے جیسے انسان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے تم کہو تو سہی۔'' میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہلکے سے غصیلے لہجے میں کہا۔

''میرا مطلب ہے تم ٹھہرے لکھنے پڑھنے والے آدمی لڑائی بھڑائی سے تمہارا کبھی واسطہ نہیں پڑا اور تمہارے اندر ان شیطانوں جیسی شاطرانہ چالیں بھی نہیں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کے تمہاری پشت پر کوئی طاقت ور ہاتھ بھی نہیں ہے۔ یہ جو فتح محمد جیسے ٹکے آدمی تمہیں اتنی بڑی چوٹ پہنچا گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی پشت پر سردار شیر افضل' شیر زادہ خٹک اور راجہ جیسے لوگوں کا ہاتھ ہے اور اسی وجہ سے ساری پولیس بھی ان کے آگے کتے کی طرح دم ہلاتی ہے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ فتح محمد اور اس کے ساتھیوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا اور الٹا سارا الزام تمہارے اوپر ڈال کر تمہیں مجرم بنا کے دنیا کے آگے پیش کردیا۔ تمہارا گھر بار تباہ ہوگیا۔ خاندان ختم ہوگیا۔ تم دربدر ہوگئے نوکری گئی اور تم ہی سب سے اپنا منہ چھپاتے اور جان بچاتے پھر رہے ہو۔ یہ سارا کرشمہ طاقت کا ہے پیارے۔ ہمارے ملک میں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کرلو جو کرنا ہے۔'' گولی استاد نے بات ختم کی اور میری جانب دیکھنے لگا۔ میں اس کی باتوں میں چھپی سچائی کو تسلیم کررہا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔

''میری ان ساری باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ جب تک تمہاری پشت پر کوئی آہنی ہاتھ نہیں ہوگا تم ان لوگوں کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔'' گولی استاد نے ایک طویل سانس اپنے اندر اتاری اور خاموش ہوگیا۔

''تو اب تم مجھے یہ بھی بتادو کہ میں ایسا آہنی ہاتھ کہاں سے تلاش کروں جو میری پشت پناہی کرے۔'' میں نے زچ ہوکر کہا۔

''دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے پیارے۔'' گولی استاد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''دشمن۔'' میں نے پرسوچ لہجے میں زیر لب کہا۔

''ہاں دشمن! تمہیں ان لوگوں کے دشمنوں سے ہاتھ ملانا ہوگا۔ انہیں اپنی وفاداریوں کا یقین دلانا ہوگا ان کے لیے کام کرنا ہوگا۔ تب وہ لوگ تمہارے کام آسکیں گے۔'' گولی استاد نے اپنے پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکا لیے اور میرے قریب جھک کر میرے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

''مگر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ ان لوگوں کا دشمن کون ہے اور وہ مجھے کہاں ملے گا۔'' میں اس وقت بالکل احمقوں کی طرح گولی استاد سے سوالات کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں سے مسلسل مجھے جتنی ذہنی اذیت اٹھانی پڑی تھی اس نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کردیا تھا۔

''تم بھول رہے ہو شاہ زمان کہ سردار شیر افضل اور شیر زادہ خٹک کا تعلق سیاسی جماعتوں سے ہے۔ راجہ ایک صنعت کار ہونے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے ساتھ سیاسی وابستگی بھی رکھتا ہے اور ہمارے ملک میں بہت سی سیاسی جماعتیں ہیں۔ تمہیں ان کی سب سے

مضبوط حریف سیاسی جماعت میں شامل ہونا پڑے گا۔" پھر گولی استاد نے مجھے ان کی حریف سیاسی جماعت کا نام اور ان کے سربراہ کا نام بتایا۔

مجھے ویسے تو سیاست سے قطعی دلچسپی نہیں تھی کبھی کبھی اخبار میں یا ٹی وی پر نیوز چینل پر ان سیاسی جماعتوں کا نام سنا تھا اور ان کے سربراہ کو دیکھا تھا اور اتنا جانتا تھا کہ جماعت کے زیادہ تر کارکن غنڈہ گردی میں مشہور ہیں۔ یعنی دونوں جماعتیں ہی ایسی تھیں ایک دوسرے کی ہم پلہ۔ آئے دن دونوں جماعتوں کے کارکنان کی ایک دوسرے کو مارا ماری کی خبریں آتی رہتی تھیں۔

"ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

گولی استاد پہلے تو غور سے میری شکل دیکھتا رہا پھر اٹھ کر میری چارپائی پر میرے برابر میں آن بیٹھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بھاری لہجے میں کہا۔

"شاہ زمان!"

"آں ہاں۔" میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا

"ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے۔" گولی استاد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار! میں بھلا تمہاری کسی بات کا برا مان سکتا ہوں۔ اس بھری دنیا میں جب میں نے خود کو تنہا اور بے بس محسوس کیا تو ایک تم ہی تھے جس نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے سہارا دیا۔ اگر مجھے تمہارا سہارا اور آسرا نہ ملا ہوتا تو اللہ جانے میں......!" بات کرتے کرتے آنسوؤں کا ایک گولا میرے حلق میں پھنس گیا اور مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔

"تمہارے اندر جتنا غبار بھرا ہوا ہے وہ تم میرے کندھے سے لگ کر آنسوؤں کے ذریعے بہا دو۔ تمہیں جتنا رونا ہے۔ آج اور ابھی آخری بار جی بھر کے رو لو۔ اتنے آنسو بہاؤ کہ یہ آنسو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں سینے میں کچھ باقی رہے تو وہ صرف انتقام کی آگ۔"

یہ کہہ کر گولی استاد نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بھینچ لیا اور میں تو جیسے اس لمحے کا منتظر تھا۔ میں آنسو بہانے لگا۔ میرے سینے سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے ہنڈیا تیز آگ پر پک رہی ہو۔

میرے یہ آنسو نہ جانے کب سے میری آنکھوں میں قید تھے۔ میں انہیں بہا کے اپنے آپ کو بزدل کہلوانا نہیں چاہ رہا تھا میں یہ بھول گیا تھا کہ یہ انسانی فطرت ہے یہ آنسو ہی تو ہیں جو ہمارے دکھ کو کم کر دیتے ہیں اگر انہیں روکا نہ جائے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ بہہ کر انسان کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔

گولی استاد محبت سے میری پشت سہلا رہا تھا۔ پھر میرے آنسو خود بخود تھم گئے۔ شاید ختم ہو گئے تھے۔ میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ پھر میں گولی استاد سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ اٹھ کر گیا اور پانی کا گلاس بھر کے لایا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے سارا گلاس ختم کر ڈالا۔

گولی استاد نے خالی گلاس مجھ سے لے لیا اور کہا۔

"اٹھو اب اچھی طرح ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ ہم پھر بات کریں گے۔"

میں ایک معصوم بچے کی طرح گولی استاد کا ہر کہا مان رہا تھا۔ میں نے ہاتھ منہ اچھی طرح دھونے کے بعد وضو کر لیا یہ میری پرانی اور بچپن کی عادت تھی اماں نے ہم سب بہن بھائیوں کو یہی سکھایا تھا کہ خالی منہ ہاتھ نہ دھویا کرو بلکہ وضو کر لیا کرو ایک تو باوضو انسان

پاک رہتا ہے پھر اسے شیطانی وسوسے نہیں ستاتے۔ میں نماز کا بھی پابند تھا مگر کتنے دنوں سے میں نے ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھی تھی کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

وضو کر کے آیا تو گولی استاد سے جائے نماز مانگی جو اس نے مجھے خاموشی سے دے دی۔ میں نے عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر دو رکعت صلوٰۃ حاجت پڑھ کر اللہ سے اپنے لیے خصوصی مدد مانگی۔

نماز سے فارغ ہوا تو میں اپنے اندر بے پناہ توانائی اور عجیب طرح کی روشنی محسوس کی۔ اس دوران گولی استاد خاموشی سے بستر پر چت لیٹا رہا۔ میں یہ سمجھا کہ وہ سو گیا ہے۔ اس لیے جھک کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہت بہتر۔" میں نے مختصر جواب دیا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہا تھا اسی لیے کہا کہ جتنا سوگ اپنے پیاروں کا منانا ہے منالو مگر آج کے بعد نہیں۔ اب تم بہتر طریقے سے سوچ اور سمجھ سکتے ہو جو ہونا تھا وہ ہو چکا جتنا نقصان تم نے اٹھا لیا ہے اس سے زیادہ اور کیا اٹھاؤ گے اور اب تمہیں ایسا بننا ہے کہ نقصان اٹھانے کی باری ان سب کی ہے مگر بغیر تدبیر اور ترکیب سب بیکار ہے۔ اپنی تمام تر عقل اور ذہانت کو استعمال کر کے ان کے لیے ایسے گڑھے کھودنا ہے کہ وہ سب ان گڑھوں میں اترنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ میرا ایک مشورہ اور ہے تمہیں کہ تم کچھ عرصہ کے لیے مہوش کو بھول جاؤ۔ اگر تم دونوں کی محبت سچی ہے تو تم ضرور ملو گے مگر ابھی نہیں۔"

گولی استاد نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب وہ پھر بولا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم کراچی چلے جاؤ، کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ وہ انسانوں کا جنگل ہے اور انسان اسی جنگل میں گم ہو سکتا ہے۔ پنڈی ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں کے لوگ تم سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پھر یہاں شیر افضل اور شیر زادہ کے پالتو کتے بھی موجود ہیں۔ وہ مسلسل تمہارے پیچھے لگے رہیں گے اور تمہیں ختم کر کے ہی دم لیں گے۔"

"مگر میں کراچی کس کے پاس جاؤں اور کیا کروں۔" میں نے سوال کیا۔

"اب یہ تم سوچو اپنی عقل کا استعمال کرو۔ تمہیں کہاں جانا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔" گولی استاد نے اس طرح سے کہا جیسے ایک استاد بچے کو ایک سوال سمجھانے کے بعد اسے حل کرنے کے لیے دوسرا سوال دیتا ہے۔

"میں جانتا ہوں تم ایک ذہین آدمی ہو اگر ذہین نہ ہوتے تو اتنی پڑھائی کر کے ڈاکٹر کیسے بن جاتے۔ میری طرح کوئی ورکشاپ کھولے بیٹھے ہوتے۔" اس نے ہنس کر ازراہ مذاق کہا۔

"کراچی جا کے مجھے اس سیاسی جماعت میں شامل ہونا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "اور تمہارے اسی کام میں میں تمہاری اس طرح مدد کر سکتا ہوں کہ تمہیں ایک شخص کا پتا بتا دیتا ہوں تم اس سے جا کے مل لینا اور میرا نام بتا دینا۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری ضرور مدد کرے گا۔"

"ٹھیک ہے میں کل ہی کراچی کے لیے روانہ ہو جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں ابھی ایک ہفتہ ٹھہر جاؤ، ذرا یہاں کا معاملہ ٹھنڈا ہونے دو، ابھی تو پولیس تمہیں باؤلے کتوں کی طرح تلاش کر رہی ہو گی۔" گولی استاد نے کہا تو اس

کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔

اگلا ایک ہفتہ میں نے گولی استاد کی اسی ورکشاپ میں گزارہ۔ میرے پاس تقریباً آٹھ لاکھ روپے تھے۔ میں نے فلیٹ کا سامان بیچ کر کچھ رقم حاصل کی تھی کچھ رقم بینک میں تھی میں نے وہ رقم بھی نکلوالی تھی۔

ایک ہفتے میں میری شیو خاصی بڑھ چکی تھی بلکہ اس سے کئی روز پہلے سے میں نے شیو نہیں بنائی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے داڑھی رکھ لی ہے۔

اس دوران میں اور گولی استاد پلاننگ کرتے رہے۔ گولی استاد نے کراچی میں موجود اس شخص سے میری بات بھی کروادی۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور یہ بھی کہا کہ اگر میرا گھر تلاش کرنے میں دشواری ہو تو مجھے کال کر لینا۔ میں خود تمہیں آ کے لے جاؤں گا۔

شہزاد نے ٹرین میں میرے لیے سیٹ بک کروا دی۔ ایک ہفتہ بلکہ دس دن گولی استاد کے ہاں قیام کرنے کے بعد میں کراچی کے لیے روانہ ہوا۔

اسٹیشن تک گولی استاد اور شہزاد چھوڑنے کے لیے آئے سردیوں کے دن تھے۔ میں نے گرم چادر کو سر کے اوپر اس طرح سے اوڑھا ہوا تھا جس سے میرا چہرہ کافی حد تک چھپ گیا تھا۔

ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے میں گولی استاد کے گلے لگ گیا۔ اس نے نہایت گرم جوشی سے مجھے رخصت کیا اور کہا۔

"تم فکر نہ کرنا' میں یہاں کی پل پل کی خبریں تمہیں دیتا رہوں گا۔ کبھی بھی کوئی بھی ضرورت ہو گولی استاد کو ایک آواز دینا۔ گولی استاد گولی کی سی رفتار کے ساتھ تم تک پہنچ جائے گا۔" گولی استاد نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے گولی استاد ایک بات جو تمہارے بارے میں جان سکا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تمہاری زندگی کے بہت سے رخ ہیں۔ جن کو تم مجھ سے چھپا گئے ہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کک...... کون سے رخ؟" گولی استاد نے گھبرا کے کہا۔

"تم یہاں نتھیا گلی میں بیٹھے ہو اور کراچی میں موجود ایک سیاسی جماعت کے بندے سے تمہاری اتنی دوستی ہے کہ تم مجھے اعتبار کر کے اس کے پاس بھیج رہے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس اپنا تو کام ہی ایسا ہے کہ ہر طرح کے لوگ ورکشاپ پر آتے رہتے ہیں۔ بس یوں ہی دعا سلام ہے۔" گولی استاد نے بے نیازی دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ صرف دعا سلام تک کی بات نہیں ہے گولی استاد! بات اس سے آگے کی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"یہ تم کس طرح کی بلاوجہ باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ دیکھو ٹرین کے روانہ ہونے کا ٹائم ہو گیا ہے تم چل کر اپنی سیٹ سنبھالو اور ہاں وہاں پہنچتے ہی مجھے فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دینا۔" گولی استاد نے میری بات کو گول کرتے ہوئے توجہ ٹرین کی جانب کروائی۔

ٹرین نے وسل بجانی شروع کر دی تھی۔ یہ ٹرین پنڈی سے کراچی جا رہی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر اپنا بیگ سنبھال کر بیٹھ گیا جس میں میرے چند جوڑوں کے علاوہ میری تعلیمی اسناد اور آٹھ لاکھ کی رقم تھی۔

ٹرین نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا تو گولی استاد اور شہزاد ٹرین سے اتر گئے اور ہم لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر اس وقت تک ہاتھ ہلاتے رہے جب تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

میں نے اپنا بیگ اپنی گود میں رکھ کر اپنے دونوں

ہاتھ بیگ پر رکھ لیے اور سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ میری زندگی ایبٹ آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں اپنے والدین کے پر شفقت سائے میں شروع ہوئی میں اس گھر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ بابا کی شدید خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں نے ڈاکٹر کی تعلیم بابا کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے حاصل کی تھی۔ میں جب بھی کتابیں کھول کر پڑھنے کے لیے بیٹھتا تو بابا کا چہرہ تصور میں آجاتا اور میں سوچتا جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گا تو بابا کتنا خوش ہوں گے اور ان کا خوشی سے چمکتا اور دمکتا ہوا چہرہ میرے تصور میں آجاتا اور میں ایک نئی لگن اور توجہ کے ساتھ اپنی پڑھائی شروع کردیتا۔

میرے بعد اللہ تعالیٰ نے بابا کو مزید ایک بیٹا اور بیٹی دی۔ مگر ارمان نے بابا کا یہ خواب پورا نہ کرکے دیا کہ وہ انجینئر بنے وہ شروع ہی سے پٹھان دماغ کا تھا اور صرف اس کی وجہ سے حالات خراب سے خراب ہوتے چلے گئے۔

بعد میں حالات خراب ہونے کا ذمہ دار میں نے اپنے آپ کو بھی ٹھہرایا میں نے بھی ضد میں آ کے بابا کا کہنا نہ مانا۔ میں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ بعض اوقات ہم اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ ایسے فیصلے کر جاتے ہیں جن پر ہمیں زندگی بھر پچھتانا پڑتا ہے۔

ٹرین میں ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ ٹرین چل پڑی تھی لیکن لوگ ابھی تک سیٹوں پر جھگڑ رہے تھے۔ بعض لوگ ریزور سیٹوں پر قبضہ کرکے بیٹھ جاتے میں ان سب باتوں سے بے زار آنکھیں موندے بیٹھا تھا میرے لیے ان ہونے والے جھگڑوں میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔

ٹرین اپنی فل رفتار سے دوڑی چلی جارہی تھی۔ لوگ بھی آہستہ آہستہ اپنے جھگڑے نمٹا کر اپنی اپنی جگھوں پر پرسکون ہو کر بیٹھ گئے اور ٹرین میں مچنے والا شوروہنگامہ تھم گیا۔ کہیں سے کسی بچے کے رونے کی یا پھر مسافروں کی آپس میں باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

میں بھی اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر نکل آیا اور ڈبے میں اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ تب میری نگاہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر پر پڑی۔ وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی ہماری آپس میں نگاہیں ملیں وہ مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرادیا۔ اخلاقاً مجھے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب رسمی مسکراہٹ سے دینا پڑا۔

"آپ کراچی جارہے ہیں یا راستے میں اتر جائیں گے؟" اس نے جھٹ سوال کرڈالا۔

"کراچی جارہا ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میں بھی کراچی ہی جارہا ہوں۔ اچھا ہے ہمارا ساتھ رہے گا۔" اس نے کہا تو میں نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

"آپ کا اپنا گھر ہے یا کسی رشتے دار کے گھر ملنے جارہے ہیں۔" اس نے پھر سوال کیا۔

"کسی سے ملنے جارہا ہوں۔" میں نے چہرے سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے اس کے سوالات سے الجھن ہورہی تھی اور وہ تھا کہ میرا انٹرویو کررہا تھا۔

"اچھا!" اس نے میری بے زاری کو اگنور کرتے ہوئے دلچسپی سے کہا۔ "کراچی میں کس جگہ جارہے ہیں۔ میرا تو گھر ہے ناظم آباد میں۔"

"لمحہ بھر کو تو میں چکرا گیا کہ کراچی میں کس جگہ کا نام لوں۔ کیونکہ میں آج تک کراچی نہیں گیا تھا۔ پھر

اچانک ہی مجھے یاد آیا میرا ایک دوست تھا کالج کے زمانے کا' وہ گلشن اقبال کا بہت ذکر کیا کرتا تھا۔ وہاں اس کے ماموں رہا کرتے تھے اور اس کی بچپن سے ہی ماموں کی لڑکی سے بات طے تھی۔ اس لیے میرے منہ سے بے ساختہ گلشن اقبال نکل گیا۔

"کس بلاک میں؟" اس نے پھر سوال کیا۔ عجیب لیچڑ انسان تھا میں جھنجلا گیا اور کہا۔

"مجھے نہیں معلوم میرے کزن مجھے اسٹیشن پر لینے آئیں گے۔"

"کیا پہلی مرتبہ جارہے ہیں۔"

"جی۔"

"ارے اتنے سارے سوالات کر لیے اور سب سے اہم بات تو پوچھی نہیں۔" اس نے اچانک کچھ یاد آجانے پر ہنستے ہوئے کہا تو میں نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا۔

"میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں' کیا نام ہے آپ کا۔ ویسے مجھے جاوید کہتے ہیں اور میں ایک پرائیوٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ پنڈی میں خالہ کا انتقال ہوگیا تھا امی بیمار ہیں۔ اس لیے میں اکیلا ہی تعزیت کے لیے چلا گیا تھا گھر میں میرے علاوہ امی ہیں اور ایک چھوٹی بہن ہے عشاء۔" وہ ایک انتہائی باتونی شخص تھا۔ میرے بنا کچھ پوچھے ہی اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ پھر بولا۔ "آپ اپنے بارے میں بھی کچھ بتائیے نا۔ بھئی یہ اتنا لمبا سفر تو اس طرح باتیں کرتے ہوئے ہی آسانی سے کٹ سکتا ہے۔ مگر مجھے لگ رہا ہے کہ آپ میری باتوں سے بور ہورہے ہیں۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا تو آئی ایم سوری' میں خاموش ہوجاتا ہوں۔"

وہ میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھتے ہوئے بولا تو مجھے اپنی بداخلاقی کا احساس ہوا میں ایسا تو کبھی نہیں تھا اس لیے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں' نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں بور نہیں ہورہا۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ یہ لمبا سفر تو اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہی کٹ سکتا ہے۔"

میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور کہا۔ "میرا نام سلمان ہے۔ اتفاق سے میرے بھی رشتے داروں میں انتقال ہوگیا تھا۔ میں بھی تعزیت کے لیے جارہا ہوں میں بھی ایک اسپتال میں جاب کرتا ہوں وارڈ بوائے ہوں۔ والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ بہن بھائی کوئی ہے نہیں اس لیے تنہا رہتا ہوں۔"

"اوہ!" اس نے میری تنہائی کا سن کر افسوس کا اظہار کیا پھر بولا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کرلیتے' برسر روزگار ہیں اور تنہا بھی تو پھر کوئی اچھا سا ساتھی ڈھونڈ لیں۔ زندگی آسان ہوجائے گی۔"

"کیوں کیا آپ کی شادی ہوگئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میرا بس چلے تو ابھی کرلوں۔" کہہ کر اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ مگر ابھی مجھے اپنی بہن کی شادی کرنی ہے۔ والد صاحب ہیں نہیں۔ امی کی بھی یہی خواہش ہے کہ پہلے عشاء کی شادی ہوجائے پھر وہ چاند سی بہو ڈھونڈ کر لائیں گے۔"

تب میں نے اسے غور سے دیکھا وہ ایک خوش شکل اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ گورا رنگ اور براؤن بال تھے۔ قد اور جسامت بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ کوئی بھی لڑکی اسے بخوشی اپنا سکتی تھی۔ یہ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ میری اور اس کی ظاہری شخصیت میں بہت سی چیزیں یکساں تھیں۔ ہم دونوں ہی گورے تھے۔ دونوں کے بال براؤن تھے اور قد اور جسامت بھی

تقریباً ایک جیسی تھی۔

مجھے اس وقت بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ قدرت میرے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے مگر اس کے ساتھ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے میں بھی کچھ اور سوچ کر اپنے گھر سے نکلا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دوسری ہی پلاننگ کر رکھی تھی اور شاید یہ سب ہونا میرے لیے بہتر تھا۔

چند گھنٹوں میں ہم ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ اس باتونی نوجوان کی باتوں میں، میں اپنی ساری ٹینشن بھول گیا اس نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھایا اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے تاکید کی کہ کراچی پہنچ کر مجھے جب بھی ٹائم ملے میں اس کے گھر ضرور آؤں۔

ٹرین مختلف اسٹیشنوں پر رکتی رہی۔ جاوید ہر اسٹیشن پر اترتا اور کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے لے آتا اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ شامل کر لیتا ایک دو دفعہ اس نے مجھ سے بھی کہا کہ میں بھی اس کے ساتھ اتروں مگر میں نے انکار کر دیا میں اترنا نہیں چاہتا تھا۔

''ارے یار ذرا ٹانگیں ہی سیدھی کرنے کے لیے تھوڑا اچل پھر لو۔ ورنہ یوں ہی بیٹھے بیٹھے ٹانگیں جڑ جائیں گی۔'' اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کیا۔ مگر میں نے جواب دیا کہ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

رات ہو گئی ٹرین میں مزید سناٹا چھا گیا زیادہ تر لوگ سو گئے بعض لوگ صرف اونگھ رہے تھے۔ جاوید بھی سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکائے سو رہا تھا۔ مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ کتنی ہی دردناک یادیں تھیں جنہوں نے میری نیند کو میری آنکھوں سے چھین لیا تھا اور کچھ اچھی اور بہت سی تکلیف دہ یادیں ہی اب میری زندگی کا سرمایہ تھیں۔ بار بار کی تکلیف دہ موت اور فائزہ کی بے حرمتی اور پھر اس کی موت کا منظر میری آنکھوں میں اتر آتا اور نیند میری آنکھوں سے بھاگ جاتی ان لمحات کی چلن، چبھن اور سوزش میری آنکھوں کا حصہ بن گئی تھیں۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی ہر جانب اندھیرے کا راج تھا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا ہم نہ جانے کس شہر سے گزر رہے تھے۔

اچانک ہی جیسے ٹرین پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دھماکہ سا سنائی دیا پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ چیخ و پکار، آہ و فغاں، کراہیں۔

میں بھی کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ بہت سامان اور ایک انسانی وجود میرے اوپر تھا یہ میں نے ہوش میں آ کے دیکھا۔

مجھے چوٹیں آئی تھیں شاید وہ کسی کا بیگ تھا جو سامان سے بھرا ہوا تھا وہ میرے سر پر گرا تھا مجھے صرف اتنا ہی یاد تھا پھر میں اپنی سیٹ سے گر پڑا۔

میں اور جاوید کھڑکی کے ساتھ لگی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ شاید میرے اوپر گرنے والا شخص جاوید تھا۔ ٹرین کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ کوئی بم دھماکہ ہوا تھا۔ یا ٹرینیں ایک ہی پٹری پر آمنے سامنے ایک دوسرے سے ٹکرا گئی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا جس ڈبے میں، میں سفر کر رہا تھا۔ وہ بھی پٹری سے اتر گیا تھا۔

میں نے بمشکل اپنے زخمی وجود کو سامان کے نیچے سے نکالی پھر اپنے اوپر پڑے ہوئے شخص کو سیدھا کیا۔ وہ جاوید تھا۔

''جاوید، یار جاوید......!'' میں نے زور زور سے اسے پکارا۔ وہ بری طرح زخمی تھا اس کا آدھا چہرہ کسی چیز سے رگڑ کھا کر اس طرح چھل گیا تھا کہ چہرے کی کھال اتر گئی تھی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اس کی روشنی میں جاوید کا جائزہ لیا وہ زندہ تو تھا مگر اس کی سانس اٹک اٹک کر آ رہی تھی۔ اس کے سر پر بھی چوٹ لگی تھی۔ خون بہت تیزی کے ساتھ اسی کے جسم سے بہہ رہا تھا۔

میرے چاروں طرف قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ جو لوگ میری طرح زیادہ زخمی نہیں تھے وہ اپنے پیاروں کو تلاش کر رہے تھے انہیں دیکھ رہے تھے۔

حادثہ ابھی ابھی ہوا تھا اس لیے مدد آنے میں بھی ٹائم لگ سکتا تھا جلدی سے کوئی ایمبولینس آ جائے تو میں جاوید کو اسپتال پہنچا سکوں گھر پر اس کی بیوہ ماں اور جوان بہن کتنی شدت سے اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔

پریشانی کے عالم میں، میں بار بار جاوید کو آوازیں دے رہا تھا۔ اچانک میں نے ہاتھ پر جاوید کے ہاتھ کی گرفت محسوس کی اس کی آنکھیں بند تھیں اور اسی کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا اور پھر......!

میرے ہاتھ سے اس کی ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کا جسم ایک زور کا جھٹکا لے کر ساکت ہو گیا۔ اف میرے خدایا! یہ تو مر گیا......! میرا دل چاہا میں ایک بار پھر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں کتنا مخلص اور پیارا تھا یہ انسان۔ جس نے چند گھنٹوں میں ہی اپنی خوش اخلاقی سے میرا دل جیت لیا تھا اس کی رفاقت میں، میں جیسے اپنے دکھ کو بھولنے لگا تھا۔

پریشانی کے عالم میں میں چاروں جانب دیکھ رہا تھا اور پھر میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا اور میں لمحہ بھر میں ایک مسیحا ایک ڈاکٹر سے ایک سفاک انسان بن گیا۔ میرے اندر سے کوئی چیخ چیخ کر مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''شاہ زمان صرف ایک منٹ کی بات ہے صرف ایک منٹ کی تمہیں جو کچھ کرنا ہے وہ اسی لمحے میں کرنا ہے۔ یہ وقت اگر نکل گیا۔ تو ایسا سنہری موقع تمہیں شاید دوبارہ نہیں مل پائے گا۔ تمہیں ایسا کرنا ہو گا شاہ زمان۔'' میں نے اپنا سر جھٹک کر اس خیال کو رد کرنا چاہا تو میرے اندر سے دوبارہ کوئی چیخا۔

اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے دشمن تمہاری جانب سے بے فکر ہو جائیں گے تم جاوید کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کر رہے تم صرف اس کے اس بیکار وجود کو اپنا نام اپنی شناخت دے رہے ہو۔ کل ساری دنیا کو پتا چل جائے گا کہ ڈاکٹر شاہ زمان جو ایبٹ آباد کا رہائشی تھا پنڈی کے ایک اسپتال میں جاب کرتا تھا ٹرین حادثے میں مارا گیا۔

مگر جاوید، اس کی بیوہ ماں اور بہن کو یہ پتا نہیں چلے گا کہ وہ کہاں لاپتا ہو گیا۔ وہ گھر کیوں نہیں آ رہا۔ ان کی خبر کیوں نہیں لے رہا انہیں فون کیوں نہیں کرتا۔ مرنے والے کا تو لوگوں کو کبھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے مگر لاپتا ہونے والے کے کھو جانے پر کبھی دل کو قرار نہیں آتا۔ میرے ضمیر نے کہا۔

اور چند لمحوں کی ایک جنگ میں میرا دماغ جیت گیا۔ میں نے فوراً ہی اپنی جیب سے اپنا پرس نکالا اس میں جو رقم تھی وہ میں نے اپنی میں جیب میں ڈالی۔ پھر کچھ رقم واپسی پر پرس میں رکھ دی پھر جاوید کی جیبوں کی تلاشی لی اس کا پرس میرے ہاتھ میں آ گیا۔

میں نے اپنا پرس جاوید کی جیب میں رکھ دیا۔ جس میں میرا شناختی کارڈ اور اسپتال کا کارڈ تھا۔ مشی کی ایک تصویر تھی۔ فی الحال میں نے جاوید کے پرس کی تلاشی نہیں لی، پھر دوبارہ اس کی جیبوں کو ٹٹولا وہ خالی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اپنا بیگ تلاش کیا۔ جو خوش قسمتی سے مجھے نزدیک ہی مل گیا۔

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"معاف کرنا دوست، میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ مگر کیا کروں میری مجبوری تھی کہ مجھے ایسا کرنا پڑا۔ تم واقعی ایک بہت اچھے انسان ہو کہ مرنے کے بعد بھی میرے اتنے کام آ گئے ہو۔"

میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پیر میں زبردست چوٹ لگی تھی۔ مجھ سے اپنا وزن بھی پاؤں پر ڈالا نہیں جا رہا تھا۔

ڈبہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے ڈبے سے باہر آیا۔ دور سے مجھے ایمبولینسوں اور لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ امدادی ٹیمیں حادثے کی جگہ پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ بہت سے ٹی وی چینل والے بھی تھے۔

اب یہاں ایمرجنسی لائٹوں سے روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ بہت سی گاڑیاں اور ایمبولینس یہاں آ چکی تھیں۔

میں بیگ اٹھائے لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ تب ہی ایک شخص میرے نزدیک آیا اور بولا۔

"آیئے آیئے ایمبولینس میں بیٹھ جائیں۔ ہم زخمیوں کی مدد کے لیے ہی یہاں آئے ہیں۔" وہ کوئی رضا کار تھا۔ اس نے مجھے زخمی حالت میں دیکھا تو بولا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں زیادہ زخم نہیں آئے ہیں۔ آپ دوسروں کی خبر لیں۔ جو زیادہ زخمی ہیں انہیں پہلے اسپتال پہنچائیں۔" میں نے کہا۔

"آپ بھی تو زخمی ہیں دیکھیں آپ کا بھی خون بہہ رہا ہے ٹانگ سے ہاتھ سے!" اس نے کہا۔

"میں نے کہا نا میں زیادہ زخمی نہیں ہوں آپ دوسروں کو دیکھیں۔" یہ کہہ کر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ رضا کار بھی مجھے چھوڑ کر زخمیوں کو ڈبے سے نکالنے لگا۔ مگر میں زیادہ چل نہیں سکا۔ میرے پاؤں میں ناقابل برداشت درد ہونا شروع ہو گیا تھا اور بھاری بیگ کو بھی سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میں زمین پر بیٹھتا ہی چلا گیا۔

اتنے میں وہی کارکن مجھے اپنی جانب آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے قریب آ کر وہ رک گیا اور بولا۔

"کیا ہوا؟ بہت درد ہو رہا ہے آپ اسپتال چلیں مرہم پٹی ہو جائے گی دوا لیں گے تو آرام آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی چلتے ہیں۔" میں نے مجبور ہو کر کہا اور اٹھنے کی کوشش کی مگر مجھ سے اٹھا نہ گیا۔ تب اس نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کیا اور ایک ایمبولینس میں بٹھا دیا۔ جہاں دوسرے ایسے زخمی بیٹھے تھے جنہیں زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں اور معمولی سے علاج سے وہ ٹھیک ہو سکتے تھے۔

ایمبولینس بھر گئی تو ہمیں اسپتال کی جانب لے کر سائرن بجاتی ہوئی تیزی کے ساتھ دوڑنے لگی۔ سب آپس میں ٹرین کے حادثے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

مجھے ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم کس شہر میں ہیں۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ روہڑی کا اسٹیشن آنے والا ہے۔ ہمیں روہڑی کے ہی اسپتال میں لے جایا جا رہا ہے۔

"کراچی ابھی کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو خاصا فاصلہ ہے۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

ایمبولینس میں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے ہاتھ اور پاؤں کی چوٹ کا جائزہ لیا۔ پاؤں پر ورم آنا شروع ہو گیا تھا۔ ہڈی پر چوٹ لگی تھی۔ میں نے ہاتھ کا زخم بھی دیکھا یہاں خاصا گہرا کٹ لگا تھا۔ یہاں زخم کو سینے کے لیے ٹانکے لگانے کی ضرورت تھی۔ چوں کہ

میں خود بھی ڈاکٹر تھا اس لیے سب جانتا تھا۔

اسپتال میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ یہاں بھی لوگوں کا بہت رش تھا۔ مسلسل ایمبولینس یہاں آ رہی تھیں۔ ایک شور، ہنگامہ اور عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

یہاں بہت سے نیوز چینل والے رپورٹر اور کیمرہ مین تھے۔ وہ یہاں آنے والے ان لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ حادثے کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔ جو میری طرح کم زخمی تھے اور اپنے پورے ہوش و حواس میں تھے۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ کوئی رپورٹر میرے نزدیک نہ آنے پائے۔

ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر نے میرا زخم دیکھا اور ساتھ کھڑی نرس سے کہا۔ "انہیں پٹی کر دو۔"

"ڈاکٹر زخم خاصا گہرا ہے اس پر ٹانکے لگنے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر میں ہوں یا آپ......؟" وہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اس نے رک کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر تو آپ ہی ہیں مگر میرے بازو کا زخم بغیر ٹانکوں سے خراب ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیں مسٹر یہاں بہت سے زخمی آ رہے ہیں۔ بعض زخمی بہت شدید نوعیت کے ہیں۔ اگر ہم ایک ایک پر اتنا زیادہ ٹائم دیتے رہے تو دوسرے زخمیوں پر توجہ نہ دے سکیں گے فی الحال آپ اس زخم کی ڈریسنگ کروا لیں۔ بعد میں دیکھ لیں گے۔" ڈاکٹر نے کہا اور میرے پاس سے ہٹ کر دوسرا زخمی دیکھنے لگی۔

نرس نے میرے بازو کی ڈریسنگ کی اور مجھے گولیاں کھانے کے لیے دیں۔ میں نے نرس سے کہا۔

"یہ کون سی دوا ہے؟"

"ارے بھئی کون ہو تم ہر بات کی اتنی تحقیق کر رہے ہو، ڈاکٹر نے لکھ کر دی ہے درد میں افاقہ ہوگا۔" نرس نے چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک انجکشن کا نام لیتے ہوئے اس سے کہا کہ اگر اس کے پاس یہ انجکشن ہو تو وہ مجھے لگا دے تو نرس کھڑے ہو کے مجھے گھورنے لگی پھر بولی۔

"ڈاکٹر ہو......؟"

"جو تم سمجھ لو!" میں نے کہا۔

"نہیں یہ انجکشن نہیں ہے، یہ مہنگا آتا ہے فی الحال تمہیں نہیں لگ سکتا تم یہ گولیاں کھا لو۔" اس نے پانی کی بوتل اور گولیاں میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے گولیاں اپنے حلق میں ڈالیں اور بوتل سے منہ لگا کر پانی کے چند گھونٹ لے لیے۔ نرس نے بوتل میرے ہاتھ سے لے لی اور بولی۔

"تم کہاں جا رہے تھے؟"

"کراچی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"پتا نہیں ریلوے والے کسی دوسری ٹرین سے مسافروں کو بھیجنے کا انتظام کرتے بھی ہیں یا نہیں ورنہ تو تمہیں خود ہی جانا پڑے گا۔" اس نے کہا پتا نہیں کیوں وہ مجھ سے بات کرنے کھڑی ہو گئی تھی۔

"نہیں میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ یہاں سے مجھے ایسی ٹیکسی مل جائے گی جو مجھے کراچی لے جائے۔ میں اسے پورا پورا معاوضہ دوں گا۔"

"مل تو سکتی ہے مگر تمہیں دونوں طرف کا کرایہ اسے دینا ہوگا۔ کیونکہ اتنی دور اسے پیٹرول خرچ کر کے واپس بھی تو آنا ہوگا۔" نرس نے کہا۔

اس وقت صبح کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ نرس نے کہا کہ "اس کی رات کی ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے مگر چونکہ اسپتال میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے۔ اس لیے شاید کسی کو بھی گھر جانے کی اجازت نہ ملے۔ اگر میری چھٹی ہو گئی تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گی۔ میرا بھائی کرائے پر

گاڑیاں چلاتا ہے۔ میں اس سے بات کر کے تمہارے جانے کا انتظام کروادوں گی۔"

"اگر تمہاری چھٹی نہ بھی ہو تو تم اپنے بھائی کو فون کر کے یہاں بلوالو۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، تم وہاں اس بینچ پر جا کے بیٹھ جاؤ، کہیں جانا مت......!" اس نے سامنے بنی ہوئی لکڑی کی بینچ کی جانب اشارہ کیا جس پر پہلے ہی ضرورت سے زیادہ لوگ بیٹھے تھے میں لنگڑاتا ہوا چلتا گیا اور بینچ کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اچھا ہے میں کسی کی پرائیویٹ گاڑی میں آرام سے چلا جاؤں۔ نرس بھی بظاہر تو مجھ سے ہمدردی دکھا رہی ہے مگر میری صورت میں اسے ایک موٹا مرغا مل گیا ہے اور اس کے ہاتھ بھی رقم آسکتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد نرس پھر دوبارہ نمودار ہوئی اور بولی۔

"میں تو آج گھر نہیں جاسکوں گی۔ اس لیے تمہارے کہنے کے مطابق میں نے اپنے بھائی سے تمہارے لیے بات کرلی ہے۔ وہ اتنی دور جانے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ مگر میں نے تیار کرلیا ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ سسٹر تم نے میرا اتنا خیال کیا ورنہ میں تمہارا لگتا ہی کیا ہوں جو تم میرے بارے میں سوچو۔"

"ارے نہیں شکریے کی کیا بات ہے انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور وہ انسان ہی نہیں جو کسی کے کام نہ آئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر چونک کر بولی۔

"ارے تمہارے پاؤں میں تکلیف ہے تم کھڑے کیوں ہو اور اوپر سے تم نے اتنا بھاری بیگ اپنے کندھے پر لٹکا رکھا ہے اسے نیچے رکھ دو۔"

"یہاں بیٹھنے کی جگہ کہاں ہے سسٹر!" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اچھا لاؤ اپنا یہ بیگ مجھے دے دو، جاتے ہوئے مجھ سے لے لینا۔" اس نے بیگ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں۔" میں نے بے ساختہ اپنا ہاتھ بیگ پر رکھا اور بیگ پیچھے کرلیا۔

"ارے تم تو گھبرا گئے بیگ میں کیا قارون کا خزانہ ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو میں مسکرا دیا۔ پھر میں نے بیگ نیچے فرش پر رکھا اور اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ کیونکہ مجھ سے مزید کھڑا نہیں ہو جا رہا تھا۔

مجھے یہاں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ نرس بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اسپتال میں ایمبولینسوں اور زخمیوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ جن کے پیارے انہیں چھوڑ کے چلے گئے تھے وہ رو پیٹ رہے تھے۔ اس ماحول میں بیٹھ کر میری ذہنی حالت پھر سے خراب ہونے لگی میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

آخر وہ نرس مجھے سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی سرنج تھی وہ بولی۔

"میں نے چپکے سے اسپتال سے وہ انجکشن اڑا لیا جو تم نے بتایا تھا۔ وہ تمہیں لگانے آئی ہوں۔ میرا بھائی بھی اپنی گاڑی لے کر آ گیا ہے تم اس سے کرایہ طے کرلو۔"

بات کرنے کے دوران وہ میرے بازو میں انجکشن انجکٹ کرچکی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر بیگ اٹھایا اور نرمی کے ساتھ باہر جانے لگا۔ نرس تیز تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ بار بار کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتی کبھی محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتی میری ٹانگ میں درد تھا اس لیے میں تیز نہیں چل سکتا تھا۔ •

"کیا بات ہے سسٹر تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟" میں نے اس کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی میری بہت سخت ڈیوٹی لگی ہوئی ہے تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ کتنی زیادہ تعداد میں زخمی آرہے ہیں۔ منٹ منٹ میں میری آواز پڑ رہی ہوتی ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

ہم اسپتال کے گیٹ پر پہنچ گئے تھے وہیں مجھے ایک بدمعاش ٹائپ آدمی جس کی عمر چھتیس یا چالیس سال کی ہوگی ایک کرولا کار کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بولی۔

"یہ میرے بھائی جان ہیں تم خود ہی ان سے کرایہ طے کرلو۔ اچھا میں جارہی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ ملائے تو اچھے حالات میں ملائے۔" اور وہ تیزی کے ساتھ مڑ گئی۔

میں نے اس شخص کی بدمعاش ٹائپ پرسنالٹی کو نظرانداز کیا اور اس سے کرائے کی بات کرنے لگا ذرا سی بحث کے بعد ہم نے کرایہ طے کرلیا اور میں اس کی کرولا میں بیٹھ گیا۔

مجھے بھوک بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ البتہ چائے پینے کی شدت سے خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے اس ڈرائیور سے کہا کہ میں چائے پینا چاہتا ہوں تو اس نے ایک چائے کے کھوکھے پر گاڑی روک لی اور خود اتر کر میرے لیے چائے لے آیا اور ناشتے کے بارے میں بھی پوچھا مگر میں نے انکار کردیا اور پوچھا کہ ہم کراچی کب تک پہنچ جائیں گے تو اس نے بتایا آٹھ سے دس گھنٹے لگ جائیں گے۔

"راستے میں کھانے کے لیے کچھ مل جائے گا ناں۔" میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ راستے میں چھپر ہوٹل ملیں گے آپ جہاں کہیں گے گاڑی روک دوں گا۔"

میرا سر بہت زیادہ بھاری ہو رہا تھا اور سارے جسم میں درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت تو مجھے درد و تکلیف کے بارے میں اتنا محسوس نہیں ہوا مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مجھے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کراچی پہنچ کر اپنے زخموں اور چوٹوں کا خود معائنہ کروں گا اور دوا لوں گا۔"

میں نے چائے کا مگ خالی کر کے ڈرائیور کو دیا اور ساتھ ہی چائے کے پیسے بھی دیے پھر میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکایا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ پھر مجھے اپنے بیگ کا خیال آیا۔ یہ بیگ میرے لیے بہت قیمتی تھا اس میں میری ساری جمع پونجی آٹھ لاکھ کے کرنسی نوٹوں کی صورت میں تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ مجھے جلدی ہوش آگیا اور میں نے اپنا بیگ بھی تلاش کرلیا ورنہ اگر دوسرے لوگ آجاتے تو شاید مجھے اس میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ سارے لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔ ایسے ہولناک حادثے پر لوگوں کی مدد کے بہانے پہنچ جاتے ہیں اور وہاں بجائے مدد کرنے کے زخمیوں اور مرجانے والوں کا مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں۔

میں نے ابھی تک اپنا بیگ کھول کر نہیں دیکھا تھا اب گاڑی میں بیٹھا تو اطمینان ہوا اور میں نے بیگ کی زپ کھول کر کپڑوں کی تہہ میں رکھے نوٹوں کی گڈیوں کو ہاتھوں سے چھو کر اطمینان کرلیا کہ میرا مال محفوظ ہے۔

میں نے بیگ جو سیٹ پر میرے پاس ہی رکھا تھا۔ اٹھا کر اپنے پیروں کے پاس رکھ لیا اور پوری سیٹ پر اپنے پاؤں پھیلا لیے سیٹ کافی بڑی اور آرام دہ تھی۔

"صاحب آپ بیگ کو اگلی سیٹ پر رکھ دیں اور آرام سے ہاتھ پاؤں پھیلا لیں۔ چاہیں تو سو جائیں

سفر کافی طویل ہے۔" ڈرائیور نے لمحہ بھر کو گردن گھما کے مجھ سے کہا۔

"نہیں یہ یہیں ٹھیک ہے، میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ نیند آئی تو سو بھی جاؤں گا بس تم مجھے خیریت سے میری منزل پر پہنچا دو۔" میں نے کہا۔

"بے فکر رہیں صاحب اپنا تو کام یہی ہے ایک شہر سے دوسرے شہر مسافروں کو لے جاتا ہوں۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

پھر میں ڈرائیور سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا۔ اس کے کاروبار کے مطابق کہ اس کے پاس کتنی گاڑیاں ہیں اور یہ بھی کہ اس کی گاڑی کافی اچھی اور آرام دہ ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے بہت گہری نیند آ رہی ہے۔ میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گہری نیند میں چلا گیا اور کتنی دیر تک سوتا رہا۔

آنکھ کھلی تو عجیب سا احساس ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں ہوں۔ ہر جانب گھور اندھیرا کیوں ہے۔ میں نے اس اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو میرا سر بری طرح چکرانے لگا اور میں نے دوبارہ اپنا سر زمین پر گرا دیا۔ ہلکی سی چیخ کی آواز آئی میرا سر زور سے پکے فرش سے ٹکرایا تھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میرے منہ سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔

تھوڑی دیر تک تو میں اس تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت جمع کرتا رہا۔ میرا سارا جسم پکے پھوڑے کی طرح سے دکھ رہا تھا اور جب حواس بحال ہوئے تو مجھے یاد آیا کہ میں تو ایک ہائر کی ہوئی کار میں کراچی جا رہا تھا۔ پھر کار میں مجھے نیند آ گئی اور اب یہاں آنکھ کھلی ہے۔

لیکن میں کہاں ہوں؟ کار میں کیوں نہیں؟ یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کیے اچانک مجھے اپنا بیگ اور آٹھ لاکھ روپے کا خیال آیا اور گھڑی کی چوتھائی میں یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ میری گہری نیند سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈرائیور نے میرا بیگ اڑا لیا اور مجھے نہ جانے کہاں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ میں نے اندھیرے میں زمین پر ہاتھ مارا۔ تو اندازہ ہوا کہ میں فرش پر پڑا ہوں۔ میں بدقت اٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھوں کی طرح زمین ٹٹولتا ہوا چوپایوں کی طرح چلنے لگ۔ پھر اچانک دیوار آ گئی میں نے دائیں بائیں اس طرح چل کر دیکھا میں ایک بند چار دیواری یا یوں کہہ لیں کسی کمرے میں بند تھا کیونکہ میرا ہاتھ بند دروازے سے بھی ٹکرایا تھا۔

مگر اس ڈرائیور نے اگر صرف میری رقم ہی حاصل کرنی تھی تو وہ بے ہوشی کی حالت میں مجھے کہیں بھی پھینک کر غائب ہو جاتا اس نے مجھے یہاں لا کر کیوں قید کر دیا۔

دوسری بات سوال بن کر میرے سامنے یہ آئی کہ میں اتنی گہری نیند کیسے سوتا رہا ڈرائیور نے نیند کی حالت میں مجھے کار سے نکال کر یہاں ڈال دیا اور میری آنکھ نہیں کھلی اچانک مجھے ایک خیال آیا کہ وہ میری گہری نیند نہیں گہری بے ہوشی تھی۔ دو باتیں ہو سکتی ہیں جس کے ذریعے مجھے بے ہوشی کی دوا دی گئی ایک تو اسپتال میں اس نرس کا سرنج بھر کر لانا اور یہ کہتے ہوئے میرے بازو میں انجکٹ کرنا کہ یہ وہی انجکشن ہے جس کا نام تم نے بتایا تھا۔ یا پھر ڈرائیور نے ڈھابے سے لا کر مجھے چائے پلائی تھی۔

پھر مجھے یہ سوچ کر حیرت ہونے لگی کہ نرس کو میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی تھی۔ وہ

میرے لیے اور میں اس کے بالکل انجان تھے اور ٹرین کے حادثے کے لاتعداد زخمی وہاں مسلسل آ رہے تھے۔ پھر اس نے مجھ ہی پر اتنی خاص توجہ کیوں دی کہ میرا بتایا ہوا وہ مہنگا انجکشن وہ سب سے چھپا کر مجھے لگانے کے لیے لے آئی۔

اس بات کا تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ وہ انجکشن جو نرس نے میرے لگایا تھا، وہ نہیں تھا جو میں نے بتایا تھا۔ کیونکہ اگر وہ لگایا ہوتا تو میری طبیعت کافی بہتر ہوتی۔ نرس نے ہی مجھے نیند کا انجکشن دیا تھا۔ مگر پھر وہی سوال بار بار ذہن کے پردے پر دستک دے رہا تھا کہ آخر کیوں؟ نرس نے مجھے بے ہوش کر کے اپنے بھائی یا وہ جو کوئی بھی تھا اس کے ساتھ کراچی کیوں بھیجا۔

کیا اسے میرے اوپر کوئی شک و شبہ تھا یا اسے یہ پتا چل گیا تھا کہ میرے بیگ میں آٹھ لاکھ کی رقم موجود ہے پھر ایک سوال یہ ابھرا کہ رقم ہتھیانے کے بعد مجھے یہاں لا کر قید کیوں کر دیا گیا ہے۔

آخر وہ نرس کون تھی۔ کیا اس کا تعلق جرائم پیشہ گروہ سے ہے وہ ڈرائیور اس نرس کا ساتھی تھا۔ یہ سارے راز اسی وقت کھل سکتے تھے جب کوئی میرے پاس آتا اور وہ مجھ سے اور میں اسی سے سوال و جواب کرتا۔

میں جب روہڑی سے چلا تھا تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا ہو گا۔ پھر میں سو گیا اب آنکھ کھلی ہے تو رات ہو رہی ہے۔ یعنی میں سارا دن بے ہوش پڑا رہا ہوں۔

میں نے صبح کی ایک پیالی چائے پی ہوئی تھی۔ بغیر کچھ بھی کھائے پیے مجھے خاصا وقت گزر چکا تھا مجھے سخت پیاس اور بھوک محسوس ہو رہی تھی، مگر اس کمرے میں سوائے میرے کچھ بھی نہیں تھا میں نے اپنی تمام تر ہمت کو جمع کیا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنی ٹانگوں میں واضح طور پر کپکپاہٹ محسوس کی۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ چل پھر کر سارے کمرے کا جائزہ لیا۔

اب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس سی ہو گئی تھیں اور مجھے کم از کم اپنا وجود دکھائی دینے لگا تھا۔

یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا اور ساز و سامان سے خالی تھا میں نے کمرے کی دیواروں پر بھی ہاتھ پھیر کر دیکھا وہ بنا پلستر کی کھردری دیواریں تھیں اور کوئی کھڑکی اس کمرے میں موجود نہیں تھی۔

اچانک ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میرے کانپتے وجود سے ٹکرایا تو میری نگاہ بے ساختہ چھت کی جانب اٹھ گئیں۔ کافی اونچی سر کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کھڑکی یا روشن دان بنا ہوا تھا۔ یہ ہوا وہیں سے آئی تھی۔

اگر دن کی روشنی ہوتی تو میں اس کمرے کا اچھی طرح سے جائزہ لے سکتا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں......! پھر روشنی کے خیال سے مجھے یاد آیا کہ میرے موبائل میں ٹارچ موجود ہے میں وہ جلا کر یہاں کا جائزہ لے سکتا ہوں۔ گولی استاد کو یا پھر کراچی میں موجود گولی استاد کے دوست جس کا نمبر چلتے ہوئے مجھے گولی استاد نے دیا تھا فون کر سکتا ہوں۔

یہ سوچ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر! میری جیب خالی تھی۔ جیب میں نہ موبائل تھا اور نہ ہی میرا پرس۔ وہ میرا تو نہیں تھا جاوید کا تھا مگر جب وہ میری جیب میں تھا تو میرا ہی تھا۔

مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں رہا کہ جب وہ بے ہوشی کی حالت میں مجھے اٹھا کر لایا ہو گا تو اس نے بیگ کے علاوہ میری جیبوں کی بھی مکمل تلاشی لی ہو گی اور میری ساری چیزیں اس نے اپنے قبضے میں کر لی ہوں گی۔

میں اس وقت پوری طرح اس کے قبضے میں تھا

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے مجھے یہاں قید کس لیے کر رکھا ہے۔ میری رقم ہتھیانے کے بعد اب وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے یہ اس وقت پتا چل سکے گا جب صبح ہوگی یا پھر وہ میرے پاس آئے گا۔

میں ایک بار پھر ہمت کر کے اٹھا اور اندازے سے دروازے کی جانب بڑھا اور کان لگا کے باہر کی سن گن لینے لگا مگر باہر گھور اندھیرے کی طرح مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو وہ مجھے یہاں بند کر کے خود کہیں اور چلا گیا ہے یا پھر خود بھی لائٹیں بند کر کے سو رہا ہے۔

مایوس ہو کر میں دوبارہ فرش پر لیٹ گیا۔ نیند تو کہاں آنی تھی۔ ابھی تو اتنی لمبی بے ہوشی سے ہوش میں آیا تھا۔ البتہ مجھے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میرا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور میں گزری ہوئی ساری باتیں سوچ رہا تھا۔

سیاہ رات آہستہ آہستہ صبح کی سپیدی میں تبدیل ہونے لگی دور کہیں سے ہلکی سی آواز میرے کانوں میں اذان کی آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فجر کی اذان تو ہوگئی ہے اب دن بھی نکل ہی آئے گا۔ میں نماز پڑھنا چاہتا تھا مگر یہاں نہ پانی تھا اور نہ ہی روشنی' میں نے تیمم کیا اور قبلے کا رخ اپنے تصور میں کر کے نیت باندھ لی مشکل حالات میں بھی نماز کی ادائیگی کا حکم ہے اگر وضو کے لیے پانی میسر نہ ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے اور قبلے کا رخ بھی معلوم نہ ہو تو انسان اپنے تصور میں قبلے کا رخ باندھ سکتا ہے۔ سو میں نے بھی اپنے ربّ کی دی ہوئی اس آسانی سے استفادہ حاصل کیا اور فجر کی نماز ادا کی اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر اپنے لیے صحت' عافیت صبر اور مدد مانگی۔

نماز سے فارغ ہوا تو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تنہا نہیں ہوں اللہ تعالیٰ جو سب سے زیادہ پاور فل ہستی ہے وہ میرے ساتھ ہے۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا روشنی آہستہ آہستہ پھیلتی گئی کمرے میں روشنی ہوگئی۔ تب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کے کونے میں ایک اور دروازہ تھا رات کے اندھیرے میں جب میں دیوار پر ہاتھ پھیر رہا تھا تب اس دروازے سے میرا ہاتھ ٹکرایا تو میں اندھیرے کی وجہ سے یہ سمجھا کہ میں کمرے کے دروازے والی سائڈ پر دوبارہ آ گیا ہوں۔

میں تیزی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر دیکھا وہ باتھ روم ہی تھا باتھ روم کی موجودگی پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا ایک تو مجھے انسانی حاجت پریشان کر رہی تھی اس کے علاوہ پیاس بھی شدید لگ رہی تھی۔

میں بے تابی سے باتھ روم میں داخل ہوگیا چھوٹے اور پرانے واش بیسن کی جانب بڑھا اور نل کھول کر دیکھا پانی آرہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ پانی پینے کے لائق ہے بھی یا نہیں میں نے اوک بنا کر پانی پینا شروع کردیا۔

تھوڑا سا پانی پینے کے بعد ہی پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ میں سیدھا ہوگیا میرا پیٹ خالی تھا صرف پانی نہیں وہ غذا بھی مانگ رہا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ہی اپنی ضرورت سے فارغ ہوا پھر ہاتھ منہ اچھی طرح دھویا اور حسب عادت وضو کرلیا۔ پھر کمرے میں آ کے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ معدے میں کچھ ایسی الٹ پلٹ ہو رہی تھی پھر میں بھاگ کر واش روم گیا اور بیسن پر جھک کر سارا پانی الٹ دیا۔ قے ہوجانے کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی۔

صبح ہوچکی تھی سورج اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ اب کمرے میں اچھا خاصا اجالا پھیل گیا تھا۔ مگر باہر سے

کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے بے چین ہو کر دروازہ پیٹنا شروع کردیا اور زور زور سے آوازی دیں۔

''کوئی ہے' مجھے یہاں کیوں بند کیا ہے تم کون ہو' دروازہ کھولو۔'' مگر وہی سناٹا۔

میں سمجھ گیا کہ یہاں کوئی نہیں ہے وہ مردود مجھے یہاں بند کر کے خود کہیں اور چلا گیا ہے اب میں سوائے اس کا انتظار کرنے کے اور کیا کرسکتا تھا۔

وقت گزرتا رہا میرے اندازے کے مطابق اس وقت دن کے بارہ تو بج چکے تھے۔ اچانک مجھے ایک بھیانک خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں وہ مجھے یہاں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے بند کر گیا ہو میں نے ایسی موت کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو تصور میں بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مارے بے بسی کے میرا سر چکرانے لگا مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں اور کس جگہ پر ہوں۔ یہ گھر کسی جنگل و بیاباں میں تو نہیں ہے۔ باہر بالکل ہی سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اگر یہ انسانی آبادی میں ہوتا تو انسانوں کی چہل پہل کی آوازیں تو سنائی دیتیں۔

یااللہ میری مدد فرما۔ مجھ سے یا میرے والدین سے ایسی کون سی خطا ہوئی تھی جس کی سزا مجھے اس صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ سردار شیر افضل اور شیر زادہ کے چنگل سے نکلا تو اس دوسری مصیبت میں پڑ گیا۔

محترم قارئین آج جب میں اپنی یہ داستان لکھنے بیٹھا ہوں تو خیال آرہا ہے کہ میری زندگی کا ایک دور ایسا آیا کہ میں بہت سی الجھنوں کو ہی سلجھاتا رہا اور وہ ساری الجھنیں بھی ایسی دھمکی دیتی رہتی تھیں کہ اگر نہیں سلجھاؤ گے تو مارے جاؤ گے۔ یہ الجھنیں تمہیں کھا جائیں گی میری داستان حیات میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں۔ میں لاتعداد مشکلات سے گزرا۔ زندگی میں ایک گردش آئی اور پھر میری ساری زندگی ایک گردش بن گئی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ مشکلات میرے لیے پانی ہوگئیں۔ کسی شاعر نے شاید ایسے ہی حالات میں گھر کر کہا ہوگا کہ

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں۔

اچانک باہر سے پہلی مرتبہ مجھے کھٹر پٹر کی آوازیں سنائی دیں تو میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا ساتھ ہی ایک دو انسانوں کے بولنے کی آوازیں آئی۔

میں نے سوچا کہ شاید وہ لوگ آگئے ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ پھر ایک بار دروازہ بجایا اور آوازیں دیں۔ جواب میں مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ جو دروازے کی جانب ہی آرہی تھیں۔ دروازے پاس آ کے وہ رک گیا اور بولا۔

''زیادہ شور مت مچاؤ ہم اب دروازہ کھولتے ہیں۔'' تو میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔

پھر دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ سب سے پہلے ایک آدمی ہاتھ میں پستول تھامے اندر آیا اس نے تیزی کے ساتھ گردن گھما کے چاروں جانب دیکھا جیسے ہی اس کی نگاہ میرے اوپر پڑی اس نے مجھ پر پستول تان لی اور بولا۔

''اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو خاموشی سے اس جگہ بیٹھے رہنا۔''

پھر اس نے باہر کھڑے کی شخص کو ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ تو دوسرا آدمی ہاتھ میں کھانے کی ٹرے اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے دور سے ہی ٹرے کو نیچے رکھا اور میری جانب کھسکا دی۔

''تم اطمینان سے کھانا کھالو پھر آ کر تم سے بات کرتے ہیں۔'' پستول بردار نے کہا۔

''مگر مجھے بتاؤ تو سہی کہ تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں قید کر کے مجھ سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو' میں تو تم لوگوں کو جانتا تک نہیں ہوں۔'' میں نے احتجاج

کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ابھی میں نے کیا کہا ہے۔'' پستول بردار شخص نے خرانٹ لہجے میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

میں نے فی الحال ان کے بارے میں سوچنا بند کیا اور کھانے کی ٹرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ٹرے میں روٹی سالن کے علاوہ ایک چائے اور پینے کے پانی کی بوتل بھی تھی۔

میں نے کھانے کے ساتھ پورا انصاف کیا اور ساری پلیٹیں صاف کر دیں۔ پانی اور چائے پینے کے بعد مجھے سگریٹ کی طلب ہونے لگی میں بہت زیادہ سگریٹ تو نہیں پیتا تھا البتہ کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا مگر اس وقت مجھے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔

پیٹ میں غذا گئی تو میری طبیعت بہتر ہوئی یہ جو لوگ بھی ہیں کم از کم ان میں اتنی تو انسانیت ہے کہ انہوں نے مجھے صاف ستھرا کھانا پیٹ بھر کھلایا پانی اور چائے بھی دی اب میں ان سے بہتر طریقے سے گفتگو کر سکتا تھا۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد دوازہ ایک بار پھر کھل گیا اور اس مرتبہ اندر آنے والے تین افراد تھے۔ ایک پستول بردار دوسرا شخص میرے لیے اجنبی تھا مگر تیسری ہستی کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ ایک عورت تھی اور عورت بھی وہ جس کو میں مسیحا سمجھتا تھا۔ یہ وہی اسپتال والی نرس تھی۔ جس نے میری ڈریسنگ کی تھی اور مجھے انجکشن لگایا تھا۔

''تم!'' میرے منہ سے بے ساختہ تحیر زدہ انداز میں نکلا میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تو پستول بردار نے ڈپٹنے کے انداز میں کہا۔

''خبردار اپنی جگہ سے جنبش مت کرنا وہیں بیٹھ جاؤ۔'' تو میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

''سسٹر یہ سب کیا ہے۔ تم نے مجھے اپنے بھائی کے ساتھ بھیجا تھا۔ مگر آنکھ کھلی تو میں یہاں تھا یہ سب کیا چکر ہے۔'' میں نے کہا۔

''سسٹر۔'' انہوں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا اور بے ڈھنگے طریقے سے ہنسنے لگے۔ سسٹر بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگی۔

''یہ سسٹر ہو گی تیری میری تو جانم ہے۔'' آنے والے اجنبی شخص نے اپنا بایاں بازو اس کی کمر کے گرد کر کے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہ ایک ادا سے آنکھیں گھما کر مسکرانے لگی۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو کام کی بات کرتے ہیں۔'' اس شخص نے اپنا ہاتھ نرس کی کمر سے نکال لیا اور دونوں ٹانگوں کو پھیلا کر کھڑا ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

تب وہ بولا۔

''دیکھو ایک بات اچھی طرح دھیان میں بٹھا لو کہ میں تم سے جو بھی سوال کروں گا تمہیں اس کا جواب بالکل ٹھیک دینا ہو گا اگر ذرا بھی آنا کانی کی یا جھوٹ بولا تو تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم تمہارا کیا حال کریں گے۔''

''ٹھیک ہے پوچھو' میں تمہارے سوال کا بالکل ٹھیک جواب دوں گا۔ مگر پھر تمہیں بھی ایک وعدہ مجھ سے کرنا ہو گا کہ تمہیں مجھے آزاد کرنا ہو گا۔'' میں نے خود اعتمادی سے کہا۔

میرا خوف اس لیے بھی کم ہو گیا تھا کہ میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں میرے بارے میں کوئی شدید غلط فہمی ہو گئی ہے اور یہ کسی اور کے دھوکے میں مجھے پکڑ لائے ہیں۔

''چلو وعدہ کیا تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔' اس نے اپنے ساتھیوں کی جانب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں' میں پرویز ہوں۔'' میرے دماغ میں فوری طور پر ہی نام آیا۔

''اچھا پرویز صاحب یہ بتائیے کہ سلطان کہاں ہے کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''سلطان کون سلطان میں کسی سلطان کو نہیں جانتا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ جھوٹ نہیں چلے گا۔'' اس نے طنزیہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں کسی سلطان کو نہیں جانتا۔'' میں نے یقین دلانے والے لہجے میں کہا اور یہ سچ بھی تھا میں واقعی سلطان نامی کسی شخص سے واقف نہیں تھا۔

''بکواس کرتا ہے سالے حرامی......!''

اس شخص نے دانتوں کو پیستے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا اور الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارا۔

''آخر یہ سلطان ہے کون؟ اور تم اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ میری بات کا یقین کرو میں کسی سلطان کو نہیں جانتا۔'' میں نے اس کے زوردار تھپڑ کی وجہ سے اپنی باچھوں میں بہہ آنے والے خون کو اپنی ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تو سلطان کو نہیں جانتا تو سلطان کا یہ پرس اور اس کی یہ ساری چیزیں تیری پاس کہاں سے آئیں اور اگر تو نے سلطان کے ساتھ کچھ نہیں کیا تو وہ ابھی تک پہنچا کیوں نہیں۔ وہ آج تک کبھی لیٹ نہیں ہوا پورے چوبیس گھنٹے گزر گئے اس کا انتظار کرتے ہوئے بتا تو نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ اس کو کہیں قید کر رکھا ہے یا مار ڈالا ہے بالکل سچا بتا۔''

مارے غیض کے اس شخص کی سرخ آنکھوں سے چنگاریں سی نکل رہی تھیں اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے کچا چبا جائے۔

تب مجھے خیال آیا کہ جس پرس کا وہ حوالہ دے رہا ہے وہ پرس تو جاوید نامی شخص کا تھا جو ٹرین میں میرے ساتھ تھا اور حادثے میں مر گیا۔ اس نے میرے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس کا نام جاوید نہیں بلکہ سلطان تھا اور وہ ان جرائم پیشہ آدمیوں کا ساتھی تھا۔ وہ ان کے پاس آ رہا تھا اور محض وقت گزاری کے لیے وہ مجھ سے اپنی شناخت چھپا کر باتیں کر رہا تھا۔

''کیا سوچ رہا ہے جواب دے۔'' مجھے اس کی دہاڑ سنائی دی تو میں اپنی سوچوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے کہا۔

''اگر تم اس پرس کی بات کر رہے ہو جو میری جیب سے نکلا ہے تو وہ پرس تو جاوید کا ہے جو مجھے ٹرین میں ملا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا مگر حادثے میں وہ مر گیا تو میں نے اس کا پرس اس کی جیب سے نکال لیا کیونکہ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔''

''بکواس' پھر بکواس۔ ارے کوئی اس کو سمجھاؤ اگر اس نے سچ نہیں بولا تو میں اس کا کیا حال کروں گا۔'' اس شخص نے جنونیوں کے انداز میں اپنے ہاتھ کو اپنے سر پر گھماتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بیگ میں آٹھ لاکھ روپے کی رقم تھی اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں رقم کی ضرورت تھی۔ کیوں جھوٹ بول کر اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو۔ جابر صرف سچ سنتا ہے ویسے یہ اتنا بے رحم ہے کہ جس پر غصہ آ جائے تو اسے مارے بغیر اس کے جسم سے اس کی کھال اس طرح اتار لیتا ہے جیسے قصائی بکرے

کی۔''اس مرتبہ اس نرس نے مجھ سے کہا۔

اس کے بات کرنے سے مجھے اس شخص کا نام معلوم ہوگیا وہ جابر تھا۔

''تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ تمہیں مجھ پر کیسے شک ہوا کہ جاوید یا سلطان جو بھی تھا اس کا پرس میرے پاس ہے اور میرے بیگ میں آٹھ لاکھ کی رقم ہے۔'' میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔ میں اپنی ساری الجھنیں دور کرلینا چاہتا تھا۔

''تم نے جوس منگوانے کے لیے جیب سے پرس نکال کر اس میں سے پچاس کا نوٹ نکالا تب میں نے سلطان کا پرس پہچان لیا ہمارے کچھ مخصوص نشان ہیں۔ جو ہماری شناخت ہیں اور ہم ایک دوسرے کو ان ہی نشانیوں سے پہچانتے ہیں۔ ویسے سلطان کے لیے ہمیں کسی نشانی کی ضرورت نہیں ہے وہ ہمارا بہت پرانا ساتھی تھا۔

میں نے جب سلطان کا پرس تمہارے پاس دیکھا تو میں چونک گئی۔ میں نے سلطان سے فون پر بار بار رابطہ کرنا چاہا مگر اس کا فون نہیں ملا۔ تب میں نے سوچا کہ تم نے ضرور اسے نقصان پہنچایا۔ پھر میں نے اپنے ساتھی حشمت کو فون کر کے بلایا اور تمہیں اس کے ساتھ جانے کا کہا۔ رہی بات بیگ میں موجود تمہاری رقم کی۔ تو اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ میں نے تمہیں بے ہوشی کا انجکشن اسی لیے دیا تھا۔ تا کہ وہ تمہیں اس جگہ پر لے آئے یہاں تمہیں قید کرنے کے بعد بھی ہم بار بار سلطان کو ٹریس کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر اس سے رابطہ نہ ہوسکا۔ تب ہم تمہارے پاس آئے ہیں تا کہ تم سے اس کے بارے میں معلوم کرسکیں۔

''میں نے تمہیں ساری بات بتادی ہے۔ اب تم بھی سچ بتادو کہ تم نے سلطان کے ساتھ کس کے کہنے پر کیا کیا ہے اور یہ بھی کہ تم کس کے لیے کام کرتے ہو۔'' نرس نے بظاہر اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''میں حلفیہ کہتا ہوں کہ مجھے سلطان نے اپنا نام جاوید بتایا تھا اور یہ بھی کہا کہ وہ کراچی اپنے گھر جارہا ہے۔ کراچی میں اس کا گھر ناظم آباد میں ہے اور پنڈی وہ اپنی خالہ کے انتقال میں گیا تھا اس کی ایک جوان بہن اور ایک بیوہ ماں ہے اور یہ بھی کہ وہ ایک فرم میں جاب کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چلو میں تمہاری یہ بات مان لیتا ہوں جو تم نے ابھی کہی کہ تمہیں سلطان نے اپنے بارے میں یہ سب بتایا ہوگا لیکن ٹرین کے حادثے میں تو بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے۔ مرے بھی تھے سب ہی سامان وہاں بکھرا پڑا ہوگا تمہیں سلطان ہی کا سامان ہتھیانے کی ضرورت کیوں پیش آئی اگر تمہیں اتنی ہی پیسوں کی ضرورت تھی تو تم دوسروں کے سامان پر بھی ہاتھ صاف کرسکتے تھے۔ صرف سلطان ہی کا کیوں اور سب سے اہم بات جو ہے وہ یہ کہ جس کی وجہ سے تمہارے بیان کو سچ نہیں مان سکتے کیونکہ سلطان کو ٹرین سے آنا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی پرائیوٹ کار میں آرہا تھا۔'' جابر نے کہا۔

''تمہارے پہلے سوال کے جواب میں صرف اتنا کہوں گا کہ جاوید تنہا سفر کررہا تھا اس کے ساتھ کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے آسانی سے اس کی جیب سے اس کا پرس اڑالیا۔ رہی بات دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کی تو سب کے ساتھ دوسرے لوگ بھی تھے جن میں کچھ شدید زخمی تھے تو کچھ میرے جیسے ہوش وحواس میں تھے۔ اسی لیے کسی اور کے سامان پر ہاتھ صاف نہیں کرسکا۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اچھا اب تم اپنے بارے میں بالکل سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟ کہاں سے آرہے تھے اور کہاں اور کیوں جارہے تھے؟'' جابر نے ایک اور سوال کیا۔

''پہلے تم لوگ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اچھا......!'' جابر نے اچھا کو کھینچ کر کہا۔ ''تو معصوم تو اتنا بن رہا ہے جیسے ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا چل شاباش اب بتا بھی دے کہ تجھے کس نے سلطان کے پیچھے لگایا تھا اور سلطان کہاں ہے۔'' اس نے چمکارتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہہ تو دیا کہ سلطان کو نہیں جانتا تم لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔'' میں نے جھنجلا کر تیز لہجے میں کہا۔

جواب میں جابر نے بڑھ کر میرے منہ پر ایک اور زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ اس کے حلق سے ایک بے ساختہ غراہٹ سی نکلی اور میں اپنی جگہ پر ہل کے رہ گیا۔

''میں نے جو پوچھا ہے مجھے اس کا جواب چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا میں کچھ نہیں جانتا۔ کیوں میرے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کررہے ہو۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ کراچی میں گلشن اقبال اپنے رشتہ داروں کے ہاں جارہا تھا۔ تم مجھے مار مار کر میری کھال بھی ادھیڑ ڈالو تب میں یہی جواب دوں گا کیونکہ یہی سچ ہے میں سلطان کو نہیں جانتا تم لوگ یہ کیوں نہیں سوچ رہے کہ جاوید نامی شخص جو میرے ساتھ ٹرین میں سفر کررہا تھا اور جس کی جیب سے میں نے سلطان کا پرس نکالا ہے ہوسکتا ہے کہ اسی نے سلطان کے ساتھ کچھ کیا ہو اور سلطان کا پرس اڑالیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔'' جابر نے آنکھیں نکال کر چیخ کر کہا پھر بولا۔

''تجھے ابھی تھوڑی دیر میں سب یاد آجائے گا۔'' پھر پستول بردار شخص کو مخاطب کر کے بولا۔

''ذرا لوہے کی کوئی چیز منگوالو۔ میں ایک ایک کر کے اس کے سارے دانت توڑ ڈالوں گا۔''

''نہیں تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' میں اس بات پر حلق کے بل چیخ پڑا۔ میری نگاہیں اس کے کسرتی بدن اور تنگ پیشانی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی بات سن کر میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا اور میں بے ساختہ چلا اٹھا۔

''ہمیں کون روکے گا یہ وہ جگہ ہے جہاں آکر لاشیں بھی بولنے لگتی ہیں۔ تو ہے کیا شے۔ تیرا واسطہ جابر خان سے پڑا ہے جابر خان سے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک زوردار لات رسید کی میں لڑکھڑاتا ہوا سامنے والی دیوار سے جاٹکرایا۔

''سلطان پنڈی سے اپنی کار میں چلا تھا۔ چلتے وقت اس نے ہم سے بات کی تھی مگر وہ اب تک یہاں نہیں پہنچا ہے اور نہ ہی اس کے سیل فون پر اس سے رابطہ ہورہا ہے۔ اگر وہ خود کہیں رکتا یا اس کا سیل فون کام نہیں کرتا تو وہ ہمیں اس بات کی اطلاع ضرور دیتا۔ اب بتاؤ وہ کہاں رہ گیا ہے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔'' نرس جس کا نام مجھے ابھی تک معلوم نہ ہوسکا تھا کہا۔

میں اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا جابر خان پھر مذموم ارادے سے میری جانب بڑھا مگر نرس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔

''تم کیوں مجھے روک رہی ہو بینا۔'' جابر خان نے ناگواری سے کہا۔ اس کا دوسرا ساتھی جس نے اس سے کوئی لوہے کی چیز لانے کے لیے کہا تھا وہ بھی ابھی

تک میرے پاس ہی کھڑا تھا۔
اب مجھے نرس کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا اس کا نام مینا تھا۔ شاید وہ جابر خان کی معشوقہ تھی۔

"ہم اس سے آرام سے بات کریں گے یہ مجھے پڑھا لکھا اور سمجھ دار انسان لگتا ہے اور اس کی یہ بات کہ ہو سکتا ہے ٹرین کے حادثے میں مرنے والے جاوید نامی شخص نے ہی سلطان کو کوئی نقصان پہنچایا ہو۔" مینا نے کہا۔

"سمجھ دار اور پڑھا لکھا۔" جابر خان نے میرا مضحکہ اڑایا اور بولا۔

"دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔"

"میرا مذاق اڑانے کی کوشش مت کرو۔ تمہاری ساتھی تم سے زیادہ سمجھ دار ہے اس کی باتوں پر غور کرو ہو سکتا ہے تمہاری سمجھ میں بھی کچھ آ جائے اور ویسے بھی تم نے زبردستی مجھے اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔ صرف ایک پرس کی بازیابی سے تم میرے اوپر اپنا لگایا ہوا الزام ثابت نہیں کر سکتے۔"

"اچھا ایک آخری بات اور پوچھتا ہوں۔" اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں میرے اوپر گاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں وہ بھی پوچھ لو۔ نہ جانے کون کون سے سوال پوچھ رہے ہو۔ جب میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جانتا ہی نہیں ہوں تو جواب کیا خاک دوں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم ازلان شاہ کے آدمی نہیں ہو؟"

"یہ نام بھی میرے لیے اجنبی ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"جابر پہلے تم میری بات سنو آؤ باہر آؤ۔" مینا نے جابر کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

جابر خان اسی کے ساتھ باہر نکل گیا تو پستول بردار بھی میری جانب پستول تانے تانے الٹے قدموں دروازے کی جانب بڑھنے لگا پھر وہ باہر نکل گیا اور اس نے تیزی سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔

میں ایک گہری سانس لے کر فرش پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ میرا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ لوگ میرا یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح انہیں یقین دلاؤں کہ میں سلطان نامی شخص کو بالکل بھی نہیں جانتا۔ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جاوید ہی سلطان تھا یا کوئی اور تھا۔

دوسرے میں ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور ان کے دھندے کیا ہیں اور یہ ازلان شاہ کون ہے۔ مجھے یہ اس کا آدمی سمجھ رہے ہیں یہ شاید ان کا دشمن ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ یہ سب کے سب جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کاش میری جاوید سے ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی۔ کاش میں اس ٹرین میں سفر ہی نہ کر رہا ہوتا یا پھر یہ کہ ٹرین کو حادثہ نہ پیش آیا ہوتا۔ نہ جاوید مرتا اور نہ میرے دل میں اپنی شناخت بدلنے کا وہ بے ہودہ خیال آیا ہوتا۔ اب تو ٹی وی میں تمام مرنے والوں کے ناموں کی لسٹ آنی شروع ہو گئی ہو گی اور اس لسٹ میں ڈاکٹر شاہ زمان کا نام بھی شامل ہو گا۔ اگر گولی استاد نے میرے موبائل پر فون بھی کیا ہو گا تو موبائل اسے آف ملا ہو گا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہو گا کہ کہ مر چکا ہوں۔

اگر سردار شیر افضل اور راجہ کو میرے مرنے کی اطلاع ملی ہو گی تو انہوں نے سکھ کا سانس لیا ہو گا کہ چلو جان چھوٹی آخری پھانس بھی نکل گئی۔ لیکن مشی جب مشی کو میرے مرنے کی اطلاع ملے گی تو اس کا

کیا حال ہو گا۔ اب میں اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ فوری طور پر اپنے زندہ ہونے کی خبر ان تک پہنچا سکوں۔ ایک سے جان چھوٹی تو دوسری مصیبت میں پھنس گیا۔ میرے اوپر وہ والا محاورہ فٹ آ رہا تھا کہ "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔"

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ اچانک مجھے ان لوگوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ کبھی ایک آدھ لفظ تیزی سے ان کے منہ سے نکل جاتا اور پھر آوازیں دھیمی پڑ جاتیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا یہ سوچ کر کہ میں دروازے سے کان لگا کے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ مجھے ان لوگوں کی اصلیت کے بارے میں کچھ تو پتا چلے یا پھر یہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ مینا جابر خان کا ہاتھ تھام کر اس سے کوئی بات کرنے کے لیے کمرے سے باہر لے گئی تھی۔ اب یہ لوگ باہر کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہیں۔

میں نے اپنے کان دروازے سے لگا دیے اور اپنے روئیں روئیں کو سماعت بنا دیا ان میں کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔

مینا کچھ بول رہی تھی۔ میں توجہ سے سننے لگا۔ آواز دھیمی تھی مگر میری سمجھ میں آ رہی تھی جب کوئی شخص میرے جیسی سچویشن میں ہو تو اسے مدھم سے مدھم آواز بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اس شخص نے بالکل ٹھیک اطلاع دی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون شخص ہے اور سارے واقعے سے کس طرح واقف ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی اندر کا ہی آدمی ہے۔ لیکن کون۔ کون......! بھلا اندر کا کون آدمی ایسا ہو سکتا ہے جو مجھ سے بھی اپنی شخصیت پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو یا پھر...... یا پھر وہ کوئی باہر کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی ہمارا ہمدرد۔ جس کی ازلان شاہ سے کوئی دشمنی ہو اور وہ اپنے آپ کو در پردہ رکھ کر ہماری بھلائی اور ازلان شاہ کا بیڑا غرق کرنا چاہتا ہو۔" مینا خاموش ہوئی تو جابر خان بولا۔

"بہر حال مینا اب ہمارے پاس اس بات کو سوچنے کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ ظاہر خان کل دوبئی سے کراچی پہنچ رہا ہے۔ پھر وہ ہم سے ضرور رابطہ کرے گا اور سلطان کے بارے میں ساری بات پوچھے گا۔ سلطان کو میں ہی لے کر آیا تھا۔ وہ میرا آدمی تھا اور اس سے کام بھی میں ہی لیتا تھا۔" پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد مجھے جابر خان کی "ہیلو" کہنے کی آواز سنائی دی شاید اس نے کسی کا نمبر ملایا تھا۔

"ہاں دلاور ذرا سنی سے میری بات کراؤ۔" جابر خان نے کہا دوسری جانب سے کیا جواب آیا وہ مجھے سنائی نہیں دیا پھر جابر خان بولا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں گیا ہے مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" جابر خان نے دوبارہ کہا۔ شاید اسے فون پر یہ جواب ملا ہو گا کہ سنی گھر پر نہیں ہے۔

وہاں سے جواب سننے کے بعد جابر خان نے حیرت سے کہا۔

"اچھا انسپکٹر شاکر وہاں آیا تھا مگر کیوں......!"

پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد جابر خان نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں بعد میں فون کروں گا۔"

فون بند کرنے کے بعد وہ دانتوں کو پیستے ہوئے بولا۔

"غدار......! وہ دونوں ہی غدار نکل گئے۔ لیکن شاید وہ یہ بھول گئے کہ ہمارے ساتھ غداری کرنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔"

”تو تمہارا یہ خیال ہے کہ سنی اور سلطان دونوں نے غداری کی ہے۔ سنی بھی غائب ہے اور سلطان بھی۔ مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلطان کا پرس اس شخص کے ہاتھ کیسے لگا اور سلطان جو مال لے کر آ رہا تھا وہ کہاں غائب ہو گیا اور جیسا کہ یہ شخص بتا رہا ہے کہ سلطان اس سے اتنا فری ہو کر بات کر رہا تھا تو اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ ٹرین میں سفر کیوں کر رہا تھا۔“ ایک اجنبی آواز نے کہا۔ شاید یہ تیسرا شخص وہی پستول بردار ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔

”میرا تو خیال ہے کہ یہ شخص سچ بیانی سے کام لے رہا ہے ہو سکتا ہے کہ واقعی اس نے رقم کے لالچ میں سلطان کا پرس اڑایا ہو‘ رہی بات سلطان کی کہ وہ ٹرین میں سفر کیوں کر رہا تھا اور مال کہاں گیا۔ تو بقول تمہارے جب اس نے غداری ہی کر لی تو بجائے کار میں سفر کرنے کے وہ ٹرین میں سفر کر رہا ہو‘ رہی بات مال کی یا تو مال اس نے دوسری پارٹی کو دے دیا یا پھر ٹرین میں اپنے ساتھ لے کر آ رہا ہو گا اور اب پتا نہیں وہ کروڑوں کا مال کہاں ہو گا؟“ مینا نے کہا۔

”اگر میں تمہاری بات سہی مان بھی لوں تو ایک ہی صورت میں‘ میں اس شخص کو اپنے شک سے بری کر سکتا ہوں کہ ہم اسٹیشن سے پتا کریں اور مرنے والوں کی لسٹ دیکھیں یا پھر مرنے والوں کے چہرے دیکھیں‘ کیوں کہ بہت سے مردہ اشخاص ابھی بھی اسپتال کے مردہ خانے میں موجود ہوں گے۔ جن کے اپنے انہیں لینے نہیں آئے ہوں گے۔“ جابر خان نے کہا۔

”ہاں! یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو‘ میں یہ کام بخوبی کر سکتی ہوں۔ میں مرنے والے لوگوں کے نام کی لسٹ..... مگر نہیں لسٹ میں سلطان کا نام موجود نہیں ہو گا کیوں کہ اس کی شناخت کی ساری چیزیں تو یہ شخص لے آیا ہے‘ البتہ مردہ خانے میں سلطان کی لاش تلاش کی جا سکتی ہے۔“ مینا نے جواب دیا۔

پھر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی جو دور ہوتی چلی گئی پھر معدوم ہو گئی شاید وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ لوگ سلطان کی لاش کو پہچان لیں مگر سلطان کا چہرہ کافی حد تک ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ جب ہی تو میں نے اپنی شناخت کی ساری چیزیں اس کی جیب میں رکھ دیں‘ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ مجھے کوئی لینے بھی نہیں آئے گا..... مگر اچانک مجھے گولی استاد کا خیال آیا کہ ٹرین کے حادثے کا سن کر اسے سب سے پہلے میری فکر ہوئی ہو گی۔ اس نے میرے موبائل پر بار بار کال کی ہو گی اور جب مجھ سے رابطہ نہیں ہوا ہو گا تو وہ جائے حادثہ پر ضرور آیا ہو گا‘ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سلطان کی ناقابل شناخت لاش کو میری لاش سمجھ کے اپنے ساتھ لے گیا ہو۔

”اف میرا خدا!! اگر ایسا ہوا تو یہ لوگ سلطان کی لاش کو نہیں دیکھ پائیں گے پھر میں انہیں کس طرح سے سمجھاؤں گا..... یہ تو مجھے جان سے ہی مار ڈالیں گے.....“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا‘ اب جو بھی ہو گا یہ تو اسی وقت ہو گا جب یہ لوگ واپس آئیں گے۔

شام کے قریب وہ لوگ واپس آ گئے جابر خان کافی غصہ میں دکھائی دے رہا تھا‘ مجھے دیکھتے ہی پھنکار زدہ لہجے میں بولا۔

”تمہارے کہنے پر ہم نے مردہ خانے جا کر ساری ڈیڈ باڈیز کو دیکھا ہے مگر ان میں سلطان شامل نہیں ہے‘ اب تم سچ سچ بتا دو کہ تم کون ہو اور تمہارا سلطان سے کیا تعلق تھا اور تم سلطان کے بارے میں کیا اور کتنا جانتے ہو‘ لیکن بولنے سے پہلے اتنا یاد رکھنا اگر اب تم نے سچ نہیں بولا تو میں اس پستول

کی.....؟“ یہ کہہ کر اس نے دوسرے شخص سے پستول تیزی سے چھینا اور میرے اوپر تان لیا۔ ”اس کی ساری کی ساری گولیاں تیرے سینے میں اتار دوں گا۔ بک دے..... جلدی جلدی بک..... مگر صرف سچ.....!“ اس کے سینے سے شیر کی سی غراہٹ نکل رہی تھی۔

”میں سلطان کو نہیں جانتا۔ میں تو جاوید کو جانتا ہوں اور اس سے بھی میری پہلی بار ہی ملاقات ہوئی تھی‘ میں اس سے بات نہیں کر رہا تھا وہی مجھ سے بار بار بات کر رہا تھا‘ وہ ہر اسٹیشن پر ٹرین سے اتر جاتا اور کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا‘ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ سلطان تھا اور اس نے مجھ سے اپنا تعارف جاوید کہہ کر کیوں کروایا‘ اسی نے مجھے اپنا کراچی کا ایڈریس بھی دیا تھا کہ میں وقت ملنے پر اس کے گھر ضرور آؤں۔“ میں نے صاف کہا۔

”اچھا اس نے کراچی کا کیا ایڈریس دیا تھا؟“ جابر خان نے پوچھا تو میں نے ایڈریس بتا دیا جو اتفاق سے میری یادداشت میں محفوظ رہ گیا۔

ایڈریس سن کر وہ تینوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے پھر جابر خان نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

”اچھا ایک آخری سوال کا جواب اور دے دو لیکن بالکل سچ..... پھر ہم تمہیں یہاں سے جانے دیں گے۔“

”ہاں پوچھو‘ میں وعدہ کرتا ہوں بالکل سچ بتاؤں گا۔“ اپنی رہائی کے بارے میں سن کر میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ہمیں تمہارے بیگ سے اچھی تگڑی رقم ملی ہے‘ تقریباً سات آٹھ لاکھ روپے‘ اتنی ساری رقم ٹرین میں لے کر تم کہاں جا رہے تھے اور جب اتنی زیادہ رقم

تمہارے پاس موجود تھی تو تم نے ایک مردہ شخص کے کوٹے پر کیوں ہاتھ صاف کیا؟ کیا تمہیں شک تھا کہ اس کے پرس میں زیادہ مال ہے یا اسی نے تمہیں ایسا کوئی اشارہ دیا تھا؟" جابر خان نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سوال کیا۔

جابر خان کا سوال سن کر چند لمحوں کے لیے میں گڑبڑا گیا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں پھر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ تو جرائم پیشہ ہیں، میں انہیں اپنی حقیقت بتا کر ان لوگوں کا ساتھ اپنا سکتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرے سلسلے میں یہ لوگ ہی میری کوئی مدد کرسکیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قدرت نے ان ہی کے ذریعے میری مدد کا انتظام کیا ہو اور مجھے ان تک پہنچا دیا ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو، کیا کوئی نئی جھوٹی کہانی اپنے ذہن میں بنا رہا ہے، یاد رکھ تو نے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔" جابر خان نے کہا۔

میں سچ بولنے کا فیصلہ کرچکا تھا، اس لیے ایک ایک گہری سانس لیتے ہوئے بہت ساری ہوا اپنے پھیپھڑوں میں اتاری اور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

"ابھی تک میں نے تم سے صرف سچ ہی بولا ہے اور اب جو کچھ کہنے جا رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے تم یقین کرو یا نہ کرو، اگر مجھے مارنا چاہتے ہو تو مار ڈالو...... میرا پورا خاندان ظالموں نے ختم کردیا سوائے میرے کوئی بھی نہیں بچا ہے، اچھا ہے میں بھی مر جاؤں تو مجھے اپنے غموں سے نجات مل جائے گی۔ بس ایک بات کی حسرت رہ جائے گی کہ میں ان ظالموں سے اپنے پیاروں کا انتقام نہ لے سکا اور انہیں دنیا میں زندہ سلامت چھوڑ کر خود مر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے...... کون ہو تم......؟ اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔" مینا اور جابر خان نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"میں ایبٹ آباد کا رہنے والا ہوں اور میرا نام ڈاکٹر شاہ زمان ہے، میں پنڈی کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں جاب کرتا تھا اور شام کو ایک کلینک میں بیٹھتا تھا۔ پنڈی میں، میں فلیٹ میں رہتا تھا......!"

پھر میں نے اپنی ساری داستان انہیں سنادی اور یہ بھی کہ میں نے جاوید کا چہرہ بگڑا ہوا دیکھنے کے بعد اس کی جیب سے اس کا پرس نکال کر اپنا پرس اس کی جیب میں اپنی شناخت بدلنے کے لیے رکھا تھا تاکہ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر مجھے بھول جائیں اور میری جانب سے بے فکر ہوجائیں، تاکہ ان کی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر میں ان سے انتقام لے سکوں۔"

"ابے ڈاکٹر! تیری دشمنی تو بڑی ہائی کلاس کے لیول کی ہے کیوں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔" میں بات کرکے خاموش ہوا تو جابر نے کہا۔

"کیا تم لوگ میرا ساتھ دو گے، میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔" "میرا ایک بچپن کا دوست ہے گولی استاد! وہ مجھے ایک سیاسی جماعت کے اعلیٰ ورکر کے پاس کراچی بھیج رہا تھا، یہ سیاسی جماعت سردار شیر افضل کی مخالف سیاسی جماعت ہے، اس نے کہا تھا یہ لوگ ضرور میری مدد کریں گے۔"

"یہ تمہاری بھول ہے پیارے سالے یہ سیاسی لیڈر کسی کی مدد کیا کریں گے، یہ صرف اپنا کام نکالنا جانتے ہیں، کسی دوسرے کے کام نہیں آتے اور ہم تمہاری مدد......!" اتنا کہہ کے وہ خاموش ہوگیا پھر بولا۔ "ہم تمہارے بیان کی تصدیق ضرور کریں گے اگر ہمیں تمہاری سچائی کے ثبوت مل گئے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

"ہاں ہاں بالکل...... تم ضرور میرے بارے میں تصدیق کرسکتے ہو بلکہ تم ایسا کرو کہ اپنے موبائل

سے میری ایک تصویر لے لو اور اسپتال میں کسی وارڈ بوائے یا نرس کو دکھا کر میرے بارے میں پوچھ سکتے ہو، چاہو تو ایبٹ آباد میرے پتے پر جاکے بھی میری بات کی تصدیق کرسکتے ہو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"ٹھیک ہے پیارے، ابھی تمہیں ایک روز اور یہاں گزارنا ہوگا، ہم ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے کھانے کا سامان تمہیں دے جائیں گے۔ اب کل ہی ملاقات ہوگی اور تمہارا قصہ بھی آر یا پار ہوجائے گا۔" جابر خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے!" میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا اور سکون کا سانس لیا۔

وہ لوگ چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک شاپر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا اس میں کھانا پانی اور چائے ہے، برتنوں کی ٹرے بھی مجھے دے دی اور جاتے جاتے جابر خان نے اپنے موبائل سے میری کئی تصاویر اتاریں۔

کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا، مگر اس کمرے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا، یہاں بجلی کا کوئی بٹن تھا ہی نہیں، یہ ایک ٹھیک ٹھاک قید خانہ تھا۔

اس سے پہلے کہ یہاں گھپ اندھیرا پھیلے اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، مجھے کھانا کھا لینا چاہیے یہ سوچ کر میں نے شاپر کھولا اور کھانا نکال کر پلیٹ میں سالن ڈال لیا، کھانے میں تندور کی تین روٹیاں اور آلو قیمے کا سالن تھا۔

کھانے سے فارغ ہوکر میں ہاتھ منہ دھو کر فرش پر لیٹ گیا۔ مغرب اور عشاء کی اذان کی مدھم سی آواز سنائی دی تو میں نے نمازوں کے اوقات جان لیے، عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو اور اپنے سارے معاملات کو اللہ کے حوالے کردیا تھا، وہ جو بھی کرے گا وہی میرے حق میں بہتر ہوگا۔

حیرت انگیز طور پر میں بہت مطمئن تھا تھوڑی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی، رات بھر میں بہت گہری نیند سویا، آنکھ کھلی تو کمرے میں کا اجالا پھیل چکا تھا، میں نے بیٹھ کر پھر ان لوگوں کا انتظار کرنا شروع کردیا، کبھی اٹھ کر اس آٹھ بائی دس فٹ کے کمرے میں ٹہلنے لگتا۔

انتظار کرتے کرتے رات ہوگئی، کمرے میں اندھیرا چھا گیا، اب میں پریشان ہونے لگا کہ وہ لوگ کیوں نہیں آئے، بوتل میں پانی بھی ختم ہوچکا تھا، مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں؟ کس شہر میں ہوں؟ میں نے کار میں کتنی دیر سفر کیا تھا، ایبٹ آباد پنڈی یہاں سے خاصا دور ہے۔ انہیں گئے ہوئے پچیس چھبیس گھنٹے گزر چکے تھے، اس ویرانے میں جہاں کسی کی آواز کوئی آہٹ کچھ بھی تو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی تہہ خانہ ہوسکتا ہے، جب ہی

غزل

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تک ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے
یا رب! کسی کے راز محبت کی خیر ہو
دست جنوں رہے نہ رہے آستیں رہے
جا اور کوئی ضبط کی دنیا تلاش کر
اے عشق! ہم تو اب تیرے قابل نہیں رہے
مجھ کو نہیں قبول دو عالم کی وسعتیں
قسمت میں کوئے یار کی دو گز زمیں رہے
اللہ رے چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا
رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے
(انتخاب۔ غلام سکینہ صابر لنگاہ۔ لاہور موڑ پرانا خانیوال)

یہاں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی مگر اذان کی مدہم سی آواز سنائی دیتی ہے‘ اس کا مطلب ہے یہیں قریب ہی کوئی مسجد ہے۔

نماز عشاء سے فارغ ہو کر میں دوبارہ لیٹ گیا‘ بھوک اور پیاس دونوں ستا رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا ٹائم ہو رہا تھا جب آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

میرے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا‘ روشنی کی ایک لکیر اندر آئی پھر جابر خان اور مینا اندر آ گئے‘ اس وقت ان کا تیسرا پستول بردار ساتھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔

اس نے اندر آ کر ٹارچ کو کمرے میں گھمایا پھر میرے اوپر روشنی کا ہالہ آیا تو میں نے بے ساختہ تیز روشنی سے گھبرا کے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”تم جاگ رہے ہو ڈاکٹر!“ اس نے پوچھا اور ٹارچ کا رخ نیچے کی جانب کر دیا۔

”تمہارے آنے سے پہلے سو رہا تھا‘ یہ بتاؤ تم نے میرے بیان کی تصدیق کر لی اور تمہیں یقین آ گیا کہ میں ڈاکٹر شاہ زمان ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں!“ اس نے مختصر سا جواب دیا پھر میرے نزدیک آ کر میرے قریب جھکا اور میرا بازو پکڑ کر مجھے کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

”پہلے تم ہمارے ساتھ یہاں سے چلو‘ نہا دھو کر فریش ہو جاؤ‘ پھر کھانا کھانا اس کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“

میں نے حیرت سے جابر خان کی اور مینا کی جانب دیکھا‘ جابر خان کا چہرہ سپاٹ تھا مگر مینا کے لب مسکرا رہے تھے اور وہ بڑی دلچسپ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

”ایک بات کہوں دوست! تم بُرا مت ماننا‘ مجھے یہاں سے نکلتے ہوئے فی الحال تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھنی پڑے گی۔“ جابر خان نے کمرے سے نکلنے سے پہلے کہا۔

”جیسے تمہاری مرضی!“ میں نے کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ ”میری تسلی کے لیے یہی کافی ہے کہ تم نے مجھے دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے‘ ویسے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی بھی تمہیں مجھ پر پوری طرح بھروسہ نہیں ہوا ہے۔“

”آئی ایم سوری! مگر یہ ہماری مجبوری ہے‘ ہم لوگ جس فیلڈ میں ہیں وہاں اپنے ساتھیوں پر بھی مشکل سے بھروسہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے ہی ساتھی ہمارے ساتھ غداری کر جاتے ہیں اور تم تو پھر بالکل نئے ہو۔“ اس نے میری آنکھوں پر جیب سے سیاہ رنگ کی پٹی نکال کر باندھتے ہوئے کہا۔

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا‘ ان کے دو ساتھیوں نے غداری کی اور ان میں کوئی سنی نامی شخص اور دوسرا یقیناً سلطان تھا مگر میں نے اس بات کا اظہار جابر کے سامنے نہیں کیا‘ میں اسے یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اان لوگوں کے بارے میں بالکل ہی انجان ہوں اور جہاں تک میرا خیال تھا یہ لوگ منشیات فروش تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ ان کے اور بھی دھندے ہوں۔

جابر میرا ہاتھ تھام کر مجھے لے جا رہا تھا پھر رک کر اس نے کہا۔

”آگے سیڑھیاں ہیں۔ تم اسٹیپ بائی اسٹیپ پاؤں رکھتے جاؤ۔“ جابر کے کہنے پر میں سمجھ گیا کہ میں کسی تہہ خانے میں تھا‘ اس لیے سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر جا رہے تھے۔

پھر ہم کسی کار میں بیٹھ گئے‘ کار مینا ڈرائیو کر رہی تھی جب کہ جابر میرے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔

تقریباً دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد مینا کی آواز سنائی دی‘ اس نے جابر سے کہا۔

”میرا خیال ہے جابر! اب ان کی آنکھوں سے پٹی کھول دو ہم مین روڈ پر آ گئے ہیں۔“ تو جابر نے میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ پٹی کھلنے کے بعد میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ روڈ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا عام لوگ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے البتہ ایک دو کاریں یا سوزوکی ہمارے قریب سے گزر جاتیں۔

میں کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا مگر یہ سڑکیں اور یہاں کی عمارتیں سب میرے لیے انجان تھیں۔

”ہم کس جگہ پر ہیں؟“ میں نے جابر سے پوچھا۔

”کیوں؟ تمہیں یہ بات پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ جابر نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”یوں ہی!“ میں نے کہا۔ ”میں تو روہڑی سے چلا تھا پھر کس جگہ پر آنکھ کھلی پتا نہیں۔“

”یہ حیدر آباد ہے۔“ جابر نے گزشتہ لہجے میں کہا۔

”کراچی یہاں سے کتنی دور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تین چار گھنٹے کا سفر ہے۔“ جابر بولا۔

”کراچی جانا چاہتے ہو کیا؟“ ڈرائیو کرتے کرتے مینا نے گردن موڑ کر پوچھا۔

”ہاں! اگر تم لوگ مجھے آزاد کر دو گے تو کراچی چلا جاؤں گا لیکن اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ رکھو گے تو کراچی نہیں جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان مزید سوال و جواب ہوتے مینا نے ایک عمارت کے گیٹ کے سامنے کار کو روک دیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب روڈ سے ہٹ کر قطار میں بنے بنگلوں کے سامنے آ گئے۔

مینا نے ہارن بجایا تو بنگلے کا گیٹ کھل گیا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار کے کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ کار اندر آتے ہی چوکیدار نے تیزی سے گیٹ بند کر دیا۔

میں مینا اور جابر کے ہمراہ کار سے نیچے اتر آیا اور ان کے ساتھ اندر کی جانب بڑھنے لگا‘ اندر میں نے دو اسلحہ بردار گارڈز کو دیکھا جو اندرونی دروازے کے سامنے ٹہل رہے تھے۔

کار پورچ کے ساتھ ہی ایک لان بنا ہوا تھا‘ وہ بنگلے کے اندرونی حصے میں ایک جانب سے دوسری جانب گشت لگا رہے تھے۔

مینا نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گھمایا اور دروازہ اندر کی جانب دھکیل دیا‘ دروازہ لاک نہیں تھا۔

ہم اندر جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ڈرائنگ روم تھا‘ بہت اعلیٰ اور قیمتی فرنیچر تھا‘ فرش پر دبیز اور نرم کارپٹ تھا‘ دیواروں پر قیمتی تصاویر آویزاں تھیں اور دروازے اور کھڑکیوں پر بھاری پردے لٹکے ہوئے تھے۔

میں یہاں پہنچ کر رک گیا تو مینا نے گردن گھما کر مجھ سے کہا۔

”آؤ! رک کیوں گئے؟“

میں جھجکتے ہوئے مینا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ جب کہ جابر وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مینا مجھے اپنے ساتھ ایک آراستہ بیڈ روم میں لے گئی اور بولی۔

”یہ سامنے واش روم ہے‘ تم جا کر غسل کر لو‘ میں تمہارے لیے ایک لباس نکال کر بیڈ پر رکھ دوں گی۔ تم اسے پہن لینا اور باہر آ جانا‘ میں تمہارے لیے کھانا لگواتی ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ سسٹر!“ میں نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”سسٹر نہیں‘ میرا نام مینا ہے‘ تم مجھے مینا کہہ کے

مخاطب کر سکتے ہو۔'' اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''شکریہ!'' میں نے پھر کہا۔

''یہ تم بار بار شکریہ کیوں کہتے ہو؟'' اس نے کہا۔

''پرانی عادت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

میری بات سن کر مسکراتی ہوئی وہ پلٹ کر جانے لگی مگر پھر رکی اور مڑتے ہوئے بولی۔

''آج شام کو باس آرہے ہیں' شام کو ان سے تمہاری ملاقات ہے۔ اب وہی تمہارے بارے میں فیصلہ کریں گے۔''

''وہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔

اور میں سوچنے لگا کہ اس نے ایسا کیوں کیا' کہیں ان لوگوں کا تعلق سردار شیر افضل سے تو نہیں...... یہ سوچ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر خیال آیا اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ مجھے اس طرح یہاں نہ لاتے اور میرے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے بلکہ سردار افضل کے حکم پر مجھے وہیں گولی مار دیتے' نہ جانے کیوں میں بار بار اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا مجھے بہادر بننا ہے' میں ایک پٹھان ہوں۔ میری رگوں میں ایک غیور ماں اور بہادر باپ کا خون دوڑ رہا ہے' بھلے میں نے اپنا وقت پڑھائی میں گزارہ ہے' لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ دور رہا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں اسلحہ کے بجائے نشتر تھا وہ بھی ایسا جو زخموں کا علاج کرتا ہے مگر اب جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے تو وقت نے میرے ڈاکٹر کو کہیں سلا دیا ہے' میں ایک آہنی اور فولادی انسان ہوں' جس کی رگ رگ میں انتقام کی آگ خون کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔

میں نے اپنی جوانی بہت پاکیزہ اور صاف ستھری گزاری ہے' دیکھنے میں بھی ایک وجیہہ اور خوب صورت جوان ہوں۔ چھ فٹ اور تین انچ میرا قد ہے' مضبوط جسم' چوڑا سینہ اور بھرے بھرے بازو تھے۔ رنگ سرخ سفید' براؤن آنکھیں اور براؤن بال ہیں۔ صنف نازک کے لیے میرے اندر بے پناہ کشش ہے' میڈیکل کالج میں بھی کتنی ہی لڑکیوں نے میری رفاقت چاہی مگر میں اپنے بابا اور اماں کا سپنا پورا کرنا چاہتا تھا اگر لڑکیوں کے چکر میں پڑ جاتا تو صرف اسی مشغلے کا رہ جاتا۔

پھر ملاقات مہوش سے ہوگئی' وہ اپنی تمام تر محبتوں کی شدتوں کے ساتھ میری جانب بڑھی۔ میں نے بار بار اسے نظر انداز کیا مگر اس کے پائے استقامت میں کوئی کمی نہیں آئی' وہ میرے نظر انداز کرنے کو نظر انداز کرتی رہی۔

اور پھر وہ جیت گئی اور میں ہار گیا۔ آخر کب تک میں بھی اپنے دل میں موجود محبت کے جراثیموں کو سلاتا رہتا۔ میں نے اس کی محبت کو قبول کرلیا' اس وقت میڈیکل کا میرا آخری سال تھا۔ ہماری محبت پروان چڑھتی رہی' حالاں کہ میری اور اس کی کلاس میں بہت فرق تھا' میں نے بارہا اس بات کا احساس اسے کرایا مگر وہ ہر بار یہی کہتی کہ اس کے پاپا اسے بے حد چاہتے ہیں' اسے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی فرمائش کو ٹھکرایا ہو اور پھر یہ تو اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہے۔ اس کی زندگی بھر کی خوشیوں کا سوال ہے۔ پاپا کیسے اس کی یہ بات نہیں مانیں گے۔ مگر وقت نے ثابت کردیا کہ مہوش کو کتنی غلط فہمی تھی' ایسا بالکل بھی نہیں ہوا۔

میں نہانے کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں سوچتا رہا تھا' آج کئی دنوں کے بعد غسل کیا تھا' اس لیے دیر تک نہاتا رہا۔ مینا نے کہا تھا کہ دوسرا لباس وہ بیڈ پر رکھ

دے گی' اس لیے میں کمر کے گرد بڑا سا تولیہ لپیٹ کر باہر آ گیا۔

میری نگاہ بیڈ پر پڑی وہاں تو کوئی لباس نہیں تھا' میں پلٹ کر دوبارہ باتھ روم جانے لگا تب ہی مینا دروازہ کھول کر اندر آ گئی' اس کے ہاتھ میں ہینگر میں ایک شلوار قمیص کا سوٹ تھا۔

''یہ لو بھئی! تمہارے لیے شلوار سوٹ منتخب کر کے لائی ہوں' دراصل تمہارا ناپ......!'' اس نے اندر آتے ہی کہا مگر میرے اوپر نگاہ پڑی تو اس کی زبان کو ایک دم بریک سا لگ گیا...... وہ چند لمحوں تک ایک ٹک مجھے تکتی رہی۔

مجھے شرم سی آنے لگی۔ اس حالت میں ایک اجنبی عورت کے سامنے کھڑا رہنا مجھے بہت بُرا لگ رہا تھا' میں پلٹ کر باتھ روم جانے لگا تو وہ بولی۔

''رکو......!'' تو میں رک گیا۔

وہ میرے نزدیک آئی اور میرا جائزہ لیتے ہوئے پرستائش لہجے میں بولی۔

''واؤ......! یو آر ویری اسمارٹ اینڈ ہینڈسم! بڑی ڈیشنگ پرسنالٹی ہے تمہاری۔''

''اس حالت میں' میں تمہیں ڈیشنگ دکھائی دے رہا ہوں۔'' میں نے بُری طرح جھینپ کر کہا۔

''ہوں......! ساری اصلیت دکھائی دے رہی ہے۔'' اس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا تو میں نے اس کے ہاتھوں سے جھٹ کپڑے جھپٹ لیے اور تیزی سے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا۔

میں کپڑے پہن کر باہر آیا تو وہ اسی جگہ کھڑی تھی' وہ ایک بار پھر میرا جائزہ پُرشوق نگاہوں سے لینے لگی۔

مینا کی یہ نگاہیں میرے لیے اجنبی نہیں تھیں' میرا بار بار ایسی نگاہوں سے واسطہ پڑا تھا' بقول مہوش کے کہ ''تمہارے مریضوں میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہوتی ہے' جو صرف تمہاری خوب صورتی کی وجہ سے تمہارے کلینک آتی ہیں۔'' اور میں ہنس کر کہتا۔

''جیلس ہو رہی ہو۔''

میں نے کمرے میں موجود ڈریسر کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنائے' شلوار اور قمیص میرے جسم پر چھوٹی تھی' شلوار تو ٹخنوں سے بھی اونچی تھی۔

''تمہارے ناپ کا کوئی لباس نہیں تھا' فی الحال اسی پر گزارہ کرو' دوسرا ابھی آجائے گا۔''

''تم میرا لباس دُھلوا دینا' میں وہی پہن لوں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر لے گئی وہاں کھانا رکھا تھا' صرف روٹی اور سالن تھا۔

میں نے جتنی دیر کھانا کھایا مینا میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی' اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی' کھانے کے بعد اس نے کسی کو آواز دے کر کہا کہ چائے ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔

ہم ڈرائنگ روم میں آئے تو جابر فون پر کسی سے بات کر رہا تھا' ہمیں دیکھ کر اس نے فون بند کردیا اور مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو تم سردار شیر افضل اور شیر زادہ خٹک سے انتقام لینا چاہتے ہو۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ میں کھڑے کھڑے پسینے میں نہا گیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

فرض

السلام علیکم!

سچی کہانیوں کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس میں نئے لکھنے والوں کو بھی موقع ملتا ہے آپ اسے جاری رکھیے گا۔ فرض کے عنوان سے ایک کہانی حاضر خدمت ہے۔ اس کہانی کا تعلق ایک شہید پولیس افسر سے ہے جس کی دیانت داری نے ایک خاندان کو نہ صرف انصاف مہیا کیا بلکہ نئی زندگی بھی عطا کی۔ اس کی یہی دیانت داری ایک روز اس کی جان کی دشمن بن گئی اور وہ تاریک راہوں پر دہشت گردوں کی گولیوں کا شکار ہوگیا۔ یہ کہانی آپ کو پسند آئے یا نہ آئے مگر اس افسر کے لیے دعائے مغفرت ضرور کیجیے گا۔

والسلام

شعیب شیخ

حیدر آباد

بارشوں کا موسم شروع ہوتے ہی آسمان پر گھٹائیں چھانے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پچھلے چار روز سے معمول ہوگیا تھا کہ شام ہوتے ہی آسمان پر بادل چھا جاتے اور پھر ایسی زور وشور سے بارش ہوتی کہ سارا شہر جل تھل ہو جاتا۔ گنجان آباد علاقے کی دکانیں اور دفاتر عجلت میں بند ہونے لگتے۔ تمام لوگ جلدی جلدی گھروں کی جانب دوڑنے لگتے۔ رات گئے تک بارش کا سلسلہ چلتا اور پھر اچانک تھم جاتا۔ چند ساعتوں میں بادل چھٹ جاتے اور مطلع صاف ہوجاتا۔ ایسے میں چاند اور ستاروں کی جھلملاہٹ آنکھوں کو بہت سکون پہنچاتی۔ لگتا ہی نہیں کہ تھوڑی دیر پہلے تک بارش نے تباہی مچائی ہے۔

آج بھی ایسا ہی ہوا۔

ابھی پانچ بجے ہی تھے کہ آسمان پر چھائے بادلوں نے برسنا شروع کردیا۔ دھڑا دھڑ دفاتر اور دکانیں بند ہونے لگیں۔ لوگ چھتریاں کھولے اپنے اپنے گھروں کی جانب دوڑنے لگے۔

اچانک ہی گیلی سڑک پر ایک سفید رنگ کی لیموزین نمودار ہوئی۔ کار کی رفتار تیز تھی اور کچھ بے ہنگم سے انداز میں دائیں بائیں ڈولتی ہوئی سڑک پر چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو گاڑی کا ڈرائیور نشے میں ہے یا پھر کوئی ریس لگی ہوئی ہے۔ کالی گھٹاؤں اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے روشنی بھی مدہم ہوگئی تھی۔ چند گز کے فاصلے کی چیز بھی واضح نظر نہیں آرہی تھی۔

فٹ پاتھ پر تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک بزرگ ابھی سڑک پار کرنے کی کوشش میں تھے اور انہوں نے اپنا پاؤں سڑک پر رکھا ہی تھا کہ لیموزین لہراتی ہوئی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ نا صرف یہ بلکہ لیموزین کی رفتار کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ بزرگ پیچھے ہٹتے، لیموزین ان پر چڑھ چکی تھی۔

ماحول میں ایک دم سکتہ طاری ہوگیا۔ لیموزین ایک لمحے کے لیے جھٹکے سے رکی پھر اس کی رفتار تیز ہوتی گئی اور وہ سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔

بزرگ چند لمحے وہیں پڑے تڑپتے رہے اور پھر

ساکت ہوگئے۔ یہاں وہاں سے لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہوگیا۔ کوئی کہتا ایمبولینس بلاؤ، کوئی کہتا پہلے پولیس کو بلاؤ یہ ایکسیڈنٹ پولیس کا کیس ہے لیکن کوئی بھی پولیس یا ایمبولینس کو کال نہیں کر رہا تھا۔ ایک ریڑھی والے چاچا نے اپنے موبائل فون سے پہلے ایمبولینس کو کال کی پھر پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ چند منٹوں بعد ہی اتفاقی طور پر ایک ساتھ پولیس اور ایمبولینس پہنچ گئیں۔ پولیس والے موبائل سے اُترتے ہی روایتی رعب جھاڑتے ہوئے لوگوں کو ہٹانے لگے۔

اے ایس آئی نے بزرگ کو چیک کیا اور افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے ایمبولینس کے عملے کو لاش اٹھانے کا اشارہ کیا۔ بزرگ کی جیب سے برآمد ہونے والے شناختی کارڈ ایک پرچے پر لکھے ٹیلی فون نمبر کی مدد سے ان کے لواحقین کو اس افسوس ناک واقعے کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔

معلوم ہوا کہ بزرگ گھر کے واحد کفیل تھے۔ گھر میں دو نوجوان لڑکیاں اور ان کی اہلیہ تھیں۔ میڈیا نے خوب اس معاملہ کو اُچھالا کیونکہ دو دن گزرنے کے باوجود پولیس اس ڈرائیور کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی، جس نے ایک گھر کا چراغ گل کردیا تھا۔ میڈیا کی وجہ سے جب بات پولیس کی بدعنوانی پر آئی تو فوراً اوپر سے خاص احکامات کے ذریعے اس کیس کا چارج عبید رضوی کو دیا گیا۔ میڈیا مطمئن ہوا کیونکہ عبید رضوی کا نام نہایت عزت واحترام سے لیا جاتا تھا۔ وہ ریٹائرڈ میجر تھا اور اب پولیس کے شعبۂ انویسٹی گیشن میں خدمات سر انجام دے رہا تھا۔ سب سے پہلے عبید رضوی صاحب جائے وقوع پر پہنچا اور ارد گرد کے لوگوں سے اس افسوس ناک واقعہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔

''جناب! اس شام اتنی زور کی بارش پڑ رہی تھی کہ ہمیں اپنے اپنے گھروں کی جانب دوڑنے کے سوا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر کالی گھٹا کی وجہ سے روشنی بھی کم تھی۔ ہم نے گاڑی تو دیکھی تھی پر یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کون سے ماڈل کی گاڑی تھی۔''

تقریباً ہر شخص جو اس وقت وہاں موجود تھا، اس کا یہی بیان تھا شاید لوگ اپنی روایتی بے حسی کی وجہ سے اس معاملے میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ عبید رضوی بہت تحمل مزاجی سے تفتیش کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگ جان بوجھ کر معلومات فراہم نہیں کر رہے ہیں، ہر کوئی پولیس کے چکر میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ آخر کار وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو اچانک وہی ریڑھی والا چاچا جس نے پولیس اور ایمبولینس کو کال کر کے بلایا تھا۔ سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔

''صاحب! میں جانتا ہوں کس گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور میں نے ہی پولیس اور ایمبولینس کو اطلاع دی تھی۔'' چاچا نے دائیں بائیں محتاط انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''چاچا! تو پھر تم نے کیا دیکھا تھا؟ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' عبید نے دھیمے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

چاچا، ان کے اندازِ گفتگو سے متاثر ہوئے، ان کا لہجہ روایتی پولیس والوں جیسا سخت اور اکھڑ نہیں تھا۔

''جناب! وہ ایک سفید رنگ کی بڑی گاڑی تھی۔ فلموں میں بہت دکھائی جاتی ہے۔ ایسی گاڑیاں میں نے خبروں کے چینل پر سیاست دانوں کے استعمال میں دیکھی ہیں لیکن مجھے اس گاڑی کا نام معلوم نہیں ہے۔'' چاچا نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

عبید کو صرف ایک نکتہ چاہیے تھا جو اسے مل گیا تھا۔ وہ چاچا کو اپنے ساتھ دفتر لے آیا اور جہاں لیپ ٹاپ

پر تمام دور جدید کی گاڑیوں کی تصاویر چاچا کو دکھائیں لیکن چاچا انکار کرتا رہا پھر اس نے ویب سائٹ پر لیموزین لکھ کر انٹر کیا تو لیموزین کی تمام تصاویر اسکرین پر آ گئیں۔

"جی جناب! یہی گاڑی تھی۔" چاچا نے اچانک چونکتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے یہی گاڑی تھی لیکن میں تمہاری یادداشت چیک کرنے کے لیے اتنی دیر سے دوسری گاڑیاں دکھا رہا تھا۔ جب تم نے کہا کہ وہ گاڑی فلموں میں اور سیاست دانوں کے زیر استعمال ہوتی ہیں اسی وقت میرے ذہن میں اس گاڑی کا نام آ گیا تھا۔ اس لیے تمہارے سامنے نام لینے کے بجائے تصویر کے ذریعے شناخت کرانے کو ترجیح دی۔ کیونکہ جب تمہیں اس گاڑی کا نام ہی نہیں معلوم تو اس کا نام لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری مدد کی۔ ان شاء اللہ! اب وہ ڈرائیور پکڑا جائے گا۔ یہ لو! رکھ لو کام آئیں گے۔" عبید نے سو سو کے چند نوٹ چاچا کی جانب بڑھائے۔

"نہیں صاحب! ہم محنت کرنے والے لوگ ہیں۔ اللہ کا کرم ہے ریڑھی سے اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔ میں نے تو انسانی ہمدردی کے تحت آپ کی مدد کی ہے۔" چاچا نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"غریب آدمی کے پاس سفید پوشی اور خودداری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عزت نفس ان کے لیے بہت معنی رکھتی ہے۔" عبید نے سوچتے ہوئے نوٹ واپس جیب میں رکھ لیے اور چاچا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں ان کی ریڑھی تک چھوڑ آیا دفتر پہنچتے ہی ہر قسم کی گاڑیوں کی جانچ پڑتال کے ڈیپارٹمنٹ فالکن بیس سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ شہر میں صرف دو لوگوں کے پاس سفید رنگ کی لیموزین گاڑیاں ہیں۔ ایک ہیروں کے تاجر سیٹھ عبدالکریم ناڈیا والا اور دوسری شہر کے سابقہ میئر اور موجودہ حکومت میں وفاقی وزیر تعلیم اسد اللہ بھٹی کے پاس۔ یہ معلومات حاصل ہوتے ہی صرف ایک لمحے کے لیے اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں لیکن ان بزرگ کی بیوہ اور جوان بیٹیوں کے چہرے جب ان کی آنکھوں کے سامنے لہرائے تو فوراً ہی اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو جنبش دی اور روانہ ہو گیا۔

☆☆......☆☆☆

تیسری بیل پر سیٹھ عبدالکریم ناڈیا والا کے گارڈز نے دروازہ کھول دیا۔

"جی جناب! کس سے ملنا ہے؟" گارڈ نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے سیٹھ صاحب سے ملنا ہے۔ انہیں بتاؤ کہ انویسٹی گیشن ونگ سے عبید رضوی آئے ہیں۔"

"لیکن سر! سیٹھ صاحب تو پچھلے پندرہ دنوں سے عمرے کی ادائیگی کے لیے اپنی پوری فیملی کے ساتھ سعودی عرب گئے ہوئے ہیں۔"

"ان کی لیموزین گاڑی اس وقت کہاں ہے؟"

"سر! وہ تو پچھلے پندرہ دنوں سے گیراج میں کھڑی ہوئی ہے۔"

"میں اس گاڑی کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن سر! ہمیں اجازت نہیں ہے۔"

"دیکھو! یہ ایک ایکسیڈنٹ کا معاملہ ہے، جس میں بندہ مر چکا ہے۔ میں صرف چیک کر کے چلا جاؤں گا کہ سیٹھ صاحب کی لیموزین گاڑی سے تو یہ ایکسیڈنٹ نہیں ہوا؟"

"صاحب! آپ اس ایکسیڈنٹ کی بات کر رہے ہیں جو دو دن پہلے ہوا تھا۔ میں نے اس کی خبر اخباروں میں پڑھی تھی اور سیٹھ صاحب کی گاڑی تو پچھلے پندرہ دنوں سے گیراج میں کھڑی ہے۔"

"دیکھو! مجھے مطمئن ہونے دو۔ میں اپنی ڈیوٹی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اگر تم نے ابھی گاڑی چیک نہیں کرائی تو میں خاص حکم کے تحت تمہیں اور گاڑی دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور پھر اپنے طریقے سے تفتیش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ گاڑی چیک کر لیں۔" گارڈ پیار سے ماننے والوں میں سے نہیں تھا اس لیے اسے دھمکی آمیز انداز میں سمجھانا پڑا تھا۔

لیموزین پر نظر پڑتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ گاڑی پچھلے پندرہ دنوں سے گیراج میں کھڑی تھی۔ دھول مٹی سب بتا رہی تھی۔ زمین پر بھی دھول جمی ہوئی تھی پھر بھی اس نے گاڑی کو اچھی طرح چیک کیا، اس کا میٹر اور فیول میٹر بھی چیک کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے بھی دیکھ لی۔

سیٹھ صاحب کی گاڑی اب اس کے شک کے دائرے سے باہر تھی۔ اس نے گارڈ کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور وزیر تعلیم کے محل نما گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ حسب روایت وفاقی وزیر صاحب کے محل نما گھر پر روز مرّہ کی سیکورٹی تعینات تھی۔ عبید رضوی کی گاڑی دروازے سے تھوڑی دور رکی تو ایک آفیسر رعب دار انداز میں ان کی جانب بڑھا۔ گاڑی سے اتر کر انہوں نے کوئی بات کیے بغیر جب اپنی شکل اس کی جانب واضح کی تو آفیسر مستعدی کے ساتھ انہیں سلیوٹ مار کر ایک طرف ہو گیا۔

"وزیر صاحب تو ہوں گے نہیں، مجھے ان کے گھر کے کسی فرد سے بات کرنی ہے۔" انہوں نے سیکورٹی انچارج سے بلاتمہید کہا۔

"سر! وزیر صاحب تو دارالحکومت گئے ہوئے ہیں، ان کی فیملی موجود ہے لیکن اس وقت وہ مل نہیں سکتے۔"

انگلینڈ سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"ان کی فیملی میں کون کون ہے؟"

"سر! ان کی اہلیہ، تین بیٹیاں اور ایک اکلوتا بیٹا ہے۔"

"وزیر صاحب کی بیگم سے کہو کہ میں آیا ہوں اور ایک ایکسیڈنٹ کی تفتیش کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرنی ہے۔"

"لیکن سر! وزیر صاحب کی بیگم صاحبہ سے تفتیش...... ! وزیر صاحب کو پتا چلا تو بہت گڑبڑ ہوجائے گی آپ کے ساتھ......!" سیکورٹی انچارج نے گویا اسے خبردار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے جو کہہ رہا ہوں تم اس کی تعمیل کرو۔ میری تفتیش کے معاملے میں زیادہ دماغ مت کھپاؤ۔ انہیں بولو عبید رضوی آئے ہیں۔" ان کی تیور بگڑتے دیکھ کر سیکورٹی انچارج سرہلاتا ہوا اندر چلا گیا۔

"سر! آپ اندر آسکتے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد سیکیورٹی انچارج نے مؤدبانہ انداز میں ہاتھ باندھے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ وزیر تعلیم کے عالیشان محل کو افسوس کے ساتھ دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔

"ارے رضوی صاحب! کیوں زحمت اٹھائی ......اپنا کوئی ماتحت بھیج کر پیغام دے دیتے، ہم اپنے مشیر کو آپ کے پاس بھجوادیتے۔" وزیر تعلیم کی بیگم نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہال میں وزیر تعلیم کی بیگم اور بیٹا بیٹھے ہوئے تھے۔ دو مہمان بھی صوفے پر براجمان تھے۔

"میڈم! میرا کام ایسا ہے کہ مجھے خود ہی حرکت کرنا پڑتی ہے اور اپنی روزی حلال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی بھاگ دوڑ کرے۔" اس نے ہال میں موجود لوگوں کے چہروں پر آئی ہوئی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا جناب! کہیے کیسے آنا ہوا؟"

"آپ کے پاس جو سفید لیموزین گاڑی ہے مجھے اس کو چیک کرنا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دو دن قبل شام کے وقت یہ گاڑی کہاں تھی اور اسے کون چلا رہا تھا؟" عبید رضوی نے جان بوجھ کر سیدھا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ہال میں موجود تمام لوگوں کے چہروں کا بغور جائزہ بھی لیا اور ایک چہرہ اس کی عقابی نگاہوں کے فوکس میں جیسے فٹ ہوگیا۔ اس چہرے پر ایک لمحے کے لیے جو رنگ آ کر گزرے، وہ اس کے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے کافی تھے۔

"رضوی صاحب! ہماری لیموزین تو ایک ہفتے سے گیراج میں کھڑی ہے، یہ لیموزین صرف صاحب استعمال کرتے ہیں اور وہ تو دارالحکومت میں ہیں، اس لیے گاڑی استعمال میں ہے ہی نہیں۔" وزیر تعلیم کی بیگم نے حتی الامکان لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے میڈم! دو دن پہلے شام کے وقت سفید رنگ کی لیموزین سے ایک ایکسیڈنٹ ہوا تھا، جس کے نتیجے میں ایک بزرگ جاں بحق ہوگئے۔ میری معلومات کے مطابق اس شہر میں صرف دو لیموزین گاڑیاں ہیں۔ ایک مشہور تاجر سیٹھ عبدالکریم ناڈیاوالا کے پاس اور دوسری آپ کے پاس...... سیٹھ کریم کی گاڑی کو میں چیک کرچکا ہوں، اب صرف آپ کی گاڑی چیک کرنے کے بعد ہی پتا چل سکے گا کہ آپ کی گاڑی اس حادثے میں ملوث ہے یا نہیں!"

"لیکن جب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ہماری گاڑی ایک ہفتے سے سڑک پر نکلی ہی نہیں ہے تو پھر اس کو چیک کرنے کا کیا جواز بنتا ہے؟ کیا آپ کو

میری بات پر بھروسا نہیں ہے؟" وزیر تعلیم کی بیگم اچانک بھڑک اٹھیں۔

"دیکھیے میڈم! نا آپ جھوٹ بول رہی ہیں اور نا میں آپ پر شک کررہا ہوں۔ میں صرف اپنی ڈیوٹی کررہا ہوں۔ آپ کو چاہیے کہ قانون کی مدد کریں۔" عبید رضوی نے موصوفہ کے بگڑتے تیور کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

"رضوی صاحب! ہماری گاڑی چیک کرنے کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ آپ ہم پر شک کررہے ہیں اور پھر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم کوئی عام افراد نہیں ہیں، یہ وزیر کا گھر ہے۔ یہ ہماری توہین ہوگی کہ ہم سے تفتیش کی جائے۔"

"میڈم! قانون کی نظر میں کوئی عام اور خاص نہیں ہوتا بلکہ سب برابر ہوتے ہیں اور آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں کہ آپ کی توہین ہوگی؟ قانون کی مدد کرنے سے انسان کی عزت و تکریم ہوتی ہے اور میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ آپ اپنی گاڑی چیک کرانے سے اتنا گریز کیوں کررہی ہیں، آپ کی یہ بات تو مجھے شک میں مبتلا کردے گی۔" ان کی بات سن کر میڈم کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا لیکن اسی لمحے کسی اور کا بھی رنگ متغیر ہوا جو عبید رضوی کی عقابی نظروں سے نہ چھپ سکا۔

"ایک منٹ رضوی صاحب! میں آپ کی اسد صاحب سے موبائل فون پر بات کرواتی ہوں۔" یہ عورت اتنی حیل و حجت کیوں کررہی تھی، وہ جانتے تھے۔

"او جی سنیے! یہاں انویسٹی گیشن ونگ سے عبید رضوی صاحب آئے ہوئے ہیں اور ہماری لیموزین چیک کرنا چاہتے ہیں...... ہاں جی...... اچھا جی...... لیجیے! رضوی صاحب! بات کیجیے۔" میڈم نے موبائل فون پر بات کرکے موبائل فون اس کی جانب بڑھادیا۔

"ارے سرکار! آپ نے کہاں اتنی تکلیف اٹھائی، مجھے بلوالیا ہوتا۔ میں آپ کے پاس حاضر ہوجاتا۔ آخر عوام کا خادم ہوں۔" دوسری طرف سے خوشامدانہ انداز میں اسد اللہ بھٹی نے بات شروع کی۔

"دیکھیے بھٹی صاحب! ایک حادثے کی تفتیش کے لیے مجھے آپ کی گاڑی چیک کرنی ہے لیکن آپ کی بیگم صاحبہ بضد ہیں کہ وہ گاڑی چیک نہیں کروائیں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کی گاڑی ایک ہفتے سے گیراج میں کھڑی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر بیگم صاحب کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف گاڑی چیک کروں گا، اگر آپ کی گاڑی اس حادثے میں ملوث نہیں ہوئی تو معذرت کرکے چلا جاؤں گا۔"

"لیکن رضوی صاحب! ہوسکتا ہے کہ کوئی دوسری گاڑی......"

"بھٹی صاحب! اس شہر میں صرف دو لیموزین کاریں ہیں۔ ایک میں چیک کرچکا ہوں۔ اب آپ کی باری ہے۔" عبید رضوی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ اب بھی گاڑی کے معاملے میں بضد ہیں تو مجھے مجبوراً گاڑی کو لیبارٹری لے جانا ہوگا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میرے پاس ہمیشہ سے ایسے غیر معمولی اختیارات ہوتے ہیں کہ کوئی بھی میری تفتیش میں رکاوٹیں نہیں ڈال سکتا۔ چاہے وہ کوئی وزیر ہی کیوں نہ ہو۔" ان کے اندازِ گفتگو میں پوشیدہ تنبیہ کو وزیر موصوف نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ فوراً آمادہ ہوگیا۔

"او جی! ٹھیک ہے۔ آپ کا جو دل چاہے کریں، آپ کو اجازت ہے۔ آپ فون بیگم صاحبہ کو دیجیے۔"

وزیر نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا پھر انہوں نے اپنی بیگم کو کچھ ہدایت دیں تب وہ فوراً آمادہ ہوگئیں۔

"آیئے جی! آپ کو میں خود گیراج کا وزٹ کرادیتی ہوں۔" ان کے ساتھ چند ملازم بھی ہولیے۔

گیراج کا شٹر اٹھا تو اندر سے دھول مٹی ہوا میں پھیلتی ہوئی باہر آنے لگی۔

"دیکھیے جناب! حالت سے ہی لگ رہا ہے کہ گاڑی ایک ہفتے سے کھڑی ہے۔"

گیراج میں صرف لیموزین کھڑی تھی۔ زمین پر دھول تھی اور گاڑی پر بھی دھول جمی ہوئی تھی۔ بظاہر ایسا ہی لگتا تھا کہ گاڑی ایک ہفتے سے کھڑی ہے۔

"مجھے گاڑی کی چابی دیجیے۔" عبید رضوی نے میڈم سے گاڑی کی چابی لی۔ سب کو گیراج کے اندر آنے سے منع کرتے ہوئے انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور جائزہ لینے سے پہلے انہوں نے ہاتھوں میں سرجیکل دستانے چڑھا لیے تھے۔ گاڑی کا اچھا طرح سے جائزہ لینے کے بعد انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا اور میڈم کی جانب دیکھا تو ان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات نظر آئے لیکن اگلے لمحے جوں ہی انہوں نے چابی اگنیشن میں لگا کر گھمائی تو اچانک انہیں چونکنا پڑا لیکن انہوں نے اپنے تاثرات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

اگلے پل عبید رضوی نے فوری طور پر فنگر پرنٹس لینے کے لیے کال کی۔ پندرہ منٹ بعد ہی عملہ پہنچ گیا تو ان کی ہدایات کے مطابق جہاں جہاں سے انہوں نے بتایا پرنٹ اٹھا لیے گئے۔

"یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ آپ نے گاڑی چیک تو کرلی ہے اور کوئی ثبوت بھی نہیں ملا تو پھر یہ فنگر پرنٹس کس لیے......؟" بیگم صاحبہ پھر سے پریشانی میں مبتلا ہوگئیں۔ عبید رضوی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"بیگم صاحبہ! سب لوگ دوبارہ ہال میں چلیے۔" انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا تو کوئی سوال کیے بغیر سب ہال میں جمع ہوگئے۔

"بیگم صاحبہ! مجھے آپ کے گھر میں موجود سب لوگوں کے فنگر پرنٹس چاہئیں ابھی اور اسی وقت......"

"مگر کیوں......؟ گاڑی تو کلیئر ہے۔"

"آپ کی گاڑی کلیئر نہیں ہے۔ آپ نے جھوٹ بول بول کر بات یہاں تک پہنچادی ہے کہ اب مجھے باقاعدہ طور پر آپ کی فیملی سے تفتیش کرنا پڑ رہی ہے۔ آپ کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے اب مجھے بس اتنا معلوم کرنا ہے کہ کس شخص کی عدم توجہ سے ایک گھر کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا ہے۔" عبید رضوی کی بات سن کر سب سکتے میں آگئے۔

"چلیے! سب اپنے اپنے فنگر پرنٹس دیجیے۔" انہوں نے سب کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

وزیر موصوف کی بیگم کا رنگ اڑ گیا۔

"دیکھیے عبید صاحب! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی......"

"اگر آپ لوگوں نے تفتیش میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو میں پھر روایتی طریقہ تفتیش پر مجبور ہوجاؤں گا اور مجھے میڈیا والوں کو بھی ابھی بلوانا پڑ جائے گا۔" انہوں نے وزیر موصوف کی بیگم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وزیر موصوف کی بیگم صوفے پر ڈھیر ہوگئیں۔

عبید رضوی سمجھ گئے اب صرف اعتراف جرم باقی رہ گیا ہے جو چند لمحوں میں ہونے والا ہے۔

"عبید صاحب! آپ اپنے عملے کو ہدایات

کیجیے پلیز باہر چلے جائیں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" بیگم صاحبہ کی بات سن کر اس نے اپنے عملے کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

عبید صاحب! اس شام میرا بیٹا گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔ بارش بہت تیز تھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ غلطی اس شخص کی تھی وہ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا اچانک سڑک پر آگیا میرے بیٹے نے تو بہت کوشش کی مگر گاڑی بریک مارنے کے باوجود پھسلن کی وجہ سے رک نہ سکی اور ایکسیڈنٹ ہوگیا۔"

بیگم صاحبہ نے اعتراف جرم کرلیا تھا اور انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب میں موجود ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ بھی کرلیا تھا لیکن بیگم صاحبہ یہ جھوٹ بول رہی تھیں کہ ان کے بیٹے نے گاڑی روکنے کی کوشش کی تھی۔

"بیگم صاحبہ! اس شام آپ کے صاحبزادے شراب کے نشے میں ڈرائیو کررہے تھے۔ عینی شاہد کے مطابق گاڑی سڑک پر لہراتی ہوئی چل رہی تھی۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو یا پھر چلانے والا نشہ میں ہو۔ آپ کی گاڑی کے چاروں ٹائر صحیح حالت میں ہیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے یہ شراب کی بوتل بھی برآمد ہوئی ہے۔" عبید رضوی نے کوٹ کی جیب سے بوتل نکال کر دکھائی۔

وزیر تعلیم کا صاحبزادہ اب پریشانی کی حالت میں اپنی ماں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"بیگم صاحب! جرم کو چھپانا اور مجرم کی مدد کرنا بھی جرم ہے۔ آپ نے اپنے صاحبزادے کے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی مختلف قسم کے بہانے بنائے۔ آپ اسی دن سے جانتی تھیں کہ آپ کے صاحبزادے نے ایکسیڈنٹ کردیا ہے لیکن آپ نے اس بات کو معمولی بات سمجھا اور بھول گئیں لیکن قانون بھی کوئی شے ہے۔ میں آپ کے بیٹے کو شراب کے نشے میں گاڑی چلانے اور پھر ایک بزرگ شخص کو جاں بحق کرنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔" عبید رضوی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے عبید رضوی! میری بات سنیے......! دیکھیے میرے بیٹے کو گرفتار کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب وہ شخص واپس نہیں آسکتا۔ کیوں نا ہم کوئی ڈیل کرلیں عبید صاحب! اگر کچھ لے دے کر معاملہ ختم ہوجائے تو بہتر ہے۔" بیگم صاحبہ آخرکار سیاست دانوں والے روایتی گھٹیا پن پر آگئیں۔

"میں سمجھا نہیں!"

"دیکھیے عبید صاحب! ہماری ایک ساکھ ہے اگر آپ میرے بیٹے کو گرفتار کر بھی لیں گے تو کیا فائدہ......! آپ کو زیادہ سے زیادہ تعریفی کلمات سے نوازا جائے گا۔ ہم بڑے سے بڑا وکیل کرکے اپنے بیٹے کو بری کرالیں گے۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں ہم صرف میڈیا کی تنقید سے بچنا چاہتے ہیں۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ معاملہ یہیں ختم کردیں۔ آپ چاہیں تو ابھی آپ کو منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں۔" بیگم صاحب کی بات سن کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور آرام سے صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن لاعلمی میں...... میرے پاس ان لوگوں کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود ہیں لیکن واقعی اس طرح ان بزرگ کے گھر والوں کو کچھ نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں ایک لمحے میں ساری بات آگئی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! مجھے آپ کی پیش کش قبول ہے۔ دس لاکھ میرے خیال سے مناسب رقم

ہے۔" اس نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

بیگم صاحبہ پہلے تو یہ مطالبہ سن کر حیران ہوئیں لیکن پھر بغیر کچھ کہے دس لاکھ کا چیک پیش کردیا۔ عبید رضوی نے چیک اپنی جیب میں ڈالا اور روانہ ہوگیا۔

☆☆......☆☆

"دیکھو بہن! اب بھائی صاحب تو واپس نہیں آسکتے۔ صبر کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے' میرے پاس آپ کے لیے یہ چھوٹی سی رقم ہے۔ اس سے آپ اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرسکتی ہیں اور آپ کی زندگی بھی آرام سے گزر جائے گی۔ کلیم صاحب کی کمی تو ساری زندگی محسوس ہوگی۔ میرے ڈیپارٹمنٹ کے کچھ خدا ترس لوگوں نے یہ رقم خاص طور پر آپ کے لیے اکٹھی کی ہے' اسے قبول فرمائیے۔" عبید رضوی نے ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہونے والے بزرگ کلیم صاحب کی بیوہ کو پردے میں رہتے ہوئے دس لاکھ روپے کا چیک کیش کرانے کے بعد وہ رقم پیش کردی۔

"بھائی! آپ نے جو ہمارے لیے کیا ہے' ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ میں نے تو اپنے ہاتھ پیر ہی چھوڑ دیئے تھے کہ میری لڑکیوں کا کیا بنے گا' ان کی شادیاں کیسے ہوں گی لیکن اللہ نے ہمیں در بدر ہونے سے بچالیا۔ بھائی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" کلیم صاحب مرحوم کی بیوہ کا لہجہ رندھ گیا تھا۔

"میں نے صرف اپنا فرض پورا کیا ہے۔ بہن! اور ہاں آپ کی بیٹیوں کی شادی کی تمام ذمہ داری میرے اوپر ہے۔ آپ جب بھی مجھے یاد کریں گی' میں حاضر ہوجاؤں گا یہ میرا کارڈ رکھ لیجیے! اس پر میرا فون نمبر اور گھر کا پتا دونوں درج ہیں۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے اس مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے' جس کی وجہ سے آپ نے بیوگی کی چادر اوڑھی ہے۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور سیدھا اینٹی کرپشن ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔

فون کرکے اس نے پہلے ہی کرپشن مانیٹرنگ سیل کے انچارج میجر سلمان کو' جو اس کا دوست بھی تھا' کو بلوالیا تھا۔ عبید رضوی کی ریکارڈ کی ہوئی وزیر صاحب کی بیگم صاحبہ کی ساری گفتگو سن کر میجر سلمان کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔

"یہ وزیر مشیر کیا قانون کو کھلونا سمجھتے ہیں؟ جرم کرتے ہیں اور پھر جرم کو چھپانے کے لیے دوسرا جرم...... انہی کرپٹ سیاست دانوں نے ملک کو پوری دنیا میں بدنام کرکے رکھ دیا ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں عبید صاحب! آپ نے نہایت عقل مندی سے کام لیتے ہوئے ایک طرف تو کلیم صاحب کے لواحقین کی مالی مدد کی اور دوسری جانب مجرم کو بھی ثبوت سمیت ہمارے سامنے لے آئے۔" میجر سلمان نے تحسین آمیز انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے یار! کیا شرمندہ کرنے والی بات کررہے ہو؟ میرے سامنے اس طرح کھڑے مت ہوا کرو۔ ہم دوست بھی ہیں۔ میں نے تو صرف اپنا فرض ایمان داری سے ادا کیا ہے۔ اب تم اپنا فرض پورا کرو۔" اس نے میجر سلمان کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر ہوجائیں' مجرم اپنے جرم کی سزا پائے گا۔"

اگلے دن وزیر تعلیم اسد اللہ بھٹی کے صاحبزادے کی گرفتاری کی خبر تمام نیوز چینلز اور اخبارات میں ہیڈ لائنز اور بریکنگ نیوز کے ساتھ لگی۔ تفصیل کے مطابق وزیر تعلیم کے بیٹے نے نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے پہلے ایکسیڈنٹ کیا اور پھر جائے وقوع سے فرار ہوگیا۔ اس حادثے کی وجہ سے کلیم نامی ایک عمر رسیدہ شخص جاں بحق ہوگیا جو اپنے گھر کے واحد کفیل تھا۔ میجر سلمان کے پاس اتنے ٹھوس ثبوت تھے کہ عدالت میں اسد اللہ بھٹی کا وکیل دنگ رہ گیا اور پھر عدالت نے ٹھوس ثبوت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجرم کا ڈرائیونگ لائسنس ہمیشہ کے لیے منسوخ کردیا۔ اسد اللہ بھٹی نے کافی بھاگ دوڑ کرکے اور اپنے سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے اپنے بیٹے کو سخت سزا سے بچالیا پھر بھی عدالت نے وزیر کے بیٹے کو دو سال کی سزا سنائی۔ میڈیا نے خوب مرچ مسالا لگا کر اسد اللہ بھٹی کے ٹرائل کو ٹیلی ویژن پر دکھایا۔ میجر سلمان کو ہیرو کا لقب ملا۔ سب لوگوں نے عدالت کے شفاف فیصلے کو سراہا۔ عبید رضوی نے اخبار پڑھ کر تہہ کرکے میز کی دراز میں رکھ دیا۔

"یار عبید! مجھے ابھی تک سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کب یقین ہوا کہ ایکسیڈنٹ اسی لیموزین گاڑی سے ہوا ہے' جو اسد اللہ بھٹی کے پاس ہے۔" میجر سلمان نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ ایک بات تو طے تھی کہ اس شہر میں صرف دو سفید لیموزین ہیں لیکن ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ کسی دوسرے شہر سے آئی ہوئی سفید لیموزین گاڑی نے ایکسیڈنٹ کیا ہو اور راہِ فرار اختیار کرلی ہو۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن جب میں نے وزیر اسد اللہ کی بیگم سے سوالات کیے تو انہوں نے حسب روایات اپنی سیاسی پوزیشن کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں صرف معمول کی پوچھ گچھ کررہا تھا لیکن جب میں نے ان کی لیموزین چیک کرنے کے لیے چابی اگنیشن میں لگا کر گھمائی تو گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی ونڈ اسکرین کے وائپر بھی چلنے لگ گئے۔ جس شام ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس شام موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ ظاہر سی بات ہے گاڑی کے ونڈ اسکرین وائپر بھی چل رہے ہوں گے۔ ایکسیڈنٹ کے بعد مجرم گھبراہٹ کا شکار ہوگیا اور گاڑی اپنے بنگلے کے گیراج میں لاکر کھڑی کردی لیکن گھبراہٹ میں ونڈ اسکرین وائپر کا سوئچ آف کرنا بھول گیا اور یہ ہی بات اس کی پکڑ کا ذریعہ بن گئی۔ اس کے بعد تلاشی لینے پر ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے شراب کی بوتل بھی برآمد ہوگئی اور پھر منطقی بات ہے جو شخص آخری بار گاڑی چلا کر لایا تھا' اسی کی انگلیوں کے نشانات اسٹیئرنگ پر موجود ہونے تھے۔ اسی لیے میں نے فنگر پرنٹس لینے کا ڈرامہ کیا۔ وزیر کے صاحبزادے نے ایکسیڈنٹ کی خبر فوری طور پر اپنے ماں باپ کو دے دی ہوگی' جبھی والدین موصوف بیٹے کے جرم پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کررہے تھے لیکن یہ لوگ بھول گئے کہ ابھی فرض شناس لوگ محکمے میں موجود ہیں' ہر کوئی رشوت خور نہیں ہے۔ میں نے تو صرف وہ کام کیا ہے' جس کے لیے ہم نے حلف اٹھایا ہے۔"

"یار! تمہاری عقل ودانش مندی کی بدولت مجرم کو سزا بھی ملی اور کلیم صاحب کے لواحقین کو انصاف کے ساتھ ساتھ اتنی رقم بھی مل گئی کہ بے چاری دونوں بچیوں کی شادیاں بھی ہوجائیں گی' میں تمہیں سلیوٹ کرتا ہوں میرے عظیم دوست!" یہ کہتے ہی میجر سلمان نے کھڑے ہوئے عبید رضوی کو زور دار سلیوٹ مارا۔

☸

سفر ہدایت

محترم عمران بھائی!
آداب'

"سفرِ ہدایت" کے ساتھ حاضر ہوں۔ پہلے تو اپنی طویل غیر حاضری پر شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں مگر مجبوریاں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔

سفر ہدایت ایک کٹّر ہندو لڑکی کے مسلمان ہونے تک کی داستان ہے۔ کہانی میں رنگ آمیزی شامل ہے جب کہ اس کا تھیم سچ پر مبنی ہے۔ یہ میری مکمل اردو کہانی ہے۔ جس میں میں نے انتہائی محنت کر کے انگلش الفاظ سے دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ نجانے اب یہ اردو ادب پر پوری اترتی بھی ہے یا نہیں۔

مسلمان ہونا کوئی کمال کی بات نہیں نہ یہ بخشش کا ذریعہ ہے بلکہ مسلمان بننا اصل بات ہے اور یہی عمل اللہ کی بارگاہ میں محبوب ترین ہے۔ ہم لوگ عبادت اس طرح کرتے ہیں جیسے سر سے قرض اتار رہے ہوں۔ جب کہ اگر عبادت میں کیفیت شامل نہ ہو تو وہ عبادت ہی کیا؟ بالکل اسی طرح کہ جیسے کوئی اعلیٰ قسم کا پکوان تیار کیا جائے مگر نمک نہ ڈالا جائے۔ میری اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ اس کہانی کے ذریعے بہت سے لوگوں کو (مجھ سمیت) راہِ ہدایت پر چلنے اور زندگی کا مقصد پالینے کی ہمت اور طاقت عطا فرمائے اور مسلمانوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ آپ کی آراء کی منتظر۔

ناز سلوش نشے
میر پور آزاد کشمیر

یہ اس کشمیر جنت نظیر کی کہانی ہے کہ جس کے بارے میں ایک شاعر نے کیا خوب لکھا ہے کہ

کشمیر کو کہتے ہیں جنت نظیر
اور جنت کسی کافر کو ملی ہے نہ ملے گی

اسی کشمیر کی کہانی جس کے باشندے پچھلے 64 برسوں سے آزادی کے حق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ خدا نے انتھک محنت' لگن' سچا جذبہ اور بے انتہا صبر جوان کشمیریوں کی مٹی میں رکھا ہے وہ کم کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کی قوت ارادی نے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر دل آزاد ہو تو جسموں اور زمین کے قطعوں پر حکومت کر لینے سے کوئی حاکم نہیں بن جاتا اور جس نے آزاد ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

یہ کہانی ہے اس مقبوضہ کشمیر کی کہ جس کے سفید دودھیا پہاڑ نیلے آسمان کو چھوتے ہیں اور جہاں وہ آسمان کو چھوتے ہیں وہاں ایسا لگتا ہے کہ جیسے خدا نے جنت کا دروازہ کھول دیا ہو۔ بخدا پوری دنیا میں ایسا حسین نظارہ کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ طویل پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے اور نوکدار چوٹیوں پر سے جب موسم گرما میں برف پگھلتی ہے تو پانی جھرنوں اور دریاؤں کی صورت میں یوں کشمیر میں گردش کرنے لگتا ہے جیسے خون رگوں میں دوڑتا ہے اور جس طرح گردشِ خون زندگی اور شادابی کی علامت ہے بالکل اسی طرح یہ بہتے ہوئے جھرنے وادی کو اس قدر حسین بنا دیتے ہیں کہ بد بخت انڈیا کے منہ سے رال بہنے لگتی ہے اور وہ مزید کوششوں میں لگ جاتا ہے کاش کسی طرح اس جنت کے ٹکڑے کو حاصل کرے۔

جب پہاڑوں کے نشیب و فراز سے یہ پانی اچھلتے مچلتے بہتا ہے تو ٹکراؤ پر اس میں سورج کی کرنوں کے

سبب ستارے جھلملانے لگتے ہیں۔ گویا کسی نے آسمان کے تاروں کو توڑ کر ہمالیہ کے ان پانیوں میں بکھیر دیا ہو اور جب یہ جھلمل کرتا پانی وادی کشمیر کی گود میں بچھے ندی نالوں میں گردش کرتا ہے تو دیکھنے والے کو یوں گمان ہوتا ہے جیسے فرہاد نے دودھ کی نہریں کھود ڈالی ہوں اور ان نہروں' ندی نالوں اور دریاؤں کے کنارے بچھے سبز کچور گھاس کے قطعے یوں لگتے ہیں کہ جیسے قدرت نے زمرد کی کانوں سے سارا زمرد نکال کر نہایت نفاست سے جڑ دیا ہو۔

ایسے ہی ایک دریا "دریائے نیلم" کے کنارے کی یہ داستان ہے اور داستان بھی ایسی کہ جیسے کوئی بیچ دریا کے ایک پتھر پر بیٹھا مدھر سروں میں کویتا کہہ رہا ہو اور اس کویتا سے ارد گرد کا سارا ماحول خوب ناک ہو گیا ہو۔

جھرنا ایک ہندو گھرانے کی واحد بیٹی تھی اور ہندو گھرانہ بھی وہ کہ جن کے باپ دادا بھی کشمیر کو انڈیا بنانے کی ناکام کوشش میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور اب نئی نسل کے نمائندگان بھی اسی کوشش میں دن رات مصروف ہیں......!

جھرنا کے والد انڈین فوج میں ایک اعلیٰ عہدے دار اور چار بھائی اسی فوج میں بھرتی ہو کر دن رات ان معصوم کشمیریوں کی جانیں عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ جھرنا کا گھر اس وادی کشمیر میں تھا۔ باپ اور بھائیوں کے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ گھر سے نکلتی اور دریائے نیلم کے حسین کنارے ان پتھروں پر آ کر بیٹھ جاتی اور بھجن گانے لگتی۔ دریا میں ایک طرف جھکاؤ تھا۔ جہاں سے پانی دو حصوں میں بٹ جاتا پھر ذرا آگے جا کر دوبارہ سے آپس میں مل جاتا۔ اسی جھکاؤ میں ایک جگہ ایسی تھی کہ جہاں قدرتی طور پر پردہ پوشی کا نظام تھا۔ کشمیر کی نازک بالیاں جو مثلِ حور تھیں یہاں آتیں اور دریا کے پر لطف پانی سے غسل کر کے دوبارہ سے ان پہاڑی گھروں میں مقید ہو جاتیں یہ جگہ جھرنا کی بھی پسندیدہ تھی۔ سردی ہو یا گرمی وہ لازماً یہاں آتی اور تب تک بیٹھی رہتی جب تک کہ اس کا دل نہ بھر جائے۔ دریا کے اس کنارے بیچوں بیچ ایک چوڑا چپٹا پتھر تھا۔ جس پر وہ آ کر بیٹھ جاتی اور ان قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتی۔ اکثر وہ دیکھتی کہ اس سے کافی دور ایک نوجوان کشمیری لڑکا وہاں آتا۔ منہ ہاتھ دھوتا اور کچھ دیر ایک طرف منہ کر کے نہایت اطمینان سے کھڑا رہتا۔ درمیان میں وہ حرکت بھی کرتا۔ مگر اس کا دھیان کہیں بھی ٹوٹتا نہیں۔ پھر وہ اطمینان سے بیٹھتا اور آخر میں منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور ایک جانب چل پڑتا۔

بہت دفعہ جھرنا کے دل میں آیا کہ وہ اس نوجوان سے پوچھے کہ وہ ایسا کیا عمل کرتا ہے کہ جس سے اس کا دھیان نہیں بٹتا اور نہ اس کا اطمینان کم ہوتا ہے مگر جب تک وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی تب تک وہ لڑکا جا چکا ہوتا اور بہت دفعہ ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھی مگر پھر ہمت نہ کر سکی کہ آگے جائے اور اس اجنبی نوجوان سے بات کرے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ مٹکا لے کر دریا کی جانب گئی تا کہ دریا کا شفاف ٹھنڈا پانی اس میں بھر سکے۔ ابھی اسے دریا کنارے پہنچے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس نے دیکھا وہ نوجوان اپنی قمیص کی آستین چڑھاتا ہوا اسی جانب آ رہا ہے جھرنا کا دل ایک لمحے کو دھڑک کے رک سا گیا مگر وہ پھر بے نیازی سے پانی بھرنے لگی اور اپنا بھجن گانے لگی۔ لڑکے نے ایک پتھر پر بیٹھ کر پہلے اپنے ہاتھ دھوئے پھر کلی کی۔

جھرنا ترچھی نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگی مگر وہ تو خود میں اور اپنے کام میں اس قدر مگن تھا کہ لگتا تھا جیسے اس کے سوا اس جگہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔ پھر جھرنا نے دیکھا کہ لڑکے نے سر' کانوں اور گردن کے مسح کے بعد

اپنے پاؤں دھوئے اور اٹھ کر اپنی مخصوص جگہ جا کر کھڑا ہوگیا اور اپنے دھیان میں اس قدر مگن ہوا کہ اسے جھرنا کا بلند آواز میں بھجن بھی بے سکون نہ کر سکا جھرنا کو بے حد تعجب ہوا۔

''بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ میری اتنی اونچی آواز ہے اور پھر بھی اس کو سنائی نہیں دے رہی؟ کیا میں کوئی ماورائی مخلوق بن گئی ہوں۔ یا یہ لڑکا کسی اور دنیا کا ہے۔'' اس نے جیسے خود کلامی کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ مٹکے کو اس نے ایک طرف رکھا اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی لڑکے کی طرف بڑھی اور قریب جا کر اس کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ لڑکا نہ ہو کوئی بھوت ہو۔

''او' سنو! تم کون ہو؟'' جھرنا نے اس کے کان کے قریب تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ مگر لڑکا ٹس سے مس نہ ہوا۔

''سنتے بھی ہو یا اندھے اور بہرے ہو۔ پہلے میں تم کو نظر نہ آئی اور اب میری آواز سے تم یوں بے نیاز ہو جیسے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا ہو۔ سن رہے ہو میں تم سے مخاطب ہوں۔''

وہ کافی دیر تک آوازیں دیتی رہی مگر جب کوئی رد عمل نہیں ملا تو تھک کر قریب ہی بیٹھ گئی اور اس لڑکے کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

جب لڑکا فارغ ہو کر جانے لگا تو جھرنا نے اسے پھر سے آواز دی۔

''اے رکو......!''

لڑکا رک گیا اور مڑ کے حیرت سے جھرنا کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم سنتے بھی ہو؟'' وہ استہزائیہ ہنسی۔

''جی۔'' لڑکے نے مختصر جواب دیا اور اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''اچھا! میں اتنا اونچ اونچا بول رہی تھی تب تو تم نہیں سن رہے تھے۔'' زمین پر دباؤ ڈال کر اٹھتے ہوئے وہ پھر چوٹ کر گئی۔

''میں حالتِ نماز میں تھا اور جب میں نماز میں ہوں تو اپنا دھیان اسی جانب رکھتا ہوں تاکہ نماز ادا کرنے کا حق ادا کر سکوں۔''

اس کے عجیب سے جواب پر جھرنا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور حیرت سے بولی۔ ''تم مسلمان ہو؟''

''الحمد للہ! میں مسلمان ہوں۔'' لڑکے نے مسکرا کر جواب دیا۔ جواباً جھرنا نے ناپسندیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اچانک سے ہی نفرت کی لپٹیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''تم لوگ بہت خطرناک ہوتے ہو' انتہائی دھوکے باز' مکار اور فریبی' پتا جی کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ ادھر نہ ہوتے تو یہ جگہ ہماری ہوتی۔''

لڑکے کے چہرے پر پہلے مسکراہٹ رقصاں تھیں مگر اب کی بار اس نے جھرنا کی بات پر قہقہہ لگایا اور جی بھر کے محظوظ ہوا۔

''تم ہنسے کیوں میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ تم کو ہنسی آئے۔'' جھرنا ناراضگی سے بولی۔

لڑکا کچھ دیر ہنستا رہا پھر جا کر قریبی پتھر پر بیٹھ گیا اور نہایت اطمینان سے بولا۔

''مجھے ہنسی اس بات پر آئی ہے کہ تمہارے والد صاحب یعنی تمہارے پتا جی اس معاملے میں پریقین ہیں کہ یہ جگہ ان کی نہیں ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی اگر تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ خطہ ہمارا ہے تو تم لوگ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ ناحق معصوم لوگوں کا خون ان کی بددعائیں اپنے سر لیتے ہو ماؤں کو بے اولاد کرتے ہو اور ساتھ ہی اپنا سکون بھی برباد کرتے ہو۔ جاؤ اپنے کافرستان اور خود بھی سکون کی زندگی گزارو اور یہاں کے

باسیوں کو بھی چین کا سانس لینے دو۔'' وہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ جھرنا منہ کھولے اس کی باتیں سنتی رہی اور جب طلسم ٹوٹا تو کچھ نادم سی ہوئی کیونکہ وہ لڑکا اسے چلتا ہوا کافی دور جاتا دکھائی دیا۔

''میں بھی نا' کیا ہر ایک سے الجھ پڑتی ہوں۔ اب اگر کوئی مجھے اس مسلے کے ساتھ دیکھ لے تو میرا تو ڈھول ہی بج جائے گا۔ چلو جھرنا گھر چلو۔'' اس نے پانی سے بھرا مٹکا اٹھایا اور بھجن گاتی گھر کو لوٹ آئی۔

وہ گھر تو آ گئی مگر سارا وقت اس کے ذہن پر وہ لڑکا اور اس کی باتیں سوار رہیں۔ وہ لاکھ اپنا سر جھٹک کر اس کے خیال کو بھلانا چاہتی مگر بھلا نہ پاتی' رسوئی میں ماتا جی کھانا بنا رہی تھیں۔ اسے ابتداً برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں سنائی دیں مگر یک دم وہ آوازیں ایک آواز میں بدل گئیں۔ اس لڑکے کی آواز میں۔

''جاؤ اپنے کافرستان اور خود بھی سکون کی زندگی گزارو اور یہاں کے باسیوں کو بھی چین کا سانس لینے دو۔''

''تو کیا یہاں کے باسی ہم سے نالاں ہیں۔'' اس نے پہلی بار خود سے یہ سوال کیا۔

''پتا جی تو کہتے ہیں کہ وہ ادھر کے لوگوں کو سہولتیں دیتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کو نوکریاں دیتے ہیں۔ مگر...... مگر وہ لڑکا تو کہتا ہے کہ یہاں کے باسی بے سکون ہیں اف بھگوان یہ سب چکر کیا ہے۔''

وہ کھوئی کھوئی سی نگاہوں سے اپنے بستر پر لیٹی اپنے پتا جی اور لڑکے کی ابتدائی باتیں دہرانے لگی۔ ان کا موازنہ کرنے لگی مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ یہاں تک کے ماتا جی اسے بلانے اس کے کمرے تک آ گئیں۔

''جھرنا آ کے بھوجن کر لو۔ باؤ جی بھی آ گئے ہیں اور تجھے بلا رہے ہیں۔'' وہ اٹھی اور چپ چاپ کھانے کی میز تک آ گئی۔

''پرنام پتا جی...... پرنام باؤ جی۔'' اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا اور بھوجن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کیا بات ہے آج تو ہماری لاڈلی کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے ہیں۔ کیوں ماتا نے کچھ کہہ دیا کیا؟'' پردیپ کمار نے پہلا لقمہ لیتے ہوئے شرارت سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں پتا جی۔'' وہ ہنوز افسردگی میں رہی۔

''تو پھر؟ بھئی ہماری سونو چہکتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہے۔ ایسے چپ ہوتی ہو تو گھر ویران لگتا ہے۔'' باؤ جی نے اس کے سر پر چپت لگائی اور ہنستے ہوئے بولے مگر اس کا چہرہ ویسا ہی رہا۔

کچھ دیر وہ چاولوں کے ساتھ کھیلتی رہی پھر پتا جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''پتا جی! کیا کشمیری ہم سے نالاں ہیں۔''

پتا جی اور باؤ جی کو یک دم ہی کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

''کملی! یہ کیا الٹے سیدھے سوال کر رہی ہے۔ انہیں کھانا کھانے دے۔'' ماتا جی نے اسے گھرکا۔ مگر پردیپ کمار نے ہاتھ اٹھا کر انہیں چپ رہنے کا کہا اور بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ایسے ہی مجھے لگا کہ وہ ہم سے خفا ہیں۔ نالاں ہیں۔ ہم ان کی زمین پر ناحق قبضہ جو کیے بیٹھے ہیں۔''

پردیپ کمار کے شیطانی ذہن کو یک دم جھٹکا سا لگا۔ اس کی بیٹی اور اس طرح کی باتیں۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جھرنا یہ جو خطہ ہے نا یہ ہمارا ہے۔ ہماری دھرتی ماتا انڈیا کا حصہ ہے۔ مگر کوئی مانتا نہیں۔ دیکھو میں بتاتا ہوں۔ یہ برصغیر جو ہے نا پہلے پورے کا پورا ہندوستان تھا۔ یہ سب علاقے' یہ پاکستان سب ہمارا تھا۔ مگر ان مسلوں نے ہماری دھرتی ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے پھر کشمیر کو بھی آدھا کر دیا مگر اس حصے کا مسئلہ التوا میں پڑ

گیا۔ یہ حصہ ہمارا ہے۔ نہ کہ مسلوں کا۔" پردیپ کمار نے بیٹی کا ذہن صاف کرنا شروع کیا مگر جھرنا درمیان میں بول اٹھی۔

"اگر یہ ہمارا ہے تو بھارت ماتا کو ادھر سات لاکھ فوجی بٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ارے وہ تو ادھر کی سیکورٹی ہے تم اپنا دماغ ان باتوں میں ضائع مت کرو کھانا کھاؤ۔" باؤجی نے بات کو گول ہی کر دیا مگر جھرنا پھر بھی چپ نہ ہوئی۔

"اچھا! وہ سیکورٹی ہے تو پھر روز اتنے کشمیریوں کو مارا کیوں جاتا ہے؟"

"وہ اس لیے کہ وہ شر پسند ہیں اور دنیا کا قانون ہے کہ جہاں بھی عسکریت پسند دہشت گرد ہوں ان کو ختم کردو۔ بس اب مزید کوئی سوال نہ سنوں میں۔" پردیپ کمار نے لگا بندھا جواب دیا اور بات کو ایک طرح سے ختم ہی کر دیا۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ جھرنا کے ذہن میں الٹے سیدھے سوالات جنم لینے لگے۔ گویا اس لڑکے کی باتوں نے زلزلے کا کام کیا۔ برسوں سے بند ذہن میں سوچوں اور سوالوں کے در وا کر دیے۔

جھرنا نے وہ رات بہ مشکل گزاری اور صبح پتا جی اور باؤجی کے گھر سے نکلتے ہی وہ دریا کی طرف چلی گئی اور شدت سے اس مسلمان لڑکے کا انتظار کرنے لگی۔ آج اس کا دل بہت بے چین تھا۔ نہ اس کا جی بہتے ستاروں سے جھلمل کرتے پانی کی طرف لگا اور نہ سفید بادلوں نے اس کا دھیان اپنی طرف کیا۔ نہ چڑیوں کی چہکار نے اسے کویتا کہنے پر مجبور کیا اور نہ سبز قطعوں نے اس کو تقویت دی۔ رات کی بے سکونی کے باعث اس کی آنکھیں ابھی تک جل رہی تھیں۔ وقت گزاری کے لیے اس نے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر دریا میں پھینکنے شروع کر دیے۔ جب اس شغل میں اچھا خاصا وقت گزر گیا تو اسے وہ لڑکا ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ جھرنا نے اسے آواز دینی چاہی مگر رک گئی۔ لڑکے نے کل کی طرح اسے نظر انداز کیا اور پھر سے اپنا وہی عمل دہرانے لگا۔

جھرنا بہ مشکل ہی سہی مگر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کل لڑکے سے اس کی "نماز" کے متعلق کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

"آج ضرور پوچھوں گی۔" اس نے خود سے کہا۔

"اگر یہ اپنے ربّ کی عبادت کر رہا ہے تو ہماری پوجا میں اتنا سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کی نماز کتنی بے آواز ہے۔ جیسے پھولوں کی کلیاں چٹخ رہی ہوں۔ جب کہ ہماری پوجا ایسی کہ گھنٹوں گھنٹیوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑتا رہتا ہے اور اس کے آگے تو اس کا ربّ موجود بھی نہیں، نہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کتنے سکون سے کھڑا ہے۔ جب کہ میں تو بھگوان معاف کرے کالی ماتا کے سامنے جاتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ اس ڈر سے نہیں کہ میں ان کی پوجا بہت کم کرتی ہوں بلکہ اس ڈر سے کہ اکثر ان کے سامنے جا کر میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ اتنی بھیانک اور کالی کیوں ہیں؟ ایک خوف ناک بھگوان اتنی خوب صورت دنیا کس طرح تخلیق کر سکتا ہے؟ مجھے ڈر لگتا ہے اگر کسی دن انہوں نے میرے دل کی باتیں جان لیں تو مجھے شراپ ہی نہ دے دیں اور میں بھی انہی جیسی نہ بن جاؤں۔ انتہائی بھیانک اور خوف ناک مجھے تو لگتا ہے کہ ان کو کسی نے شراپ ہی دیا تھا۔ اے بھگوان معاف کریں رام...... رام......رام!"

انتظار کرتے کرتے وہ اپنے اور کالی ماتا کے تعلق تک جا پہنچی اور جب رام، رام کر کے چونکی تو لڑکا اتنی دیر میں فارغ ہو چکا تھا۔

"سنو! مجھے تم سے کوئی کام ہے۔" اس نے لڑکے کو

آواز دی۔ جو سر کی ٹوپی تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ رہا تھا۔

"تم ادھر ہی کے رہنے والے ہو؟"

"ظاہر ہے یہ میرا گھر ہے تو اپنے گھر میں ہی رہوں گا۔ البتہ تم لوگ دیارِ غیر میں کیوں رہ رہے ہو؟" لڑکے نے گزشتہ دن کی طرح مسکرا کر جواب دیا۔

جھرنا اس کے سوال پر تلملائی ضرور مگر ضبط کر گئی کل کا نتیجہ اس کے سامنے تھا۔

"میرا مطلب تھا میں اکثر تم کو ادھر دیکھتی ہوں نا اس لیے پوچھ لیا۔"

"تمہیں شاید کوئی کام تھا مجھ سے؟" لڑکے نے اسے یاد دلایا۔

جھرنا اس کے یاد دلانے پر ذرا بے چین سی ہوئی اور پھر بولی۔

"ہاں، کام تو تھا کیا تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھ سکتے ہو۔ میں نے کچھ جاننا ہے۔"

"اچھا۔" لڑکے نے کہا اور قریبی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟" لڑکے نے پوچھا۔

"میرا نام جھرنا ہے، جھرنا کمار۔ اور تمہارا۔؟"

"عبداللہ، تم کمانڈر پردیپ کمار کی بیٹی تو نہیں ہو؟" لڑکے کی بات پر وہ چونکی۔

"تم کیسے جانتے ہو پتا جی کو؟"

عبداللہ نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"سری نگر کا ایک ایک باشندہ ان سے واقف ہے۔ خیر تم بولو۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ عبداللہ کا مطلب کیا ہے؟" جھرنا فضول باتوں میں پڑنے کے بجائے مطلب کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"اللہ کا بندہ۔"

"اور اللہ کون ہے۔"

"اللہ وہ ذاتِ واحد ہے جس نے یہ پوری کائنات بنائی جو ہمارا ہم سب کا تمہارا میرا پروردگار ہے۔ وہ ہمارا خالق ہے۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"مگر ہمارا بھگوان تو کالی ماتا ہے۔ ماتا جی کہتی ہیں انہوں نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔" جھرنا الجھن زدہ سی بولی۔

"نعوذ باللہ۔ اللہ شرک سے پاک ہے۔ جو بھگوان اپنے ناک پر سے مکھی تک کو اڑا نہ سکے وہ پوری کائنات کیا بنائے گا۔ اللہ واحدہ لاشریک ہے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں۔"

"اچھا ہم اس موضوع پر کبھی تفصیلاً بات کریں گے۔ مجھے تم اپنی پوجا کا بتاؤ۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ تم بہت دھیان سے ایک جگہ کھڑے ہو جاتے ہو اور نہایت سکون سے اپنا عمل کرتے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے۔"

جھرنا نے اس کے پرنور چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے اگلی بات پوچھی۔

"پوجا نہیں ہم نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ دن میں پانچ مرتبہ ہم پر فرض ہے۔ یہ ایک جادونگری ہے۔ نیت کر لینے کے بعد بندے کا خود پر اختیار نہیں رہتا۔ بندہ سن سکتا ہے مگر اس کا کوئی ردعمل نہیں دے سکتا۔ بندہ دیکھ سکتا ہے مگر اس کی نگاہیں نیت کی پابند ہوتی ہیں۔ فضول میں آگے پیچھے نظریں نہیں بھٹکتیں۔ بندہ بول سکتا ہے بولنے کی طاقت اور ہمت رکھتا ہے مگر کلام پاک کے علاوہ اس کی زبان کسی اور بات کی اجازت نہیں دیتی۔ بندہ چلنے پر قدرت رکھتا ہے مگر حالتِ نماز میں اس کے پاؤں قبلہ رخ کی جانب پابند ہو جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ ہلانے کی سکت رکھتا ہے مگر نیت میں بندھے ہاتھ پابند ہوتے ہیں۔ الغرض کہ بندہ سر کے بال سے لے کر

پاؤں کے ناخن تک اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور جو اللہ کے سامنے ہو وہ بھلا ہیبت سے کیا حرکت کرے گا۔ وہ تو اس کے حکم کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک سلام نہ پھیرے۔

عبداللہ نے تفصیلاً جواب دیا۔ تو جھرنا پھر بولی۔

''مگر تمہارے چہرے پر اتنا سکون' اس کی وجہ؟''

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دلوں کا سکون میرے ذکر میں ہے اور جب ہم نماز ادا کرتے ہیں تو سوائے ذکر خدا کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جب ذکرِ خدا سے دل مطمئن اور پُر سکون ہو تو چہرہ کیوں بے سکون رہے گا؟''

''اچھا اور کل میں اونچی آواز میں بول رہی تھی مگر تمہارا دھیان نہیں بٹا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟'' جھرنا نے تجسس سے نیا سوال کیا۔ اسے اب اس لڑکے اور اس کی باتوں میں کشش سی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں نے کہا نا نیت' نیت کے بعد انسان چاہتے ہوئے بھی کہیں اور متوجہ نہیں ہو سکتا اور میں تمہیں ایک واقعہ بتاؤں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دورانِ جنگ ایک تیر آ کر لگا اور ایسا کہ آدھا ان کے جسم کے اندر اتر گیا۔ ہوش میں اس کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو صحابیؓ تڑپ اٹھے اور نہ نکالنے دیا۔ پھر جب وہ حالتِ نماز میں تھے تو لوگوں نے مشورہ کر کے وہ تیر ان کے جسم سے الگ کر دیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تب ان کو پتا چلا کہ ان کے جسم سے تیر نکالا جا چکا ہے۔'' عبداللہ نہایت انہماک سے اسے اسلام کے بارے میں بتانے لگا۔ اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ اس کے سامنے کوئی ہندو لڑکی موجود ہے۔ بلکہ جس قدر تجسس سے جھرنا اس سے سوالات کر رہی تھی۔ اس تجسس نے عبداللہ کو اور کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''کس قدر جادوئی سی بات ہے کہ اس شخص کو صرف اس لیے درد محسوس نہیں ہوا کہ وہ حالتِ نماز میں تھے۔ نہایت تعجب کی بات ہے۔'' جھرنا کی حیرانی دوچند تھی۔

عبداللہ نے جھرنا کی حیرانی پر ہلکا سا تبسم کیا اور بولا۔

''ایسا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے ایمان میں پکے ہوں۔ ایک کمزور ایمان والا شخص اتنے انہماک سے نماز ادا نہیں کر سکتا۔''

''تم بھی تو اپنی نماز میں گم ہو جاتے ہو' تو گویا تم بھی ایک مضبوط ایمان والے انسان ہو؟'' جھرنا نے بے ساختہ کہا۔

عبداللہ نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔

''میں ایمان کا پختہ انسان نہیں مگر کوشش کرتا ہوں اللہ کے تمام احکامات بجالاؤں اور اس کے عائد کردہ کسی فرض میں کوتاہی نہ کروں۔ زندگی بہت مختصر سی ہے۔ نجانے کب موت آ جائے اور اللہ نے ہر انسان کو کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ اس لیے انسان کو اپنی موت سے قبل اس مقصد کو جانچنا چاہیے تاکہ روزِ قیامت اپنے اللہ کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''

جھرنا عبداللہ کی ہر بات کو اس طرح سے سن رہی تھی جیسے دنیا میں فقط وہی دو ہوں اور عبداللہ کا کام بولنا اور جھرنا کا کام صرف سننا ہو۔ باقی سب کچھ ہیچ ہو۔ باقی سب کچھ پیچھے رہ گیا ہو۔

''تو کیا میری ذات کا بھی کچھ مقصد ہوگا؟'' جھرنا اس نئے انکشاف پر بے چین ہو گئی۔

''ہاں! ہر انسان کی پیدائش کا ایک یہی مقصد ہے اور وہ ہے اللہ ربّ العزت کی عبادت کچھ لوگ اس مقصد کو پا لیتے ہیں اور دن رات اللہ کو راضی کرتے ہیں اپنی جان مار دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ سب کچھ نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی مرتے دم تک انجان رہتے ہیں۔ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا۔ تم جانتی ہو اس کا مطلب؟'' اس نے درمیان میں

جھرنا سے پوچھا۔

''نہیں۔'' جھرنا نے نفی میں سر ہلایا۔

''یعنی دنیا میں موجود سب مخلوق سے افضل اور اعلیٰ ترین مخلوق انسان ہے۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہے۔ خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت صرف انسان میں ہے مگر بعض انسانوں نے ایسی حرکات بھی کیں کہ اپنے مقابلے میں جانوروں تک کو پیچھے چھوڑ گئے۔ میرے نزدیک تو ایک نیک اور اس خطاب کا حق دار وہی شخص ہے جو مخلوق خدا پر رحم کرے نہ کہ ان کو جانور سمجھ کر مظالم کی حدیں پار کر جائے۔''

عبداللہ کی باتوں کی سچائی نے جھرنا کی آنکھیں کھول دیں۔ کان اس کے عبداللہ کی طرف تھے جب کہ اس کے ذہن میں اور ہی سوچوں کا تانا بانا چل رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی ذات کی تخلیق کا مقصد کیا ہوگا؟ اللہ کی عبادت؟ مگر وہ تو مسلمان کرتے ہیں جب کہ میں تو ہندو ہوں۔ اف بھگوان' میں کس چکر میں پھنس گئی۔''

''مگر تم یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟'' عبداللہ نے اچانک سوال کر کے اس کا دھیان توڑ دیا۔

جھرنا یک دم اس سوال سے گھبرا گئی اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا جواب دے۔ پھر کافی دیر بعد بولی تو اس کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا۔

''میں اکثر تم کو ادھر نماز ادا کرتے دیکھتی تھی۔ مگر بے خبر تھی کہ تم کیا کرتے ہو۔ جب نماز کا جانا تو تجسس ہوا کہ مزید بھی جانوں تمہاری باتوں سے سچائی کی خوش بو آتی ہے اور جب تم بولتے ہو تو میرا دل کرتا ہے کہ بس بولتے رہو۔ سچ سننا اور اس کے بارے میں جاننا مجھے اچھا لگتا ہے۔''

''اسلام سچا مذہب ہے اور سب مذاہب سے افضل تر۔ ویسے تو سبھی مذاہب اللہ کی طرف سے ہیں مگر اللہ نے انسانوں کے لیے اس دین کو پسند فرمایا ہے۔ اسلام امن کا دین ہے۔ میں اگر تم کو اس کے متعلق بتانا شروع کروں تو عمر تمام ہو جائے۔'' عبداللہ کو ایک خوش گوار سا احساس ہوا کہ ایک ہندو لڑکی اسلام کی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس لیے وہ اسے مزید بتانے لگا۔

''مجھے تمہارا نماز ادا کرنا بہت اچھا لگا ہے کیا دنیا کے سبھی مسلمان نماز ادا کرتے ہیں؟''

''الحمدللہ سبھی مسلمان نماز ادا کرتے ہیں اور جو اس فریضہ سے محروم رہ جاتے ہیں ان کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہوں گی۔ ایسے لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو واقعتاً مجبوری میں نماز قضا کر دیتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو نام نہاد مسلمان ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی عام سے عذر کو بہانہ بنا کر نماز ادا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ مگر حقیقتاً وہ اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ روزِ قیامت سب سے پہلا سوال نماز کے متعلق ہی ہوگا اور میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ اگر تم سے نماز قضا ہو جائے تو یہ مت سوچو کہ تمہیں پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ بلکہ یہ سوچو کہ تم نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ اللہ تمہارا اپنے سامنے کھڑا ہونا بھی پسند نہیں فرماتا۔ سو جب انسان اس گناہ کے بارے میں جان لے تو اللہ سے معافی طلب کرے۔ بے شک وہ معاف فرمانے والا ہے۔'' عبداللہ نے جھرنا کی بات کا مکمل جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے کہیں جانا ہے تمہیں مزید اگر کچھ جاننا ہو تو پھر پوچھ لینا۔ مجھے ابھی کہیں جلدی پہنچنا ہے اور ہاں' اپنے باپ سے بچ کر رہنا۔ حقیقتاً وہ ایک درندہ ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ مجھے اچھا لگا کہ تم کو سچ پسند ہے۔ امید ہے آئندہ بھی تمہارے یہی خیالات ہوں گے۔ اللہ حافظ۔''

عبداللہ نے اپنی بات مکمل کی اور ایک طرف چل دیا۔ جھرنا اسے اس وقت تک جاتا دیکھتی رہی جب تک کہ وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

عبداللہ تو چلا گیا مگر اس کے ذہن میں سوچ کے نئے در وا کر گیا۔ اس کے اندر حق و باطل کی لڑائی ہونے لگی۔ وہ سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق تلاش کرنے لگی۔ اپنی زندگی کے مقصد پر غور و خوض کرنے لگی۔ اس کے شب و روز میں دن بدن تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اپنی مسلمان دوستوں سے وہ اسلام کے متعلق گفتگو کرتی اور چوری چھپے اسلامی کتب کا مطالعہ کرنے لگی۔

جوں جوں وہ مطالعہ کرتی جاتی اس کے اندر مزید کا تجسس پیدا ہوجاتا۔

دریا کنارے اب بھی وہ اسی طرح جاتی کیونکہ یہ وہ واحد جگہ تھی جہاں وہ بلا کسی روک ٹوک کے قدرت کے کرشموں پر غور کرتی۔

یہ وہ واحد جگہ تھی جہاں اس کی سوچیں ہر قید و بند سے آزاد ہوجاتیں وہ اپنے مذہب سے لاتعلق ہوجاتی اور ایک غیر جانب دار دماغ کے ساتھ وہ اسلام اور باقی مذاہب کا موازنہ کرتی۔

اسلام نے اس کے اندر سچ کی آگ کو بھڑکایا تھا۔ وہ گھنٹوں عبداللہ کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث کرتی اور تب تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتی جب تک اس معاملے میں اس کے دل کو تشفی نہ ہوجاتی۔ عبداللہ ہر ہفتے اسے کوئی نہ کوئی اسلامی کتب لا دیتا اور پھر اگلا پورا ہفتہ اسی کتاب کے متعلق ان کی بحث ہوتی۔

وہ ہر دفعہ نیا موضوع چنتی اور اس پر ایسے ایسے سوال پوچھتی کہ بعض اوقات عبداللہ بھی چکرا جاتا۔

جھرنا کی وجہ سے عبداللہ نے بھی مطالعہ کو روزانہ کا شیوہ بنالیا اور ایسی ایسی دلیلیں اور ثبوت لانے لگا کہ جھرنا کی پیاس کسی قدر بجھ ہی جاتی۔ جھرنا جانتی تھی کہ اگر اس کے والدین کو اور خاص کر بھائیوں کو اس بات کا علم ہوا کہ وہ اسلام کی طرف راغب ہے تو وہ ایک لمحہ نہیں لگائیں گے اور اسے اگلے جنم میں پہنچادیں گے سو وہ ہر طرح کی کوشش کرتی کہ اپنے سابقہ رویے کو برقرار رکھے اور گھر والوں کو اس بات کا شک نہ ہونے دے کہ وہ اسلام میں دلچسپی لے رہی ہے

دوسرا وہ اس بارے میں بھی خوش قسمت تھی کہ ابھی تک آزاد تھی۔ کسی کے ساتھ منسوب نہیں تھی۔ ورنہ اس کا منگیتر ضرور اس کے رستے کی رکاوٹ بنتا۔ جسے وہ کبھی پسند نہ کرتی۔

اسلام کے ساتھ ساتھ وہ کشمیر کے موجودہ حالات پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس کے بھائی اور پتا جی اکثر گھر میں اس مسئلے پر بہت کھلی گفتگو کرتے شاید وہ اس معاملے میں مطمئن تھے کہ ان کے گھر میں کوئی آستین کا سانپ نہیں۔

جھرنا بظاہر بے نیاز اور حقیقتاً بہت غور سے ان کی باتیں سنتی۔ جب اس نے کشمیر کے حالات میں دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے جانا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ بھارت بظاہر کشمیر میں امن پسندی کا نعرہ لگا رہا تھا۔ عالمی سلامتی کونسل میں "سب ٹھیک ہے" کا جملہ بول رہا تھا۔ مگر اندر سے اس کا کردار کتنا گھناؤنا تھا۔ اس کا اندازہ جھرنا کو اب ہوا تھا۔

روز کسی نہ کسی گھر میں کسی نوجوان لڑکی کی عزت تار تار کی جاتی نوجوان تو کیا۔ ہوس زدہ ہندو فوجی بوڑھی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ بلکہ برملا کہتے تھے کہ پرانی شراب کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔

روز اسکول جانے والی نوخیز لڑکیوں کے جسم تلاشی کے نام پر ٹٹولے جاتے اور روز پردہ دار لڑکیوں کے نقاب نوچ کر ان کی عزتوں کو پامال کیا جاتا۔ جب اس نے باہر نکل کر اس خوب صورت وادی کی کچھ تصاویر بنانی چاہیں تو اس کا کوئی ایک منظر بھی ایسا نہیں آیا۔ جس میں کوئی فوجی نہ کھڑا ہو۔ اس نے گھر سے نکل کر گلی کوچوں کا رخ کیا۔ تو زندگی کے بہت سے روپ اس کے سامنے

آئے۔ اس نے اب تک زندگی کو بہت خوب صورت ہی جانا تھا۔ مگر اس تجسس نے اس پر ایسے بھیانک در وا کیے کہ وہ لرز کر رہ گئی۔

اسے ایسے گھر بہت کم نظر آئے جو کہ سلامت ہوں۔ تیار کھیتیاں اس کو جلی ہوئی ملیں۔ عورتیں اور بچے اس کو ہندو فوجیوں کے مظالم کا شکار ملے۔ اکثر گلی کوچوں میں خون کے دھبے اسے یوں ملے جیسے کوئی بالٹیاں بھر بھر کے پانی پھینک رہا ہو۔ گھر تباہ حال آگ سے جلے ہوئے۔ لوگ ویران اور خشک آنکھیں لیے ملے کہ رو رو کر ان کے اندر کا پانی خشک ہوچلا تھا۔ بچے فقر و فاقے کے ہاتھوں لاچار ملے۔

یہ زندگی تھی۔ بھارت ماتا کے سرکرداؤں کی "سب ٹھیک ہے" والی زندگی۔ اس نے گھروں کے اندر جھانکا۔ لڑکیاں تار تار لباس لیے اپنی نیلام ہونے والی عزتوں کو کسی سرے سے جوڑتی نظر آئیں۔

شہیدوں کی مائیں اپنے نوجوان کی تصویروں کو گلے سے لگائے سسکتی ملیں۔

"یہ ہے زندگی۔" وہ کرب سے سوچتی۔ "اتنی حسین وادی کی اتنی بھیانک زندگی۔"

سوچتے سوچتے اس کا ذہن تھک جاتا اور آخر وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچی۔ وادی حسین اس لیے ہے کہ یہ اللہ نے بنائی ہے اور لوگوں کی زندگی اس قدر بھیانک اس لیے ہے کہ ان پر حکمرانی کرنے والے کالی ماتا کے پجاری ہیں۔ باطل ہمیشہ ظالم ہوتا ہے۔ ظالم خود پر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنے ماتحت پر بھی۔ کبھی وہ تنگ آ کر سوچتی کہ خودکشی کرلے یا جا کر ان ظالموں کو ختم کردے۔ مگر خودکشی وہ کر نہیں سکتی تھی کہ اس نے اسلامی کتب میں پڑھا تھا کہ خودکشی حرام ہے اور اس میں اتنی قدرت نہیں تھی کہ جا کر ان ظالموں کو ختم کرے۔ مگر وہ پھر بھی ایسے طریقے سوچتی کہ جس سے وہ ان مظلوموں کے لیے کچھ کرسکے۔

وہ اس کا اظہار عبداللہ کے سامنے بھی کرتی اور وہ ہر بار یہی کہتا ہے جب ضرورت ہوگی تب اسے بتا دیا جائے گا۔

ایک روز وہ پتھر پر بیٹھی اسے وضو کرنا دیکھتی رہی۔ جب عبداللہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے قمیص کی جیب سے قرآن کا ایک چھوٹا سا مترجم نسخہ نکالا۔

"آج میں تمہارے لیے سب کتابوں کی سردار کتاب لایا ہوں۔ یہ قرآن مقدس ہے۔ چوتھی اور آخری آسمانی کتاب اور سب کتابوں سے سچی کتاب۔ اس کا موضوع انسان ہے اور انسان سے متعلقہ اس میں تمام مسائل اور ان کا حل موجود ہے۔ یہ راہنما کتاب ہے۔ بالکل ایسے جیسے مشینری کو چلانے اور اس کی پیچیدگیوں کے متعلق ایک جامع کتابچہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ انسان کو زندگی گزارنے کے نشیب و فراز سے گزرنے میں مدد دیتی ہے۔ تم دنیا کا کوئی بھی موضوع لے لو۔ تمہیں اس کتاب میں ملے گا۔ یہ ذکر خدا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ تلاوتِ قرآن سے جو سکون دلوں کو ملتا ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ملتا۔" عبداللہ نے اسے قرآن سے متعلق بنیادی باتیں بتائیں۔

جھرنا نے باقی کتابوں کی طرح اس کے لیے بھی فوراً ہاتھ آگے بڑھائے مگر عبداللہ نے اسے قرآن کریم کا وہ مترجم نسخہ نہیں دیا بلکہ بولا۔

"تم اس کتاب کو اس وقت تک نہیں چھو سکتیں جب تک کہ باوضو نہ ہوجاؤ۔ کیونکہ قرآن کو صرف طہارت شدہ افراد ہی چھو سکتے ہیں۔" جھرنا کو ایک دم وہ ترجمہ یاد آ گیا۔ جو اس نے ایک چھوٹے کتابچے میں پڑھا۔ وضو کا ذکر آیا تو اس کے ہاتھ ایک نیا موضوع لگ گیا۔

"وضو کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟"

”دیکھو وضو طہارت کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ جب ہم پانچ مرتبہ دن میں وضو کرتے ہیں تو ہمارے جسم کا میل کچیل دھل کر صاف ہوجاتا ہے اور بدبو بھی نہیں آتی۔ میں تمہیں اس کی ایک سادہ مثال دیتا ہوں۔ جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کو دی تھی۔ اگر تم دن میں پانچ مرتبہ اس دریا میں غسل کرو تو کیا تمہارے جسم پر کوئی گندگی باقی رہے گی؟“ عبداللہ نے ہمیشہ کی طرح باتوں باتوں میں سوال کرڈالا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ جھرنا بے ساختہ بولی۔

”تو نماز بالکل ایسی ہی ہے۔ جب ہم دن میں پانچ مرتبہ تازہ وضو کرتے ہیں تو نہ صرف جسم کا میل صاف ہوجاتا ہے بلکہ ایک نماز سے دوسری نماز تک کے گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں۔ دوسرا وضو کرنے کا الگ ثواب ملتا ہے۔ جب تم اس قرآن کا مطالعہ کروگی اس کا ترجمہ پڑھوگی تو تم پر بات کا جواب ظاہر ہوجائے گا۔“

”اچھا تو تم مجھے وضو کرنے کا طریقہ بتادو۔ تاکہ میں باوضو ہوکر اس کتاب کو پڑھ سکوں۔ مگر پہلے میری ایک الجھن دور کردو۔ میں بت پرست ہوں۔ تو کیا تمہارا اللہ اس بات پر ناراض نہیں ہوگا کہ میں نے اس کی پاک کتاب کو ہاتھ میں پکڑا؟“

”نہیں بلکہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے باعث رحمت ہیں اسلام پوری دنیا کے انسانوں کے لیے پسندیدہ ترین دین ہے اور قرآن پوری دنیا کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اگر کوئی مشرک اس کتاب کو پکڑ کر اس کا مطالعہ نہیں کرے گا تو ہدایت کی راہ کیسے پائے گا؟“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے اس کی الجھن دور کی تو جھرنا نے سکون کا سانس لیا۔

”ہمارے ہاں تو برہمنوں کی مقدس کتاب کو کوئی شودر ہاتھ بھی لگا دے تو اس کو زندہ جلا دیتے ہیں اور اگر غلطی سے کسی کے کان میں ان کی مقدس کتاب کے الفاظ پڑ جائیں تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیتے ہیں۔“ جھرنا نے جھر جھری لے کر بتایا اور ساتھ ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”مگر یہ اسلام کتنا پر امن دین ہے کہ غیر مسلم کو بھی اجازت دیتا ہے کہ کھل کر اس کا مطالعہ کرے۔“

”حضرت بوعلی قلندرؒ کا قول ہے کہ یہ دنیا ایمان والوں کے لیے ایک قید خانہ ہے اور کفار کے لیے سکون کی جگہ۔ یہ اس لیے کہ ایمان والے کو علم ہے کہ مرنے کے بعد اس نے ایک بار اور زندہ ہونا ہے روزِ قیامت اور اپنی گزشتہ دنیاوی زندگی کا حساب کتاب دینا ہے۔ اس لیے وہ اپنی آخرت بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ جب کہ ایک کافر کا اس بات پر یقین ہے کہ یا تو مرنے کے بعد وہ دوبارہ زندہ ہوکر اسی دنیا میں آجائے گا اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا یا مرتے ہی وہ جنت میں جائے گا یا کچھ لوگوں کے خیال میں سرے سے موت ہے ہی نہیں اور کچھ کفار لوگ تو کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی ہے ہی نہیں جو کچھ ہے یہی زندگی ہے۔ جتنا عیش کرنا ہے اسی زندگی میں کرلو۔ یہ کفار کہتے ہیں کہ گھومو پھرو، عیش کرو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیا کی سیر کرو اور ان لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو گزر چکے ہیں۔ جنہوں نے احکامِ الٰہی کو پورا کیا وہ تو فلاح پاگئے اور جو منکر ہوئے وہ عذابِ الٰہی کا شکار ہوئے۔“

”اچھا مجھے ایک اور بات بتاؤ۔ ایک مجمع ہے جہاں دنیا کے ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگ اکٹھے ہیں مگر کسی کے ماتھے پر لکھا نہیں کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر۔ تو ان کی پہچان کس طرح ہوگی؟“ جھرنا نے عبداللہ کو لاجواب کرنے کے لیے ایک عجیب سا سوال کرڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ عبداللہ اس بات کا جواب نہیں دے سکے گا۔

عبداللہ کچھ دیر سوچ میں گم رہا جیسے الجھی ڈور کا سرا تلاش کرسکے اور پھر واقعی اس نے سرا تلاش کرلیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جھرنا کی طرف دیکھا اور بولا۔

”مسلمان کے جسم کی خوش بو سے۔ ایک مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ اس کے جسم سے خوش آتی ہے اور اگر خوش بو نہ بھی آئے تو ایک مہک سی ہوگی۔ اتنی ہلکی سی کہ اسے خوش بو تو نہیں کہا جاسکے گا۔ مگر وہ بدبو بھی ہرگز نہیں ہوگی۔ جب کہ ایک مشرک اور کافر کے جسم سے ایک مخصوص بدبو آئے گی۔ ایک سادہ سی مثال تم کو دیتا ہوں۔ تم لوگ روزانہ صبح پوجا سے قبل اشنان کرتے ہو۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پھر سے تمہارے جسموں سے بدبو اٹھنے لگتی ہے اور پھر تم لوگ خوش بوؤں کا سہارا لیتے ہو۔ مگر ایک مسلمان اگر ایک ہفتے بعد بھی غسل کرے تب بھی اس کے جسم سے کوئی بدبو نہیں آئے گی۔ جانتی ہو وجہ کیا ہے؟“

”نہیں۔“ جھرنا سے مارے تجسس کے بولا ہی نہیں گیا۔ اس نے اپنے تئیں بہت مشکل سوال کیا تھا۔ مگر عبداللہ نے اس کا جواب بھی ڈھونڈ نکالا تھا۔

”وجہ صرف اتنی ہے مسلمان کلمہ گو ہے اور جو کوئی کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے اس کا جسم یوں پاک ہوجاتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہو۔ یہ ساری خوش بو مسلمان کی نہیں۔ نہ اس میں مسلمان کا اپنا کچھ کمال ہے۔ بلکہ یہ سارا معجزہ کلمہ طیبہ کا ہے۔ یہ ساری خوش بو کلمہ طیبہ کی ہے۔ نہیں یقین تو آزما کے دیکھ لو۔ ثبوت تمہیں خود مل جائے گا۔“ عبداللہ اتنے دعوے سے بولا کہ جھرنا نے بے اختیار اپنی کلائی کو سونگھا۔ اچانک اس کا منہ بن گیا۔ واقعی اس کے جسم سے ایک بساندی محسوس ہورہی تھی۔ اب اس نے اٹھ کر عبداللہ کا وجود سونگھا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہاں واقعی ایک مہک سی تھی۔

وہ بے اختیار عبداللہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”عبداللہ آج میں اس سچے مذہب اور اس سچے ربّ پر ایمان لے آئی ہوں۔ مجھے بھی مسلمان کردو عبداللہ۔ مجھے بھی کلمہ پڑھادو تاکہ روزِ قیامت میں بھی اس سچے ربّ کے سامنے سرخرو ہوجاؤں۔ اس سے قبل کہ مجھے موت آجائے۔ مجھے میری ذات کا مقصد پورا کرلینے کا موقع دے دو۔“

وہ باقاعدہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر گڑگڑانے لگی۔ اسلام کی سچائی نے اس کی ذات میں ایسی لگن پیدا کردی کہ وہ اردگرد سے بے پروا ہوگئی۔

عبداللہ جھرنا کے اس اقرار پر بے حد مسرور ہوا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ اٹھا اور فوراً سجدے میں گرگیا اور اللہ کا شکر بجالایا کہ اس نے اس کی ذات کو کسی کے لیے راہِ ہدایت کا ذریعہ بنایا۔

سجدہ شکر کے بعد وہ اٹھا اور جھرنا کو وضو کا طریقہ سکھایا۔ پھر دونوں قبلہ رو بیٹھے۔

”کیا تم بغیر کسی دباؤ کے سچے دل کے ساتھ اسلام قبول کرنا چاہتی ہو؟“ عبداللہ نے ایک دفعہ پھر تصدیق کرلینی چاہی۔

”ہاں! میں سچے ربّ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں اپنی خوشی سے اسلام قبول کررہی ہوں۔“

”تو پھر پڑھو ”لا اله الا لله محمد رسول الله“ کوئی معبود نہیں مگر سوائے اللہ کے محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔“

عبداللہ نے لفظ لفظ کرکے اسے کلمہ پڑھایا۔

جھرنا لفظ لفظ کرکے کلمہ پڑھتی رہی۔

دونوں ہی کی آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔

دونوں ہی کے چہرے خوشی سے جگمگا رہے تھے۔ دونوں ہی مطمئن تھے۔

”مبارک ہو۔ اب تمہارا نام جھرنا کمار نہیں بلکہ

عائشہ ہے۔ الحمدللہ اب تم مسلمان ہو اور میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمہاری موت ایمان کی حالت میں ہی ہو اور خدا تمہیں سچا اور کھرا مسلمان بنا دے آمین۔ کیونکہ مسلمان تو بہت ہیں مسلمان تو پیدائشی بھی ہوتے ہیں مگر مسلمان ہونے سے مسلمان بننا زیادہ مشکل کام ہے۔ حلال اور حرام میں تمیز ہی مسلمانوں کا شیوہ ہے۔''

''عائشہ......!'' عائشہ جو کہ سابقہ جھرنا تھی نے زیر لب اپنا نام دہرایا۔ اسے بہت خوش گواریت کا احساس ہوا۔

اسے لگا کہ وادی کا حسن اس کے کلمہ پڑھنے پر مزید نکھر گیا ہو۔ پرندے اس کے مسلمان ہو جانے پر خوشی سے چہچہاتے پھر رہے ہوں۔ پہاڑوں پر سے بہت سے جھرنے اسے مبارک باد دے رہے ہوں۔ کلیاں چٹخ رہی ہوں۔ دریا کی موجیں کنارے سے سر پٹخ پٹخ کر کہہ رہی ہوں کہ آج تم نے ہم سے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ خدا تمہیں بلند درجات دے۔

مسلمان ہونے کی خوشی نے اسے انتہائی مسرور تو کر دیا مگر وہ یک دم چونکی یہ بات تو اس نے پہلے سوچی ہی نہیں تھی۔

''عبداللہ! الحمدللہ اب میں مسلمان ہوں۔ مگر میرے گھر والے ہندو ہیں۔ مشرک ہیں میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے اور اگر انہیں اس بات کا علم ہو گیا تو وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور پھر اگر میں اس گھر میں جاتی ہوں تو مجھے انہی کے طرزِ زندگی پر چلنا ہوگا اور نعوذ باللہ مسلمان ہونے سے قبل جو میں شرک کرتی رہی ہوں۔ وہ اب میں ہرگز نہیں کر سکتی۔ خدا میری سابقہ زندگی معاف فرمائے۔ میں اس گھر میں واپس نہیں جانا چاہتی۔''

عائشہ نے اپنی الجھن کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔

مگر عبداللہ نے اس کا حل بھی سوچا ہوا تھا۔ سو مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم فکر مت کرو۔ چند ایک دن اسی گھر میں گزار لو۔ مجبوری ہے اور کھانے پینے کا حرج بھی نہیں۔ بس تم کوشش کرنا کہ شرک نہ کرو۔ میں جلد ہی تمہیں وہاں سے نکال کے لے جاؤں گا۔''

عائشہ چونکی۔ ''کہاں۔''

''پاکستان تین دن بعد ادھر بھارت سے اسلحہ کی ایک بڑی کھیپ پہنچتی ہے۔ بس مجھے اس کا انتظار ہے تم مجھے پرسوں ملنا۔ میں تمہیں آگے کے معاملات سمجھا دوں گا۔'' عبداللہ نے اسے تسلی دی۔

''تم کہیں اس کھیپ کی بات تو نہیں کر رہے جو لداخ کے راستے سے آتی ہے۔''

جھرنا کو یک دم ہی اپنے پتاجی کی وہ باتیں یاد آ گئیں جو وہ گزشتہ شب باؤجی کے ساتھ کر رہے تھے۔ ان میں بھی کسی اسلحے کی کھیپ کا ہی تذکرہ تھا۔

''ہاں' کیا تم جانتی ہو اس بارے میں۔'' عبداللہ نے چونک کر اس سے دریافت کیا۔

''بالکل' پتاجی اور باؤجی کل رات ہی اسی متعلق بات کر رہے تھے؟ جانتے ہو وہ کھیپ کدھر پہنچے گی؟''

''نہیں آج میں نے یہی پتا کرنے جانا ہے۔'' عبداللہ نے بے چینی سے بولا۔

''چلو اس کارِ خیر میں میرا حصہ بھی قبول کر لو۔ میں جگہ بتا دیتی ہوں۔'' عائشہ نے کہا اور زمین پر نقشہ بنا کر اسے اس خفیہ اڈے کا پتا بتا دیا۔ جو اب تک عبداللہ کے گروہ سے پوشیدہ تھا۔

''اللہ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔ تمہاری وجہ سے لاکھوں کشمیری بچ جائیں گے۔'' عبداللہ فرطِ خوشی سے بولا اور پھر اٹھتے ہوئے کہا۔

''پرسوں سہ پہر تین بجے مجھے تم ادھر ملنا اور اس

دوران تم اپنی کوئی چھوٹی موٹی تیاری کر لینا۔ خاص طور پر گرم کپڑے۔ مگر اس طرح کہ گھر والوں کی نظروں میں نہ آؤ۔ میں پرسوں تم کو بتا دوں گا کہ رات کو کب نکلنا ہے۔''

عائشہ بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کے لیے پلٹی مگر پھر رک گئی۔ ایک اور الجھن اس کے سر پر سوار ہوگئی۔

''عبداللہ پاکستان جا کر میں کہاں رہوں گی؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

عبداللہ اس کی فکر پر مسکرا دیا۔

''میرے ساتھ تم اب نو مسلم ہو اور یقیناً اب تمہاری شادی کسی مسلمان سے ہی ہونی ہے۔ تو میں نے سوچا یہ کارِ خیر میں ہی کیوں نہ انجام دے لوں۔ فکر کی ضرورت نہیں کشمیر کی سرحد پار کرنے سے قبل ہم دونوں رشتہ ازدواج میں بندھ چکے ہوں گے۔'' عائشہ نے اطمینان سے سر ہلایا۔

''اور ہاں تم اس بارے میں بھی پریشان ہونا چھوڑ دو کہ تمہاری پچھلی زندگی پر تم کو پکڑ ہوگی۔ جب کوئی مشرک مسلمان ہوتا ہے تو بالکل نومولود بچے کی طرح گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس کی پچھلی زندگی کا باب مٹا دیا جاتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ بس اس کوشش میں رہنا کہ اپنے ایمان کو بچائے رکھو کیونکہ زندگی میں آگے چل کر تمہیں ایسے ایسے واقعات دیکھنے کو ملیں گے کہ تمہارا ایمان چکرا کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر تم ثابت قدم رہیں تو اللہ کا ایسے لوگوں کے لیے وعدہ ہے کہ وہ انہیں جنت کا انعام دے گا۔'' عبداللہ نے اپنی بات پوری کی تو وہ مطمئن سی گھر کو لوٹ آئی۔

اور پھر اگلے دو دن اس نے اپنی چھوٹی موٹی چیزیں جمع کرنے میں لگائے۔

اسے گھر چھوڑنے کا دکھ نہیں تھا بس دکھ تھا تو اتنا کہ اس کے گھر والے مشرک ہی مر جائیں گے۔ اسے اپنے گھر والوں سے محبت تھی۔ مگر اسلام کے بعد اسے لگا جیسے اس کے اور ان کے درمیان کوئی دیوار سی حائل ہو گئی ہو۔ دو دن اس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ بھرپور خوشی میں گزارے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ دن اسے پھر مرتے دم تک نصیب نہیں ہوں گے۔ نہ اسے پھر اپنے بھائیوں کا پیار ملنا ہے۔ نہ ماں کی ممتا گو کہ وہ کافر تھے مگر اس کی اور ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون ایک تھا۔ یہ اس کی فطری محبت تھی جسے چاہ کر بھی وہ نفرت میں نہیں بدل سکتی تھی۔

دو دن بعد وہ ٹھیک سہ پہر تین بجے عبداللہ سے ملی عبداللہ نے اس سے کچھ ضروری باتیں کیں اور اسے رات بارہ بجے گھر کے پچھلے دروازے کی جانب آنے کو کہا۔

رات تک کا وقت اس نے بہت مشکل سے گزارا۔ ہر لمحہ اسے یوں لگتا جیسے ابھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔

ایک دفعہ اس کا دل چاہا کہ وہ گھر والوں کے لیے کوئی خط لکھ دے مگر پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ خط اس کی راہ کی رکاوٹ نہ بنے اس نے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔

رات کھانے کے بعد سبھی روزانہ کے معمول کے مطابق اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔ صرف وہی تھی جو دھڑکتے دل کے ساتھ جاگ رہی تھی۔ بارہ بجے سے کچھ دیر قبل وہ اٹھی اور باورچی خانے کے خفیہ دروازے کے ذریعے وہ گھر کے پچھلے حصے کی طرف آئی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا اور ایسے میں اسے صرف اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ مگر وہ بھی ایسی لگ رہی تھی کہ جیسے اندر کہیں دھماکے ہو رہے ہوں۔ پورے بارہ بجے قریب ہی سے الو کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے خفیہ چابی سے دروازہ کھولا اور

بغیر کسی دقت کے باہر آ گئی اسے باہر نکلتے ہی یوں لگا کہ جیسے وہ کسی دوزخ سے باہر آئی ہو۔

چند لمحوں میں عبداللہ بھی پہنچ گیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر جلدی جلدی چلنے لگا۔

کافی آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑا اور ایک گھر کا دروازہ بجایا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہوئے ایک کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ عبداللہ اسے لے کر وہیں چلا گیا۔

کمرے میں چند افراد تھے۔ جو شکل سے ہی افرادِ خانہ لگ رہے تھے۔

”السلام علیکم!“ ایک بزرگ نے سلام میں پہل کی اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک عورت جا کر کشمیری چائے لے آئی اور ساتھ میں خشک میوہ جات۔ بزرگ نے دونوں کی مرضی معلوم کی اور ان کا نکاح پڑھا دیا۔

نکاح کے بعد گھر کی ایک عورت نے ایک سرخ چادر اسے اوڑھا دی۔

”ہماری جانب سے یہ نکاح کا تحفہ قبول کرو۔ یہ میں نے اپنی بیٹی کے لیے رکھی تھی مگر ان ظالم فوجیوں نے اس کی عزت لوٹ لی۔ میری بیٹی نے غم سے خود کشی کر لی......!“ عورت بات کرتے کرتے رو پڑی۔

عائشہ کو دلی دکھ ہوا۔

”میں بھی آپ کی بیٹی ہی ہوں۔ ان شاء اللہ اس کے مجرم اپنے کیفرِ کردار تک ضرور پہنچیں گے۔“ عائشہ نے ان خاتون کو گلے لگا کر تسلی دی۔

”خدا تمہیں سہاگن رکھے اور خیریت سے سرحد پار کرا دے آمین۔“

وہ دونوں اس گھر سے ہزاروں دعاؤں کے سائے تلے نکلے تو آگے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ وہ لوگ تین گھنٹے مسلسل سفر کرتے رہے۔ ایک جگہ گاڑی نے ان کو اتار دیا۔ آگے کا سفر پیدل تھا۔ وہ چلتے رہے رستے میں بہت سی چوکیوں پر وہ لوگ رکے بھی۔ مگر خیریت رہی عائشہ کو لگا جیسے ان میں سے اکثر لوگ عبداللہ کے جاننے والے ہوں۔

صبح صادق کے قریب انہوں نے ایک گہرے کھڈ کو عبور کیا تو سامنے خاردار تاریں تھیں۔

”بس ان کے پار پاکستان ہے۔ بلا خوف و خطر چلو۔“ عبداللہ نے ایک عزم سے کہا اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔

”میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔“ عائشہ تکلیف سے رو دی۔

”بس تھوڑی سی ہمت اور بس باڑھ کے پار ہمیں ہمارے بندے لینے کے لیے کھڑے ہوں گے۔“ اس نے اسے تسلی دی۔

دونوں نے مشکل سے ہی سہی وہ تاریں پار کیں۔ تھوڑا سا آگے گئے تو درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے ایک گاڑی نکلی۔ عبداللہ گاڑی کو پہچان کر آگے بڑھا۔

پھر اگلے چار گھنٹوں کے اندر وہ لوگ آزاد کشمیر میر پور میں موجود تھے۔

”عبداللہ میرے گھر والوں کی کچھ خیر خبر ہے؟“ یہ ایک ہفتے بعد کی بات ہے جب وہ دونوں رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو عائشہ نے اس نے پوچھا۔

”ہاں سب خبر ہے۔ صبح تمہیں گھر میں موجود نہ پا کر گھر والوں کے ہوش اڑ گئے۔ ادھر تمہارے والد کو دوسری خبر اس کھیپ میں آگ لگ جانے کی ملی۔ وہ تو جیسے پاگل ہو گئے۔ تمہیں بہت ڈھونڈا اور ساتھ ہی اس کھیپ کو آگ لگانے والوں کو بھی مگر دونوں ہی ان کے ہاتھ نہیں آئے۔ کیونکہ ہم دونوں ہی سرحد پار کر چکے تھے۔

تمہارے دو بھائیوں نے غصے میں آ کر مسلمانوں پر تشدد شروع کر دیا۔ انہی میں ایک گھرانہ عارفہ کا تھا۔ جو تمہاری دوست بھی تھی۔ دونوں نے اس کی عصمت دری کی اور پھر اس کو برہنہ کر کے چوک میں لے گئے اور گولیوں سے اس کا سینہ چھلنی کر دیا۔“

عائشہ نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

”یا اللہ! وہ میری وجہ سے شہید ہوئی اسے بخش دے مولا۔“

”پھر......!“

”دو دن بے چارے معصوم لوگوں کی جان پر بنی رہی۔ ادھر ہمارے ساتھی ان بھارتی فوجیوں کے ٹھکانوں پر حملے کرتے رہے۔ تمہارے لیے ایک بری خبر بھی ہے۔ انہی دھماکوں میں تمہارا ایک بھائی مارا گیا۔ باقی جن دو نے عارفہ کو بے حرمت کیا تھا۔ ان کو میرے ساتھی عامر نے قتل کر دیا۔ کیونکہ عارفہ اس کی منکوحہ تھی اور جس طرح اس کی بے حرمتی ہوئی اس کے بعد وہاں کے مسلمانوں میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

تمہارا تیسرے نمبر والا بھائی زندہ ہے۔ مگر مکمل نہیں کیونکہ اسے ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں اور اب وہ معذوری کی حالت میں اسپتال میں داخل ہے۔ ادھر مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارے پتا جی تمہیں ہر وقت کوستے ہیں۔ بقول ان کے تمہارا گھر سے نکلنا ان کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے۔ دوسرا وہ ہر وقت پاگل کتے کی مانند چکر لگاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ تین بیٹوں کی چتا کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے آگ لگائی تھی۔“

عبداللہ نے اسے تفصیل سے بتایا اور ایک گہرا سانس لے کر سر جھکا لیا۔

عائشہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ رہی تھی۔ اس کا دل عارفہ کے لیے نوحہ کر رہا تھا۔ اس کی برہنگی کے تصور سے ہی اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ کہاں وہ لڑکی کہ جو کسی کو اپنا ہاتھ تک نہ دکھاتی تھی اور کہاں اس کی برہنہ لاش......!

”بھائیوں کے ساتھ جو ہوا وہ اسی عمل کے حق دار تھے۔ مگر میری ماتا جی؟“ اس نے نہایت کرب سے پوچھا۔

”ہاں! پورے گھرانے میں ایک وہی ہیں جو کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہیں معاف کیا اور تم لوٹ آؤ مگر تمہارے پتا جی اور بھائی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر تم وہاں واپس گئیں تو وہ پہلے تمہاری ماتا جی کو گولی ماریں گے اور پھر تمہیں۔“ عائشہ نے سر جھٹکا اور آنسو پونچھ کر برتن سمیٹنے لگی۔ وہ اگر گھر سے نکلی تھی تو اسی ارادے سے کہ واپس نہیں جائے گی۔ ماں کے لیے اس نے صبر کر لیا اور پھر وہ واقعی دوبارہ مقبوضہ کشمیر نہیں گئی۔

آج ماشاءاللہ سے اس کے دو بچے ہیں۔ وہ خود ماں بن چکی ہے۔ مگر آج بھی وہ اپنی ماں کو یاد کرتی ہے۔

ان دریاؤں کو گھاس کے میدانوں کو سفید برف پوش چوٹیوں کو ان جھرنوں کو وہ آج بھی اپنے خوابوں میں دیکھتی ہے۔ جو اس کے چلے جانے پر غمگین تو ہیں مگر خوش بھی کہ اس نے اس کشمیر جنت نظیر میں رہنے کا حق ادا کر دیا۔

اپنا جال

وہ پلے بوائے کے طور پر مشہور تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی عورت اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔ ایک روز یہی وجاہت اس کے لیے جان لیوا بن گئی۔

نفرت اور انتقام سے گندھی کہانی جس کا انجام آپ کو چونکا دے گا۔

میں نے اپنے سر پر گھنے بالوں کی وگ احتیاط اور نفاست سے جمائی اور آئینے میں دیکھا۔ نیلی آنکھیں سبز لینز کے نیچے چھپ گئی تھیں۔ مکمل طور پر تبدیل شدہ میک اپ، گہرے سیاہ کاجل اور ہلکی زرد لپ اسٹک نے میرے نقوش کو مختلف کر دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں چند لمحوں تک خود کو بھی پہچان نہ سکی۔ آنکھوں پر بڑے بڑے سیاہ شیشوں کی عینک لگانے کے بعد تو یقیناً وہ مجھے نہ پہچان سکے گا۔ میں نے اطمینان سے رہائشی بلڈنگ کے عقبی زینے کے پاس بنے ویران ٹوائلٹ کا دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔ اصل امتحان تو اس کے سامنے جا کر ہی ہوگا۔

اس کے فلیٹ کے غیر مقفل ہونے کا مجھے پورا یقین تھا۔ کیونکہ حاصل کردہ معلومات کے مطابق صفائی کرنے والی خادمہ کے فلیٹ میں داخلے کے لیے علی الصبح دروازہ کھول دیا کرتا تھا اور خود کسی نہ کسی کام میں مشغول ہو جایا کرتا تھا۔ خادمہ کچرا وغیرہ باہر پھینکنے کے لیے جایا کرتی تھی۔ ملازمہ صفائی کر کے فارغ ہوتی تو شاید اپنی یوگا کی ورزش چھوڑ کر بیرونی دروازہ لاک کر لیا کرتا تھا۔

اس وقت صبح کے دس بجے کا عمل تھا۔ چنانچہ میں نے اس اطمینان اور سکون کے ساتھ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے شاید بستر پر ریشمی گاؤن پہنے نیم دراز تھا اس کے ہاتھوں میں ایک کتاب تھی جس کے ٹائٹل کی جھلک سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یوگا کی ورزش کا مطالعہ کرنے میں منہمک ہے۔ قدموں کی خفیف سی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ میرے قدم سست روی سے آگے بڑھنے لگے۔ خادمہ میرے اندر داخل ہونے سے پہلے نکل کر واپس جا چکی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پہلے ردعمل کے طور پر اس کے وجیہہ چہرے پر حیرت و تعجب کے تاثرات ابھرے اور وہ بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے آپ غلطی سے اس اپارٹمنٹ میں چلی آئی ہیں خاتون!" وہ پُرکشش اور صنف نازک کو متاثر کرنے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولا۔ اس کی اپنی عادتوں اور دل پھینک حرکتوں کی وجہ سے اس سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔

میں نے اپنی نفرت کو مصلحت کے دبیز پردے میں چھپا کر مصنوعی خوش دلی سے ایک والہانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجالی اور اس کے کسرتی، مضبوط اور اسمارٹ وجود کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کیفیت کو بھانپ کر شاید مسرور ہوا اور آگے بڑھا۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا نہیں۔" وہ کنپٹی کھجاتا ہوا بستر سے چند قدم آگے چل کر رک گیا۔ اب اس کی ہوس ناک نگاہیں میرے پُرکشش سراپا پر پھسل پھسل رہی تھیں۔ میں نے اس کی دل فریب محویت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"جناب! میں غلط اپارٹمنٹ میں نہیں آئی۔" قدرے تاخیر اور بشاشت سے مسکراتے ہوئے میں نے بھاری لہجے میں شاہد کو جواب دیا۔ جس کی ادائیگی کی مشق میں کافی دنوں سے کرتی چلی آئی تھی۔ "دراصل جناب! میں اپنی فرم کی جانب سے گھر گھر جا کر آرائشی مصنوعات ڈسکاؤنٹ پر فروخت کرنے پر مامور ہوں۔" میں نے بتایا۔ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کے رہ گیا۔

"لیکن مجھے ایسی مصنوعات کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"کوئی بات نہیں! میں آپ کو نمونے کے طور پر چند اشیاء دے دیتی ہوں۔ آپ انہیں استعمال کر کے دیکھیں اس فلیٹ کی خوب صورتی اور آرائش میں دل کش اضافہ ہو جائے گا۔ قیمت بعد میں موصول ہو جائے گی۔"

بعض افراد کو میں نے اس طریقے پر قائل کر لیا تھا۔ میں نے شستہ لہجے میں با اخلاق مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر جھک کر اپنا سیاہ بیگ کھول ڈالا۔ وہ تھوڑے فاصلے پر حیرت و استعجاب سے کھڑا مسکراتا رہا۔ مجھے اس کے ہر انداز سے نفرت ہو چکی تھی کیونکہ وہ اپنی دانست میں ایک اجنبی خاتون کو گھائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

میرے دستانے پہنے ہاتھوں نے اچانک آرائشی اشیاء کے بیچ سے ایک سیاہ ریوالور نکال لیا، دستانے سکن کلر کے تھے۔ وہ اس طرح کھڑے کھڑے حیرت واستعجاب اور خوف سے ساکت رہ گیا۔ اس کی بڑی بڑی مخمور سیاہ آنکھیں ابل پڑیں۔ ننھے سے ریوالور کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف ہوا اور بے آواز فائر نے اس کے دل میں سوراخ کر دیا۔ وہ چیخ بھی نہ سکا اور سینہ ہاتھوں سے تھامے خون کے فوارے کو اچھالتا ہوا فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے احتیاطاً دو فائر اور کر دیئے۔ مرنے کے بعد بھی حیرت کا عنصر اس کی آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ سیاہ بیگ کے اندر رکھے ہوئے رنگین کانچ کے گلدان میں، میں نے پستول کو دوبارہ بند کرتے ہوئے اوپر مصنوعی سرخ پھولوں کی لڑیاں کو پھیلا دیں۔ بیگ کی زنجیر کھینچی اور اطمینان سے چلتی ہوئی ایک کونے میں رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھ گئی۔ قریبی پولیس اسٹیشن کے نمبر گھما کر خوف زدہ لہجے میں ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والے شعبۂ قتل کے ڈیسک کلرک نے ریسیور کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"یہاں ایک لاش پڑی ہے۔" میں نے اسے بتانا شروع کیا۔

❁......☆......❁

اگلے روز اخبارات میں جلی سرخیوں میں اس فون کال اور پُراسرار واردات کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ شائع ہوا تو کہرام سا مچ گیا۔ ایک اخبار نے لکھا "محبت اور رقابت کا ڈراما" دوسرے اخبار نے میاں بیوی کی حالیہ کشیدگی اور طلاق کے ردعمل کا شاخسانہ قرار دیا۔ پولیس کے شکوک و شبہات کا پھندہ شاہد کی بیوی شکیلہ کی گردن کے سامنے جھولنے لگا۔ جسے اس نے ایک ماہ قبل طلاق دے کر فارغ کر دیا تھا۔ اس کی بیوی کو اس کے تازہ رومانس کی خبر مل گئی تھی۔ شاہد اپنی مردانہ وجاہت سے ایک نوخیز کلی کو مسلنے میں مصروف تھا، اس کی بیوی اس کی اس روش اور

اخلاقی گراوٹ سے حد درجے تنگ آ چکی تھی۔ اس نے شاہد کے کردار کو گھناؤنا قرار دے کر علیحدگی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ شاہد خود بھی روز روز کی چپقلش کا خاتمہ چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بہ رضا و رغبت شکیلہ کو طلاق کے کاغذات بھجوا دیئے تھے اور اپنا مختصر سا سامان سوٹ کیس اور ضروری اشیاء لے کر اس کے شاندار محل نما مکان سے نکل کر فیصل ٹاؤن لاہور آ گیا تھا۔ عمارت خاصی پرانی تھی مگر کرایہ مناسب تھا اور تمام سہولیات سے آراستہ تھی۔

تین منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر وہ کمرہ نمبر 33 میں مقیم تھا۔ جو لفٹ سے بالکل سامنے واقع تھا۔ پرانی عمارت میں ایک لفٹ ہی بالکل نئی تھی۔ عقبی زینہ بھی موجود تھا جو ایمرجنسی کی صورت میں کام آنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ شاہد کی مٹھی میں آنے والی خوب صورت کلی ان دنوں اپنی ممی کے ساتھ ممبئی کی سیر کے لیے گئی ہوئی تھی' ان کے کافی عزیز و اقارب وہاں موجود تھے۔

❀......☆......❀

ایک اخبار نے لکھا۔ شاہد کو صبح دس بجے اس کے فلیٹ میں دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا۔ یہ جرائم کی دنیا کا پُراسرار ترین واقعہ ہے۔ شاہد کی لاش کو شائستہ نامی لڑکی نے دریافت کیا تھا۔ جو گھر گھر آرائشی مصنوعات فروخت کرنے والی ایک کمپنی میں سیل گرل تھی جس نے فلیٹ میں داخل ہونے سے قبل ایک خاتون کو بے حد گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے سے نکل کر جلدی سے لفٹ میں سوار ہو کر نیچے جاتے دیکھا تھا۔ جس نے بڑے بڑے تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ خاتون کے بال بھورے اور چھوٹے چھوٹے تھے اور کانوں تک ترشے ہوئے تھے۔ جلد کی شہابی رنگت بے حد دلکش تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ یہ حلیہ بیان کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس امر کا خیال رکھا تھا کہ کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہو جس کا تعلق تفصیلی حلیے یا سراپا سے ہو۔ بس اس قدر حلیے کا بیان کافی تھا۔ جو ایک بھاگتی ہوئی خاتون کی محض ایک جھلک دیکھنے سے یاد رہ جاتا ہے۔

سب باتیں میری توقع کے مطابق ہو رہی تھیں۔ اس حلیے پر پوری اترنے والی شاہد کی بیوی ہی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی جلد کا رنگ شہابی تھا اور کشیدگی کے سبب وہ انتہائی اقدام اٹھانے پر تیار ہو سکتی تھی۔ باقی حلیہ بدلنا کون سا مشکل کام ہوتا ہے میں خطوط پر سوچ رہی تھی۔ لیکن ابھی تک آلۂ قتل اور دوسری حلیہ تبدیل کرنے والی اشیاء کا سراغ نہیں ملا تھا۔

میرے اندر پانچ سال سے سلگنے والی انتقام کی آگ بجھ گئی تھی۔ صورت حال تسلی بخش ہونے کے باوجود میں محتاط تھی کیونکہ قاتلہ کے حلیے میں مجھے عمارت کے ملازمین جو صبح صبح ہی متحرک ہو جایا کرتے تھے' میری جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بلڈنگ کا مالک بھی صبح صبح عمارت کا ایک چکر لگایا کرتا تھا۔ نامعلوم اندیشوں کے باوجود میرا پلان کامیاب تھا اور پولیس فرضی حلیہ اختیار کرنے والی عورت کو تلاش کر رہی تھی۔

❀......☆......❀

سب سے دلچسپ بات اس وقت رونما ہوئی جب پولیس تفتیش کی غرض سے شاہد کی سابقہ بیوی شکیلہ کے گھر پہنچی تو شکیلہ گھر پر موجود نہیں تھی' اسے غائب پا کر پولیس کے ڈیوٹی افسران کا شک یقین کی حد تک چلا گیا۔ چند پولیس والے وسیع و عریض کوٹھی کو کھنگالتے ہوئے جب عقبی حصے میں پہنچے تو

انہیں شکیلہ عمارت کی پشت پر واقع گیراج میں اپنی کار کھڑی کر کے گھریلو استعمال کی روزمرہ کی اشیاء نکالتی نظر آئی۔ پولیس افسران اپنے سامنے بڑے بڑے سیاہ چشمے اور شہابی جلد والی عورت کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ نیلے لباس اور بھورے بالوں کی البتہ کمی تھی۔ شکیلہ کے بال لمبے گھنے اور سیاہ تھے لیکن انہیں بھورے رنگ کی وگ میں چھپانا ممکن تھا۔ جب اس سے بازپُرس کی گئی تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے خاوند کے قتل سے بے خبر ہے اور ذہنی پریشانی کی وجہ سے کئی روز سے اخبار کا مطالعہ بھی نہیں کر پائی تھی۔ اس کے پاس اپنی عدم موجودگی کا کوئی خاص ثبوت نہیں تھا جس نے پولیس کے شکوک کو پختہ کر دیا۔ اس نے واردات کی صبح ٹھیک گیارہ بجے بیدار ہوئی تھی۔ اس کے کمرے کی ایک عقبی کھڑکی ایک ملازم کے بیان کے مطابق کھلی ہوئی پائی گئی تھی۔ جس سے پولیس کا شبہ مزید تقویت پا چکا تھا۔ شکیلہ مسلسل اپنے مجرم ہونے سے انکار کر رہی تھی اور یہ کہہ رہی تھی کہ کسی نے اسے پھنسانے کے لیے طلاق کے بعد قتل کی واردات کی ہے تاکہ سارا شک و شبہ اس کی ذات پر آ جائے۔ شکیلہ اور اس خوب صورت ملازمہ شاہینہ دونوں ساتھ ساتھ تھیں۔ شاہینہ کو شاہدہ نے طلاق کے پندرہ روز بعد سیکریٹری کے طور پر ملازم رکھا تھا۔ وہ اس کے معمولات اور گھریلو امور میں معاونت اور دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس کے علاوہ آفس میں اسسٹ بھی کرتی تھی۔ شکیلہ ایک شاندار پلازہ کی مالک تھی۔ جس میں شکیلہ کا اپنا شاندار پراپرٹی بزنس تھا وہ شہر کی واحد عورت تھی جو اس قسم کے کاروبار سے منسلک تھی۔ اسے یہ کام اور جائیداد والد سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ شاہد کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہو کر اس نے شادی کر لی تھی لیکن وہ انتہائی بدکردار اور دل پھینک واقع ہوا تھا۔ پولیس شکیلہ کی مالی پوزیشن کی وجہ سے ادب آداب سے اب تک پیش آ رہی تھی۔ عمارت پولیس والوں سے بھری ہوئی تھی۔ پولیس کے کارندے عمارت کی تلاشی لے رہے تھے۔ شکیلہ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ڈرائنگ روم میں اپنی سیکرٹری شاہینہ کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ شاہینہ کا چہرہ اور رنگت اڑی اڑی سی تھی۔ باطنی طور پر وہ مضطرب معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مالکن کے مسئلے اور پریشانی میں برابر کی شریک ہو۔ شکیلہ نے اسے بہت اچھی دوست اور رفیق پایا تھا۔ تفتیش کے دوران ایک اور عورت کا بھی انکشاف ہوا تھا۔ جس کا نام کاجل تھا وہ فلم اسٹار تھی اور سیکسی گرل کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے بھورے بال چھوٹے چھوٹے اور ترشے ہوئے تھے اور جلد بھی نکھری ہوئی شہابی تھی لیکن اس کے پاس قتل کی صبح ایک شوٹنگ میں مصروف ہونے کا ثبوت موجود تھا۔ شاہد کو چند بار اس سے ملتے جلتے دیکھا گیا تھا۔ پولیس کچھ دیر تک اس رخ پر آگے بڑھی لیکن اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ شہرت کو بھلا نہیں سکتے تھے۔ متعدد افراد دوران شوٹنگ بطور گواہ موجود تھے۔ ابھی تک آلۂ قتل شکیلہ کی کوٹھی سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ جس کے بغیر پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے سے گریزاں تھی۔ چنانچہ میں نے شاعرانہ چال کے طور پر موقع پا کر بھورے بالوں والی وگ نیلے سوٹ' سیاہ چشمے اور آلۂ قتل کو پوشیدہ مقام سے نکال کر ایک دوسرے مقام پر چھپا دیا۔ شکیلہ کی کوٹھی میں اس وقت اس کی خالہ اپنی متعدد لڑکیوں کے ساتھ موجود تھی۔ شکیلہ کی دو پرانی سہیلیاں بھی

عرصہ دراز کے بعد کراچی سے ملنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ پولیس انہیں بھی ٹٹول رہی تھی۔ سامان کی چیکنگ کی جارہی تھی کہ کسی کے ساتھ شاہد کے معاشقے کا سراغ مل جائے۔

لیکن تفتیش کی گاڑی آگے نہ بڑھ سکی۔ پولیس نے جب اس سیلز گرل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو وہ نہ مل سکی۔ مطلوبہ پتے پر جب پولیس پہنچی تو کمپنی کے مالکان نے اس لڑکی کے وجود سے انکار کردیا۔ اس تاریخ اور دن کے دس بجے کوئی لڑکی مصروف کار نہیں تھی۔ سب لڑکیوں کا شیڈول اور ریکارڈ پولیس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ پولیس چکرا کر رہ گئی کہ وہ لڑکی کہاں گئی۔ سامنے آنے سے کیوں گریزاں ہے۔ پولیس کو شبہ ہوگیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ معاملہ بہت گہرا ہے۔ پولیس کے کارندوں نے سیلز گرل کو شدت سے تلاش کرنا تلاش کرنا شروع کردیا۔ میری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ پولیس فلم آرٹسٹ کاجل کی کوٹھی سے تفتیش مکمل کرنے کے بعد پھر دوبارہ شکیلہ کی کوٹھی میں موجود تھی۔ دو نئے آفیسرز شکیلہ کو کریدنے کے بعد بڑے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ایک سب انسپکٹر سرفراز تھا اور دوسرا سراغ رساں انسپکٹر عمران۔ عمارت کی تلاشی کا عمل اس بار باقاعدہ وارنٹ کے ساتھ سرگرمی کے ساتھ جاری تھا۔ کیونکہ پہلی بار کی تلاشی کو ناکافی قرار دیا جاچکا تھا۔

شکیلہ کی محل نما وسیع و عریض عمارت کی تلاشی لیتے ہوئے پولیس کے کارندے جب جھنجلائے ہوئے عمارت کے بوسیدہ تہ خانے میں پہنچے تو انہیں ایک وزنی اور پرانا صندوق دکھائی دیا۔ جو کاٹھ کباڑ اور گرد میں اٹا ہوا بمشکل اپنا آپ ظاہر کررہا تھا۔ جب صندوق کھول کر دیکھا گیا تو انہیں محسوس ہوا جیسے کمرے میں بم پھٹ گیا ہو۔ صندوق کو بڑی احتیاط سے اوپر لاکر افسران بالا کے سامنے پھر کھول دیا گیا۔ اس کے اندر مذکورہ فرم کے نمونہ جات والی لیبل زدہ آرائشی مصنوعات مختلف پیکٹوں میں ملفوف تھیں۔ دوسری جانب ایک مصنوعی بالوں کی وگ تھی۔ جس کے چھوٹے چھوٹے بھورے بال پنکھے کی ہوا میں اڑنے لگے تھے۔ وگ کے نیچے وہ سیاہ ریوالور بھی مل گیا۔ پاس ہی اسکن کلر کے دستانے بھی موجود تھے۔ نیلا لباس بھی تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ شکیلہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ ہتھکڑی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی مانند پیلا پڑ گیا اور جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ پاس کھڑی ملازمہ شاہینہ بے بسی سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ ”باخدا میں بے گناہ ہوں میرا خاوند لاکھ برا سہی لیکن میں اس کے قتل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اس وقت بازی پلٹ گئی۔ نیا پولیس افسر انسپکٹر عمران کی گہری سوچ میں چلا گیا۔ اس نے ہتھکڑی لیے آگے بڑھتی لیڈی انسپکٹر کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”سر کیا مطلب؟ کیس مکمل ہوچکا ہے۔ ثبوت بھی مل گیا ہے جو کافی اور مکمل ہے۔ پرانے صندوق پر مسز شکیلہ کی انگلیوں کے نشانات کے علاوہ کسی اور کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں۔ یہ نشانات ماہرین کی آرا کے مطابق چند دن قبل کے ہیں۔“

مختلف آوازیں فضا میں بلند ہوئیں لیکن انسپکٹر عمران نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کیس کا تجزیہ کررہا تھا۔ شکیلہ نے صفائی میں بتایا کہ تہ خانے میں موجود اس پرانے صندوق سے اس نے ایک پرانا بلڈنگ کا نقشہ نکالا تھا۔ جو اس کے

والد نے یہاں رکھا تھا۔ پولیس کو اس بیان پر اعتبار نہ آیا۔ انگلیوں کے نشانات چند دن قبل کے تھے۔ جو اس کے شبے کو تقویت بخش رہے تھے۔

انسپکٹر عمران چند لمحے ڈرامائی انداز سے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے سسپنس سے بھرپور سناٹے کو توڑا۔ ”محترم حاضرین! یہ اشد ضروری ہے کہ قتل کے اس انوکھے اور اہم کیس کے اختتام پر صندوق سے برآمد ہونے والی وگ کو شکیلہ کے سر پر پہنا کر دیکھا جائے۔“

سب افسران حیرت و استعجاب سے انسپکٹر عمران کو دیکھنے لگے پھر اس نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے وگ انسپکٹر عمران کی طرف بڑھا دی۔

انسپکٹر عمران شکیلہ کی طرف بڑھنے لگا۔ شکیلہ ذرا نہ گھبرائی۔ البتہ الجھن محسوس کرنے لگی بہرحال یہ قتل کے ثبوت کا معاملہ تھا۔ انسپکٹر عمران نے وگ کو شکیلہ کے سر پر پہنائی تو اس کے سر پر کسی طرح بھی فٹ نہ آسکی۔ شکیلہ کے بال لمبے، گھنے اور سیاہ تھے۔ وگ کے چھوٹے چھوٹے گھنے بھورے بال انہیں کسی طرح نہ چھپا سکے۔ انسپکٹر عمران نے وگ کو شکیلہ کے سر سے اتار اور انہیں شک و شبے سے بری قرار دے دیا۔ شکیلہ خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ اچانک انسپکٹر عمران نے تیزی سے اپنے ہاتھ میں موجود وگ شاہینہ کے سر پر پہنا دی۔ وہ بھڑک اٹھی اور اس کا ہاتھ ایک قریبی پولیس آفیسر کے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ لیکن انسپکٹر عمران نے آگے بڑھ کر تیزی سے اسے بے بس کرکے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی مانند پولیس آفیسرز کے چہرے دیکھنے لگی۔ کامیاب منصوبہ ناکام ہوچکا تھا اور وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئی تھی۔ وگ میرے سر پر پوری طرح فٹ آگئی تھی اور جب انسپکٹر عمران نے صندوق سے بڑے بڑے سیاہ شیشوں والی عینک میری آنکھوں پر لگائی اور لیڈی انسپکٹر نے زبردستی نیلے رنگ کی قمیص پہنا دی تو میں صاف طور پر وہی بھورے بالوں والی اور شہابی جلد والی عورت بن چکی تھی۔ جسے سیلز گرل نے شاہد کے فلیٹ سے گھبرائے ہوئے انداز میں بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

میں نے انسپکٹر عمران کے اندازے کی توثیق کرتے ہوئے اقرار کیا کہ میں نے اپنی سفید جلد پر شہابی رنگ کی ایک خاص کریم کی مالش کررکھی تھی۔ یہ کریم فرانس سے درآمد شدہ تھی اور فلموں میں جلد کا رنگ تبدیل کرنے کے لیے بھی خصوصی طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

میرا سر جھک گیا لیکن ضمیر مطمئن تھا۔ میں نے ایک حسین بھیڑیے کو اس کے انجام سے دوچار کیا تھا۔ جو محبت کا فریب دے کر پانچ سال قبل مجھے لوٹتا رہا تھا۔ پھر ایک دن نیند کی دوا کھلا کر مجھے چھوڑ بھاگا تھا مجھے مجبوراً اپنا حمل ضائع کروانا پڑا پھر انتقام کی آگ کو سینے میں لیے کراچی سے سراغ ملنے پر لاہور آگئی۔ اتفاق سے مجھے شاہد کی بیوی شکیلہ کے پاس ملازمت مل گئی۔ جسے دس بارہ روز قبل طلاق ہوچکی تھی۔ میں نے دونوں کی مشترکہ تصویر دیکھی تو شاہد کو پہچان لیا اور اپنا جال بننا شروع کردیا جس میں، میں انسپکٹر عمران کی ذہانت کی وجہ سے پھنس گئی تھی۔

❖

بزمِ سخن

روبین احمد

سمیرابانو......فیصل آباد

تیرے نام کی ہچکی تھی ہونٹوں پر سمٹنے کو
میں یہ سناٹا مکمل کرنے والا تھا کہ تم آئے
لوگ چھتوں پر تھے اور میرا رقصِ تنہائی
مجھے یہ چاند پاگل کرنے والا تھا کہ تم آئے

انیلہ شاہین مہک......گلگت

کل رات بار بار تمہیں سوچتے رہے
موسم تھا بے قرار تمہیں سوچتے رہے
بارش ہوئی تو گھر کے دریچے سے لگ کے ہم
چپ چاپ سوگوار تمہیں سوچتے رہے

حمیرا محمود......جتوئی

اجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ رہا کر
حالات کی قبروں کے کتبے بھی پڑھا کر
ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کردے
تنہائی کے لمحات میں کچھ رو بھی لیا کر

صبا......لیہ

تمہارے پیار کا اندازہ خود مجھے بھی نہیں
وہ لفظ کیسے تراشوں جو تجھے بتلائیں
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں ابھی بنے ہی نہیں
وہ آئینے جو تمہیں میرے خواب دکھلائیں

مہرین......چونالہ

اے مشرقی لڑکی اپنی خواہشوں کو کسی پر عیاں نہ کرنا
اگر کچھ ظاہر کیا تو خواہشات کو ماردیں گے ورنہ
تو نے اگر ٹٹولا اپنے مقدروں کو
تو ہوگا تیرے نصیب میں زمانے کے ہاتھوں مرنا

سمیرا شریف طور......گوجرانوالہ

میں شجر ہوں شہر ملال کا میری ٹہنیوں کو نہال کر
کبھی بھیج اپنی نوازشیں کسی جام ابر میں ڈھال کر
مجھے خار خار مسافتوں کی ستم گری نے تھکا دیا
مجھے راستوں کی خبر دے، میرے حوصلے بحال کر

نومی......ٹوبہ ٹیک سنگھ

یہ تو طے تھا کہ جانا ہے مگر وہ مڑنا یاد آتا ہے
وہ چہرہ، وہ آنچل، وہ تیری زلفوں کو تکنا یاد آتا ہے
وہ چلا گیا تو سمجھے مقدر میں نہیں تھا ماہر
اب محبت کو مقدر میں بدلنا یاد آتا ہے

رخسانہ قاسم گل......کراچی

یوں لب کشا ہوں میں اسے بھا جائے میری بات
دل میں اتر کے روح پہ چھا جائے میری بات
خوشبو نہ جن کی ختم ہو رنگت پڑے نہ ماند
گلشن میں ایسے پھول کھلا جائے میری بات

اے انجم......چناب نگر

کہاں یہ بس میں کہ ہم خود کو حوصلہ دیتے
یہی بہت تھا کہ ہر غم پہ مسکرا دیتے
اب اس کی یاد ہے، اُس کا بدن تراشتے ہیں
وہ خواب بھی تو نہیں تھا کہ ہم بھلا دیتے

روبینہ رمضان انصاری......دینہ

پاس وہ آئے تو یہ اس کی عقیدت ہوگی
شاید اس شخص کو بھی مجھ سے محبت ہوگی
یوں نہ چپ چاپ میرے پاس آیا کر
بڑھ گیا پیار تو اک دن مصیبت ہوگی

حمنہ خان......ڈگری

جہاں بھی ہو چلے آؤ تمہیں یادیں بلاتی ہیں
تمہارے ساتھ گزری تھی جو شامیں بلاتی ہیں
یہ نہ سمجھو تمہارے بغیر کسی کا دل نہیں روتا
کسی کی آج بھی تمہیں اداس آنکھیں بلاتی ہیں

ساجدہ اینڈ آسیہ......نوکوٹ

ملنا اتفاق تھا بچھڑنا نصیب تھا
وہ اتنا ہی دور ہوگیا جتنا میرے قریب تھا
میں اس شخص کو دیکھنے کو ترس گئی
اس شخص کی ہتھیلی پر میرا نصیب تھا

ثمرین حبیب......ٹین واٹر

وہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، وہی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے
ترا نام لکھنا کتاب پر، ترا نام پڑھنا کتاب میں
یہ دعا ہے ایسی غزل کہوں، کبھی پیش جس سے میں کرسکوں
کوئی حرف تیرے حضور میں، کوئی شعر تیری جناب میں

اقصیٰ چیمہ......چنیوٹ

کبھی منزلوں کی صورت میری دسترس سے باہر
کبھی سنگ میل بن کر میرے راستے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
میری خواہشوں کی خوشبو میرے زائچے میں رہنا

راحیلہ نذیر......فیصل آباد

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

قرۃ العین کامل......بھٹ شاہ

قلم ہو، تیغ ہو، تیشہ کہ ڈال مت چھینو
کبھی کسی سے کسی کا کمال مت چھینو
ابھی بجھاؤ نہ کینڈل، نہ کیک کاٹو ابھی
کچھ اور دیر میرا پچھلا سال مت چھینو

زنیرہ مغل......چیچہ وطنی

ہر قرض دوستی کا ادا کون کرے گا
ہم نہ رہے تو وفا کون کرے گا
اے خدا میرے دوست کو سلامت رکھنا
ورنہ میرے جینے کی دعا کون کرے گا

مہوش شاہین......حجرہ شاہ مقیم

کس نے کھیل کھیلا ہے کس نے ہجر جھیلا ہے
اب گزر گیا جاناں اس سوال کا موسم
کس طرح سے ممکن تھا اک شاخ پر کھلتے
میں کہ ہجر کا لمحہ، تو وصال کا موسم

آصف بھکر جاوید

ہوائیں سرد ہوجائیں یا لہجے برف ہوجائیں
ہم اس کی یاد کی چادر خود پر تان لیتے ہیں
اگر وہ روٹھ جاتا ہے تو میری جان جاتی ہے
یہ سانس جاری رکھنے کو ہم اس کی مان لیتے ہیں

سائرہ کرن......کوٹ چھٹہ

مت بول کہ سچ تجھ سے بولا نہیں جاتا
یوں عشق ترازو میں تولا نہیں جاتا
بے نام سے جذبوں کو کوئی نام ہی نہ دے دے
جذبوں کو کبھی خاک میں رولا نہیں جاتا

فرزانہ شوکت......کراچی

نہیں سلیقہ ہے تہذیب غم سمجھنے کا
ان ہی کے رونے میں آنسو نظر نہیں آتے
خوشی کی آنکھ میں آنسو کی بھی جگہ رکھنا
برے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے

سلمٰی ملک......قادر پوراں

کیسے گزرتے ہیں دن اور راتیں
جب اپنے بھی پرائے ہوجاتے ہیں
ان لمحوں کا کرب نہ پوچھ سلمٰی
جب گم اپنے ہی سائے ہوجاتے ہیں

عنبر نوشین وسیم......گوجرانوالہ

تمہاری سالگرہ پر دعا ہے ہماری
کہ روز مبارک ہزار بار آئے
تمہاری ہنستی ہوئی زندگی کی راہوں میں
ہزار پھول لٹاتی ہوئی بہار آئے

مانو......سیالکوٹ

نہ کوئی کسی سے دور ہوتا ہے
نہ کوئی کسی کے قریب ہوتا ہے
پیار خود چل کر آتا ہے
جب کوئی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے
نورین تبسم......سیالکوٹ

بن تیرے ہر بات ادھوری لگتی ہے
بن تیرے ہر رات ادھوری لگتی ہے
کھو جاؤں میں جب بھی تیری یادوں میں
مجھ کو میری ذات ادھوری لگتی ہے
فریدہ جاوید فری......لاہور

کچھ اس طرح دوستو بے کل ہیں آج کل
کیونکہ وہ میرے دل میں مسلسل ہیں آج کل
دنیا میں کیا ہے کیا نہیں ہم کو خبر ہے کیا
ہم تو اسی کی فکر میں ہر پل ہیں آج کل
عابدہ اکرم غوری......راجن پور

مجھے اپنے آنگن میں قمر اچھا نہیں لگتا!
تمہارے لوٹ کر جانے سے گھر اچھا نہیں لگتا
بھکاری مت کہو ہم کو ہے خصلت ہم فقیروں کی
وہاں ہم تھوک دیتے ہیں جو در اچھا نہیں لگتا
گل محمد گل......منڈھیالہ چٹھہ

خزاں کا وادیٔ گل سے گزرنا روک دیتا ہے
کوئی تو ہے جو طوفانوں کا راستہ روک دیتا ہے
کوئی لشکر بکھر جاتا ہے موجوں کے تلاطم میں
کسی کے واسطے اللہ دریا روک دیتا ہے
ایم آر کے......مظفر گڑھ

ہم کو آپس میں محبت نہیں کرنے دیتے
اک یہی عیب ہے اس شہر کے داناؤں میں
مجھ سے کرتے ہیں اس لئے کچھ لوگ حسد
کیوں میرے شوہر ہیں مقبول حسیناؤں میں
پروین افضل شاہین......بہاولنگر

کتنا اچھا اس کا لہجہ تھا
اچھا لگتا تھا ڈانٹنا اس کا
کیا بتاؤں کہ قیامت تھا
ہونٹ دانتوں سے کاٹنا اس کا
گڑیا شاہ......کہروڑ پکا

یہ کہہ کر کاٹ دیں زبانیں اہل دانش نے
نہ ہو مصرف کسی شے کا تو وہ بے کار ہوتی ہے
سروں کی فصل پکنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
کبھی مطلق صداقت بھی زمین پر بار ہوتی ہے
سیدہ نسبت زہرا......کہروڑ پکا

آنچل میں پھول لے کے کہاں جا رہی ہوں
جو آنے والے لوگ تھے وہ لوگ تو گئے
کیا جانئے افق کے ادھر کیا طلسم ہے
لوٹے نہیں زمین پر اک بار جو گئے
شازیہ خلیل......میانوالی

بڑے اسرار پوشیدہ ہیں اس انتہا پسندی میں
یہ مت سمجھو کہ دیوانے جہاندیدہ نہیں ہوتے
تعجب کیا اگر اقبال دنیا مجھ سے ناخوش ہے
بہت سے لوگ دنیا میں پسندیدہ نہیں ہوتے
ناجیہ ملک......چناری آزاد کشمیر

محبت موسموں کی قید سے آزاد ہوتی ہے
سنو، سورج نکلنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
ابھی بھی یاد آئے تو نگاہیں بھیگ جاتی ہیں
پرانی راکھ جلنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

خوشبو سخن

سیما بنت عاصم

غزل

اب رخ یار سے میں زلف ہٹاؤں کیسے
وہ آفتاب ہے چھو کر میں دکھاؤں کیسے
اپنے ہاتھوں کی تپش پر تھا ناز بہت
اب جو شمع جلی ہے تو بجھاؤں کیسے
چمن تو خود ہی بھرا ہوا ہے پھولوں سے
میں اپنے روپ سے کسی کونے کو سجاؤں کیسے
ابر بن کے تو وہ برسا ہے ایک عالم پر
اپنے عارض پر یہ چند آنسو برساؤں کیسے
فاصلے تو نے تو خود ہی بڑھا ڈالے ہیں
میں ترے پاس آنا بھی چاہوں تو آؤں کیسے
میری آنکھوں سے میرا حال دل سمجھنے والے
اب زباں سے میں تجھے حال بتاؤں کیسے
روز تو نیند میری توڑ کے جگاتا تھا
اب جو سویا ہے تو میں تجھ کو جگاؤں کیسے
چھپا کے جذبات سدا رکھے ہیں اپنے ستاؤں تو تو نے
میں تجھے بھی ستاؤں تو پر تجھ کو ستاؤں کیسے
مجھ کو تو یاد نہیں میں نے کل کہا کچھ تھا
تیری اس ادا کو میں چاہوں بھی تو پر بھلاؤں کیسے
تارے مدھم ہیں رات بھیگی ہے ابھی اس وقت
دل تو چاہتا ہے پر عالی کو رلاؤں کیسے
شاعرہ:۔عالیہ انعام الٰہی......کراچی

اداس شہزادہ

سورج ڈوب رہا ہے
شام کی آغوش میں
دشتِ تنہائی ہے
تیری یاد کے مئے خانے کا
دریچہ کھل چکا......!
اس میں
ایک اداس شہزادہ
بے نام منزل کا مسافر
مئے جام پے بنا ہی
مدہوش پڑا ہے
کسی نئے فریب کی
آس لیے
طلوعِ سحر تک
عبدالحکیم ساجد......منچن آباد

غزل

دل لبھاتا رہا ستارۂ شب
جھلملاتا رہا ستارۂ شب
دن میں آنسو بہائے جب ہم نے
یاد آتا رہا ستارۂ شب
غمِ فرقت نے جب کیا بے چین
مسکراتا رہا ستارۂ شب
خوف طاری تھا صبح ہونے کا
کپکپاتا رہا ستارۂ شب
ساتھ میں جاگتا رہا ہے جمال
کام آتا رہا ستارۂ شب
شاعر:۔سمیع جمال......کراچی

غزل

عین کرے سحر زدہ وہ حسن کہاں مہتاب میں
جو ہے کشش تری آنکھ کے گوہرِ نایاب میں
احوال اس کا نہ تھا خط میں اگرچہ کہیں بھی
بس ایک پھول آیا بکھرا ہوا جواب میں
تم دھوپ ہو یا چھاؤں غم ہو یا کوئی خوشی
حیرت زدہ کھوئے ہیں تیری ذات کے سراب میں

تمہیں ہے خوفِ رسوائی تمنائے دید کے اظہار میں
مرے دلِ ناتواں کو تم نے رکھا ہے کس حساب میں
وقت ملاقات تو گفتگوئے دنیا میں ہی گزر گیا
دل کی بات کرتے تو کیا' دونوں رہے حجاب میں
عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

غزل

جس کو خدا سکون کی دولت عطا کرے
لازم ہے اس پر شکر وہ صبح و مسا کرے
وہ ہے غفور بخش دے گا اس کے سب گناہ
انسان جب بھی نیکیوں کی ابتدا کرے
اپنی تو بس دعا ہے یہی' ربّ ذوالجلال!
سب کے دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کرے
دشمن نہیں ہے بھیڑیا خود اپنی نسل کا
انسان اس کو دیکھ کر ہی کچھ حیا کرے
پتھر سے پھوٹتے نہیں نغمات جاں فزا
خاشاک پیدا کس طرح رنگِ حنا کرے
وہ عشق جس کو میں نے چھپایا تمام عمر
اب اس کا پورے شہر میں چرچا ہوا کرے
حق ہے یہی کہ خواہشیں اس کی غلام ہوں
کیوں خواہشوں کے سامنے انسان جھکا کرے
عبادت خدائے پاک کی ہے اصل زندگی
زندہ رہے تو زندگی کا حق ادا کرے
بیدار کردے غیرتِ انسان کو قمر
ایسا اثر ہو شعر میں میرے خدا کرے
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

تبدیلی

مجھے عادت تھی
بھول جانے کی
کوئی کتاب ہو
کوئی راز ہو
کوئی نغمہ ہو
کوئی ساز ہو
ہمیشہ بھول جاتی تھی
اور
اب میں تمہیں بھولنا چاہتی ہوں
تمہاری یادوں سے
بچھڑنا چاہتی ہوں
لیکن یہ کیسی تبدیلی!
کہ چاہ کر بھی
بھول نہیں پاتی!
ریحانہ سعیدہ...... لاہور

غزل

شان و شوکت فانی ہے
ہر شے آنی جانی ہے
اک روز بڑھاپا آنا ہے
پہلے مخمور جوانی ہے
عارضی ہے تنگی و عسرت
دولت و ثروت بھی فانی ہے
رنگ و روپ اور فصلِ بہار
سب کی ایک کہانی ہے
طاقت' قوت' زور اور جوش
ساری رام کہانی ہے
محمد عبداللہ عاطر...... منگلا کینٹ

غزل

اس سے گلہ کیا کروں میں
یہ تو ویسے بھی برا لگتا ہے
کھڑکی سے ذرا جھانک کے دیکھو
چاند بھی بدلی میں چھپا لگتا ہے
مدت سے مجھے ملا ہی نہیں
مجھ کو وہ کچھ کچھ خفا لگتا ہے

سفر میں جانے سے پہلے سوچ لو
رستے کا ہر نشان مٹا لگتا ہے
شہر کے ہنگاموں میں صرف یہ ہوا
گاؤں سے آیا بچہ تنہا لگتا ہے
چاروں طرف اندھیرا میرے گھر کے
کمرے ایک دیا جلا لگتا ہے
ہے تو میرا بھائی مگر کیا کروں
سارے گھر سے وہ مجھے جدا لگتا ہے
جنگل تو کاٹ کے رکھا سارا
صرف ایک درخت ہے جو کھڑا لگتا ہے
وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

وہ اپنی چال بدلتا نہیں کبھی
پھول سائے کے ساتھ چلتا نہیں کبھی
دے کے داغ جدائیوں کے ہمیں
میرے غم میں تیرا پیار ڈھلتا نہیں کبھی
تیری سوچوں کے گہرے سمندر میں
دل میرا پھر سے ڈوبتا نہیں کبھی
فضا بھی صاف ہے تیرے پیار کی طرح
کوئی کسی کے غم میں جلتا نہیں کبھی
ہم کیوں نہ بدل لیں راہیں اپنی جاوید
یہ دل کسی کی یاد میں دھڑکتا نہیں کبھی
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

غزل میں قافیہ باندھا گیا ہے
سخن کا سلسلہ باندھا گیا ہے
بکھر جاتا اگر ایسا نہ کرتا
جنوں سے رابطہ باندھا گیا ہے
پہنچ ہی جائیں گے منزل پر اک دن
قدم سے ولولہ باندھا گیا ہے
بہاروں کی تمنا بھی نہیں اب
خزاں سے سلسلہ باندھا گیا ہے
خسارہ ہے بہت سے سلسلوں میں
زیاں سے فائدہ باندھا گیا ہے
مناظر کے نظر سے رابطے ہیں
نظر سے جائزہ باندھا گیا ہے
ولی لازم ہوئے اک دوسرے کے
سفر سے راستہ باندھا گیا ہے
شاہ روم خان ولی

غزل

تیری یاد اور تیرے دھیان میں گزری ہے
ساری زندگی ایک مکان میں گزری ہے
اس تاریک فضا میں میری ساری عمر
دیا جلانے کے امکان میں گزری ہے
اپنے لیے جو شام بچا کر رکھی تھی
وہ تجھ سے عہد و پیمان میں گزری ہے
تجھ سے اکتا جانے کی اک ساعت بھی
تیرے عشق ہی کے دوران میں گزری ہے
دیواروں کا شوق جہاں تھا سب کو جمال
عمر میری اس خاندان میں گزری ہے
انتخاب: رابعہ حسن صابر لنگاہ...... خانیوال

نظم

تم اگر ٹوٹ جاؤ
تم اگر بکھر جاؤ
بے بسی میں گھر جاؤ
دل سے اک صدا دینا
بس مجھے بلا لینا
میں تمہیں سنبھالوں گا
زندگی میں چلنے کا
راستہ بدلنے کا

اک ہنر سکھادوں گا
تم کو حوصلہ دوں گا
اور جب سنبھل جاؤ
روشنی میں ڈھل جاؤ
مجھ کو یوں صلہ دینا
تم مجھے بھلا دینا

انتخاب: مہک آفتاب...... ملتان

غزل

کیا کرے میرے مسیحائی بھی کرنے والا
زخم ہی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا
زندگی سے کسی سمجھوتے کے باوصف اب تک
یاد آتا ہے کوئی مارنے مرنے والا
اس کو بھی ہم تیرے کوچے میں گزار آئے ہیں
زندگی میں وہ جو لمحہ تھا سنورنے والا
اس کا اندازِ سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ مکرنے والا
شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا
دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا
اسی امید پر ہر شام بجھائے ہیں چراغ
اک تارا ہے سر بام ابھرنے والا

انتخاب: غلام سکینہ صابر لنگاہ...... خانیوال

غزل

حسن کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر دیکھو
کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے
کوئی دیوار گرا کر دیکھو!
فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں؟
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو
کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبو نے
پھول کے پاس تو جا کر دیکھو
دل میں بے تاب ہیں کیا کیا منظر
کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو
ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
شب زدو! آنکھ اٹھا کر دیکھو

فرح ناز حسنین...... لاہور

مجھے تم سے محبت ہے......!!

کسی نازک سے لمحے میں
کسی دن شام سے پہلے
اگر چپکے سے تیرے کان میں
آ کر میں یہ کہہ دوں
مجھے تم سے محبت ہے!
تو تم ناراض مت ہونا
فقط اتنا ہی کر دینا
میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
میرے بالوں کو سہلا کر
فقط اتنا ہی کہہ دینا
کہ تم قابل نہیں ہو محبت کے
یقین جانو! جو تم مجھ کو
اگر اتنا بھی کہہ دو گے
یہی مجھ کو غنیمت ہے
تمہاری یہ جو نفرت ہے
مجھے اس سے محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے!

شہروز...... کراچی

ذوق آگہی

عفان احمد

نماز

حضرت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالی شان ہے کہ نماز دین کا ستون ہے اس کے ادا کرنے سے دس باتیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱:۔ دنیا اور عقبیٰ میں عزت و آبرو حاصل ہوتی ہے۔
۲:۔ حصولِ علم و نیکی میں قلبی نور حاصل ہوتا ہے۔
۳:۔ بدن تمام بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔
۴:۔ پروردگار عالم کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔
۵:۔ عبادت الٰہی دعا کے قبول ہونے میں چابی کی مانند ہے یعنی نمازی کی دعا قبول ہوتی ہے۔
۶:۔ نماز قبر کی تاریکی میں تنہائی کی رفیق (ساتھی) ہوتی ہے۔
۷:۔ نماز نیکیوں کے پلڑے کو جھکا دیتی ہے۔
۸:۔ جنت کی حوروں کے ساتھ میوہ جات کھانے کو ملیں گے۔
۹:۔ نمازی سے روزِ محشر اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔
۱۰:۔ جنت کی دل پسند نعمتوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

مشاہدات

☆ یادیں انسان کی بہترین دوست ہیں اور زخم بھی جنہیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی اور انسان تا زندگی انہیں سینے سے لگائے رہتا ہے۔

☆ زندگی اللہ پاک کا دیا ہوا ایک انمول تحفہ ہے۔ جسے واپس کرنا اذیت ناک خیال ہے۔

☆ پیار رات کا وہ خاموش مسافر ہے جو خود اندھیروں میں سفر کرتا ہے مگر دوسروں کے لیے قدم قدم پر نور بکھیرتا ہے۔

☆ آنسو یہ کڑوے گھونٹ امیدوں کے سہارے پینے پڑتے ہیں۔

☆ انتظار بے قراری کا دوسرا نام ہے اور انتظار کی لذت سے وہی لوگ آشنا ہوتے ہیں۔ جو شب الم سے لے کر طلوع سحر تک اس میں جلتے ہیں۔

☆ امید ایک ایسی ٹھنڈی اور سکون بخش وادی ہے جو اپنے پرسکون دامن میں انسان کو پناہ دے کر اسے مایوسی کے سمندر بلکہ اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔

☆ درود پاک میں ایک ایسی مٹھاس اور سکون ہے جس کے پڑھنے سے انسان پرسکون ہو جاتا ہے۔

☆ صبر کرنا ایک امتحان ہے مگر اس کا پھل بڑی مٹھاس اپنے اندر رکھتا ہے۔

☆ جھوٹ میں وقتی فائدہ تو انسان اٹھا لیتا ہے مگر جہاں جھوٹ گناہ گار بناتا ہے وہیں پر انسان کی روزی رزق بھی کم کر دیتا ہے۔

☆ کسی کی زبان کو بخش دینا سب سے بڑا بدلہ

ہے۔

فقیر بخش صابر لنگاہ......خانیوال

ایسا بھی ہوتا ہے......!!

دو ہم شکل بچے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک رو رہا تھا جب کہ دوسرا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' بچوں کی ماں نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

''کچھ نہیں امی۔'' ہنسنے والے بچے نے جواب دیا۔

''ابو نے آج دونوں مرتبہ افضل کو مارا ہے۔''

ریاض بٹ......حسن ابدال

ایک مسلمان گھرانے کا یومیہ دستور العمل

سویرے بے دار ہونا تا کہ نمازِ فجر بروقت ادا ہو۔ نمازِ فجر کے بعد مسنون اذکار کا معمول، تلاوتِ قرآن مجید۔ چھوٹے بچوں کو وقت پر نیند سے بے دار کرنا تا کہ وہ وضو، غسل، نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر بروقت اسکول یا مدرسہ جا سکیں۔ طلوعِ آفتاب کے وقت ہلکی پھلکی ورزش اور سیر کرنا تا کہ سستی دُور ہو جائے۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنا، بچے والد کے ساتھ مسجد میں جائیں اور بچیاں اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں نماز پڑھیں۔ گھر کے بزرگوں کی خدمت میں جا کر خیریت پوچھنا۔ دینی اعمال کو بخوشی بجا لانا۔ بات بات میں اللہ کی بڑائی بیان کرنا۔ گھر میں دینی کتب فضائلِ اعمال، فضائلِ صدقات، بہشتی زیور وغیرہ کی تعلیم کا اہتمام کرنا۔ بعد از عشاء جلدی سونا۔

(مرسلہ: عاطف علی......اسلام آباد)

ہر نظر پر ایک مقبول حج

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''جو نیک اولاد اپنے والدین (یا ان میں سے کسی ایک) پر شفقت و محبت سے نظر ڈالے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج (کا ثواب) عطا فرماتا ہے۔''

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا۔ ''اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر کوئی شخص روزانہ سو مرتبہ ان پر نظر ڈالے گا جب بھی ہر نظر پر اس کو یہ ثوابِ عظیم ملے گا؟'' آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔ ''ہاں۔'' اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا۔ کہ ''اللہ پاک (کی ذات) ہمارے وہم و گمان سے بالا ہے اور نہایت پاکیزہ ہے وہ ہر نقص و عیب سے پاک ہے لہٰذا ہر نظر پر یہ ثوابِ عظیم دینا اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔''

مرسلہ: اقبال احمد......وہاڑی

پڑوسی کے ساتھ نیک سلوک

اللہ تعالیٰ نے پڑوسی کے بہت حقوق رکھے ہیں۔ پڑوسی کا سب سے بڑا حق تو یہ ہے کہ اپنے ہر کام میں اس بات کا پورا خیال رکھا جائے کہ اپنی ذات سے اُس کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے علاوہ ضرورت کے موقع پر اُس کی مدد کرنا، کبھی کبھی اُس کو کچھ ہدیہ بھیج دینا، اُس کے دُکھ سکھ میں شریک رہنا۔ یہ سب باتیں موجبِ اجر و ثواب ہیں۔ اگر

وہ ضرورت مند ہو تو اُس کی مالی مدد کا بھی اہتمام کرنا چاہیے کیوں کہ پڑوسی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ معاشی اور سماجی اعتبار سے اپنا ہم پلہ ہو۔ اگر کچھ غریب لوگ اپنے پڑوس میں آباد ہیں تو وہ بھی پڑوسی ہیں اور اُن کے حقوق اس لحاظ سے زیادہ ہیں کہ ان کی خبر گیری دوسروں سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی پڑوسی بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلانا صرف موجب ثواب ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔ اسی طرح پڑوسی اگر غیر مسلم بھی ہو تب بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیے۔

(مرسلہ: حسن اختر......ناظم آباد، کراچی)

ماں

میرے سب کام میری ماں کی دعاؤں سے ہوئے
ورنہ دوزخ نہ کبھی سرد، ہَواؤں سے ہوئے

ماں! تُو میرا دل ہے، میری روح ہے...... تُو سر چشمۂ رحمت ہے...... تُو ایک آفاقی علامت ہے۔ جس میں الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے...... تُو وہ ہستی ہے۔ جس کے خلاف کچھ کہنا گناہ ہے...... کوئی بھی انسانی رشتہ، تیرے رشتے کی ہم سری نہیں کر سکتا، میں تیری محبت و شفقت اور مامتا کو کسی بھی تشبیہ، استعارے یا تمثیل سے واضح نہیں کر سکتا، لفظ و بیاں کی تمام رمزیں، لطافتیں اور بلاغتیں، تیری شفقت کی رفعت و وسعت پر قرباں۔

ماں! تُو نے میرا مستقبل سنوارنے میں ہمیشہ میری مدد کی ہے، تُو نے مجھے ہمت اور حوصلے سے زندگی گزارنے کی جرأت دی ہے...... مجھے زندگی کا شعور دیا ہے...... میرے وجود کو ظہور دیا ہے۔ تُو نے اپنے آنچل سے میرے اشک پونچھ کر، مجھے مسکرانا سکھایا اگر کبھی میں گر پڑتا تو تُو بے تحاشا دوڑ کر مجھے اٹھاتی، میری چوٹ کو چومتی...... تو پَل بھر میں میرے وجود کے سارے دُکھ چھن لیتی تھی، مجھے یاد ہے میں جب بھی بیمار پڑتا تو تیری ممتا بے چین و بے قرار ہو جاتی اور اگر کبھی میری حالت زیادہ خراب ہو جاتی تو تُو رونے لگتی۔ تیری آنکھوں سے تھرتھراتے ہوئے آنسو اور دعا کے لیے لرزتے ہوئے ہونٹ آج بھی میرے سامنے ہیں وہ آنسوؤں کا قافلہ اشکوں میں بھیگی ممتا، اب بھی مجھے یاد ہے......!

ماں! میرے خون کے ہر قطرے پر تیرا نام ہے جو اسے منجمد نہیں ہونے دیتا کہ تیری دعائیں آج بھی میرے سر پر سایہ فگن ہیں۔ میرے ذہن کی تختی پر تیرا نام کندہ ہے۔

ماں! میرے دل کے فرش پر تیری یادیں اب بھی ٹہلتی رہتی ہیں اور میں جب بھی اپنے دل کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتا ہوں اور دیکھتا ہوں تو اُس میں جو تصویر سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ تیری ہی ہے......!

ماں کے قدموں میں سکوں آج بھی ملتا ہے مجھے
ماں کی تربت سے دعاؤں کی صدا آتی ہے
(شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی)

مرسلہ: ارشد علی......اکاڑہ

خطروں کا کھلاڑی

اے حمید

محترم اے حمید کا نام نئے افق کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ وہ نئے افق' نیا رخ اور آنچل کے لیے متعدد سلسلے وار ناول' افسانے اور سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو لفظ بولتے ہیں۔ جب قاری انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے بلکہ خود اس کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ منظر کشی میں اے حمید کا کوئی ثانی نہیں۔ جب وہ بارش کے بارے میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کمرے سے باہر بوندیں برس رہی ہیں۔ جب وہ خوش بو کا تذکرہ کرتے ہیں تو قاری خود کو اس خوش بو کے ہالے میں محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر تحریر ماضی کے برما حال کے میان مار کا سفر نامہ ہے۔ آج اے حمید ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں ہمیشہ قارئین کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ آئیے خطروں کا کھلاڑی پڑھیے بلکہ محسوس کیجیے۔

ایک ایسا سفر نامہ جو آپ کو دن میں خواب دیکھنے پر مجبور کردے گا

خدا جانے یہ کس زمانے سے یہاں پڑا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے مجسمے کا رنگ کالا پڑ چکا تھا۔ گوتم بدھ اس طرح ایک پہلو پر لیٹا ہوا تھا کہ اس نے اپنے بہت بڑے سر کو اپنے بازو کی ہتھیلی کا سہارا دے رکھا تھا۔ گلہریاں اس بت پر اِدھر سے اُدھر دوڑتی رہتی تھیں۔ اونچے درختوں کی چھت والی جنگل کی یہ پتلی سی نازک اندام سڑک مجھے اتنی اچھی لگتی تھی کہ میں بہت ہی آہستہ آہستہ وہاں سے گزرا کرتا تھا۔ یہاں سبزے اور درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوش بو ہر وقت پھیلی رہتی تھی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ہر بار میرا سگریٹ پینے کو جی چاہتا تھا لیکن میں اس خیال سے وہاں کبھی سگریٹ نہیں سلگاتا تھا کہ سگریٹ کے دھوئیں سے درختوں کی پاک صاف فضا آلودہ نہ ہوجائے اور ننھی ننھی کونپلوں کا دم نہ گھٹنے لگے۔

رنگون میں دو اخباروں کا ایڈیٹر ہونے کے ناتے بھائی جان کے ملنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا لیکن ان کے ذاتی دوستوں کا ایک حلقہ الگ تھا۔ جس میں بشیر صاحب کمایٹ والے' حکیم رشید صاحب' ظہور الحسن شاہ جی' احمد رنگونی کے علاوہ حاجی رحیم بخش صاحب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ جی اور بشیر صاحب کمایٹ والے کا تعلق گجرات (پنجاب) سے تھا۔ کمایٹ نام کا ایک قصبہ رنگون سے شاید بیس پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سب دوست ہفتے میں ایک بار ایک دوسرے کو دعوت پر اپنے گھر بلاتے تھے۔

کمایٹ میں بشیر صاحب کا بڑا خوب صورت بنگلہ تھا۔ وہاں ایک طرف انہوں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ لگا رکھا تھا جہاں ربر کے فلیٹ شوز تیار ہوتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بشیر صاحب نے گجرات میں باسکو کے نام سے ایک مشہور فرم قائم کی جس نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ بھائی جان کے دوسرے دوستوں کی ہفتہ وار دعوتوں میں تو میں شاذ و نادر ہی کبھی جاتا مگر جس ہفتے کمایٹ میں بشیر صاحب کے ہاں دعوت ہوتی تو ضد کر کے میں بھی بھائی جان کے ساتھ جاتا۔

اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ بشیر صاحب کے ہاں ایک کافی بڑا ریڈیو گرام ٹائپ کا ازماسٹرز وائس کا گراموفون تھا اور ساتھ میں تھیٹرز اور رنجیت مووی ٹون کی فلموں کے ان گانوں کے ریکارڈ کافی تعداد میں تھے جو مجھے بے حد پسند تھے۔ یہ بڑا گراموفون کوٹھی کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ میں جاتے ہی گراموفون کو چابی دیتا۔ ساؤنڈ بکس میں نئی سوئی لگاتا ڈبے میں سے پنکج ملک کا گایا ہوا ''پیا ملن کو جانا'' ریکارڈ نکال کر لگا دیتا۔ اس کے بعد خورشید کے گائے ہوئے گانے۔

''پہلے جو محبت سے انکار کیا'' اور ''اب کہاں بشیرا اپنا'' کا ریکارڈ بجا کر سنتا۔ اس کے علاوہ امیر بائی کانا ٹیکی کا ایک گانا ہوتا تھا۔ ''من بھولی وفائیں یاد نہ کر'' اور سہگل کا گانا ''میں کیا جانوں کیا جادو ہے ان دو متوالے نینوں میں'' بار بار لگا کر سنتا۔ بشیر صاحب کی کمائیٹ والی کوٹھی کا گراموفون والا کمرہ اور اس کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے ناریل اور کیلے کے سر سبز درخت ہی یاد ہیں اور میرے نزدیک اس کوٹھی کی یہی دو چیزیں یاد رکھنے والی تھیں۔ ایک روز دعوت کے موقع پر بڑی بارش ہو رہی تھی۔ اس بارش میں کیلے اور ناریل کے درخت بھیگ رہے تھے۔ اس منظر کو میں کیسے بھلا سکتا ہوں۔ اگر انہیں بھلا دوں تو میرے پاس یاد رکھنے کو کیا باقی رہ جائے گا۔

❀......☆......❀

جب رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو شہر اور شہر کے مضافات اور قصبات سے تقریباً سبھی ہندوستانی برما چھوڑ کر قافلوں کی شکل میں کاکسز بازار بنگال کی جانب پیدل روانہ ہو چکے تھے۔ مگر بشیر صاحب اپنے کمائیٹ والے بنگلے پر ہی رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاسی اعتبار سے سبھاش چندر بوس کی فارورڈ بلاک پارٹی سے منسلک تھے اور جب سبھاش چندر بوس انگریزوں کے ہندوستان سے بھیس بدل کر فرار ہوا تھا تو دوراتیں بشیر صاحب کے ہاں کمائیٹ میں بھی ٹھہرا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ چنانچہ بشیر صاحب کا خیال تھا کہ جاپانی انہیں کچھ نہیں کہیں گے لیکن جیسا کہ بعد میں بھائی جان نے بتایا کہ جاپانیوں نے شروع شروع میں بشیر صاحب پر تھوڑا تشدد کیا لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ واقعی سبھاش چندر بوس کے خیر خواہوں میں سے ہیں تو انہیں ان کی کوٹھی بھی واپس کر دی اور جاپانی فوجیوں کے لیے ربر کے فلیٹ شوز بنانے کا آرڈر بھی دے دیا۔

سولی پیگوڈا رنگون شہر کا سب سے بڑا بدھ معبد تھا۔ اس کے بیٹھے ہوئے چھوٹے بڑے گنبدوں اور ان کے کلس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ سیڑھیوں کا سلسلہ اوپر مندر کے وسیع و عریض لان تک چلا گیا تھا۔ ان سیڑھیوں کی دونوں جانب برمی عورتیں بیٹھی پھول بیچتی تھیں۔ پانی سے بھری ہوئی لکڑی کی بالٹیوں میں رنگ برنگ پھولوں کے گل دستے رکھے ہوتے تھے۔ ان میں کنول کے پھول اور کنول کے پھولوں کی کلیاں بھی ہوتی تھیں اور گیندے، موتیا اور رتنا کلی کے کاسنی پھول بھی ہوتے تھے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان پھولوں کی خوش بو ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ لوگ ان عورتوں سے پھول خرید کر لے جاتے تھے اور مہاتما بدھ کی مورتیوں پر چڑھاتے تھے۔ سولی پیگوڈا کی ان سیڑھیوں پر ہی میں نے پہلی مرتبہ بیچنے والی برمی لڑکی ساتیں کو دیکھا۔ اس کا نام ساتیں تھا۔ وہ سفید ململ کی کرتی اور سبز ریشمی لہنگا پہنے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کنول کے پھول ایسا

زرد تھا۔ پھولوں کے پاس بیٹھی وہ خود ایک پھول کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

اس کے معصوم چہرے پر کنول کے زرد پھولوں ایسی گہری اداسی اور تازگی تھی۔ اس بھولی بھالی پاک صاف شفاف چہرے والی برمی لڑکی کو دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ کنول کا پھول دیکھتا بھی ہے۔ کنول کا پھول بات بھی کرتا ہے اور کنول کا پھول محبت کی باتیں سنتا بھی ہے۔ پھول محبت چاہتے ہیں، عزت و احترام چاہتے ہیں اور جب محبت میں عزت و احترام کا نور شامل ہو جاتا ہے تو وہ پھولوں کی پاکیزگیوں اور معصومیتوں سے بھی آگے بہت آگے نکل جاتی ہے۔ پھر وہ روشنی کی رفتار کے ساتھ پرواز کرتی ہے اور آسمانوں کے تمام ستارے، سیارے اور سورج اور چاند اس کے نورانی حلقے میں آجاتے ہیں۔

پھول بیچنے والی اس برمی لڑکی ساتیں کو دیکھ کر مجھے اسی نورانی محبت اور انسانیت کی عزت و احترام کا احساس ہوا تھا۔ جس طرح روشنی اندھیروں کو دور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ساتیں کے تصور نے میرے دل کے تمام منفی اور برے خیالات کے اندھیروں کو مجھ سے دور کر دیا تھا۔ ابھی تک میں نے اس برمی لڑکی، اس کنول کے زرد پھول سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابھی تک اس نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس روز میں پہلی بار رنگون کے اس عالی شان پیگوڈا کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اس معبد کا شمار رنگون کی مقدس تاریخی عمارتوں میں ہوتا تھا اور سیاح اسے دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ پیگوڈا کے کئی دالان تھے۔ ہر دالان میں جگہ جگہ مہاتما بدھ کے چھوٹے بڑے سنہرے مجسمے لگے ہوئے تھے۔ جس کے آگے عقیدت مند پھولوں کے گلدستے رکھتے اور اگر بتیاں سلگاتے تھے۔

معبد کے تین چار ہال کمرے تھے۔ ہر ہال کمرے میں گوتم بدھ کے بیٹھے ہوئے اور نیم دراز مجسمے تھے جن پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ سب سے بڑے ہال کمرے میں گوتم بدھ کا سب سے بڑا مجسمہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سارے کا سارا سونے کا ہے۔ زرد کپڑوں والے بدھ بھکشو جگہ جگہ بیٹھے گوتم بدھ کی تعلیمات کے اشلوک پڑھ رہے تھے۔ ساری فضا پر ایک تقدس چھایا ہوا تھا۔ اس معبد میں ہر عقیدے اور مذہب کے ماننے والوں کو آنے کی اجازت تھی۔

سولی پیگوڈا کی چھت کے سات قطعے تھے جو تھوڑی تھوڑی اونچائی پر بنے ہوئے تھے۔ ہر قطعے کے چار چار دالان تھے۔ لگتا تھا کہ یہ معبد ایک ٹیلے پر بنایا گیا ہے۔ تیسرے قطعے کے دالان میں ایک بہت بڑا درخت تھا جہاں چڑیوں کی چہکار گونج رہی تھی۔ ہزاروں چڑیاں درخت کی شاخوں پر اور درخت کے نیچے بیٹھی دانہ دنکا چن رہی تھیں۔ درخت کی ٹہنیوں کے ساتھ بے شمار مٹی کے پیالے لٹک رہے تھے۔ کسی میں دال چاول تھے تو کسی میں پانی بھرا ہوا تھا۔

کہتے ہیں کہ گوتم بدھ جب سچائی کی تلاش میں جنگل جنگل پھرا کرتے تھے اور کوئی انہیں کھانے کو کچھ دے جاتا تو وہ آدھا سے زیادہ کھانا چڑیوں کو ڈال دیا کرتے تھے۔ عورتیں اور بچے یہاں آکر چڑیوں کو دانہ ڈالتے تھے۔ یہاں چڑیوں نے اس قدر شور مچایا ہوا تھا کہ واقعی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

چوتھے قطعے کے دالان کی مشرقی جانب نیچے زمین پر اگے ہوئے ناریلوں کے درختوں کے جھنڈ دالان کی پتھریلی منڈیروں کو چھو رہے تھے۔ ان درختوں کے سبز کچے ناریلوں کو آپ ہاتھ سے چھو سکتے تھے مگر ان ناریلوں کو کوئی نہیں توڑتا تھا۔ وہ پک

پک کرخود بخود نیچے گر پڑتے تھے۔

میں دیر تک معبد کے دالانوں اور قطعوں میں پھرتا رہا۔ اس کے بعد واپس جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگا۔ دوسرے قطعے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نگاہیں اپنے آپ پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ایک عورت کو پھول دے رہی تھی۔ پانی کی بالٹی میں سے اس نے گیندے اور رتنا کلی کے لمبے ڈنٹھل والے پھول نکالے اور ان کا ایک گلدستہ سا بنا کر عورت کو دے دیا۔

میں سیڑھیوں کی چھوٹے چھوٹے ستونوں والی منڈیروں کے ساتھ لگ کر کھڑا پھول بیچنے والی لڑکی ساتیں کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ اس نے بھی میری طرف دیکھ لیا تو وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے گی کہ میں کتنی بدتمیزی سے اسے گھور رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنی نگاہیں ہٹانا چاہیں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھے ایسا لگا اگر میں نے ساتیں کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں تو وہ میری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گی۔ عین اسی وقت ٹوکری میں پھولوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے پھول بیچنے والی کی نگاہ مجھ پر بھی پڑ گئی۔ میں گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

میں جلدی جلدی اس قطعے کی سیڑھیاں اتر کر سب سے آخری قطعے کی سیڑھیوں پر آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن ابھی تک معمول پر نہیں آئی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے پھول بیچنے والی میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دی ہو۔ جیسے بادلوں میں ذرا سی بجلی چمک جاتی ہے۔ حقیقی محبت کی اس ننھی سی بجلی نے چمک کر میری روح کو اس کی گہرائیوں تک منور کر دیا تھا۔ مجھے اپنے سینے میں ایک ارتعاش سا محسوس ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر پھول بیچنے والی کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش کی مگر مجھے ایسا لگا جیسے میں اس دیدار کا متحمل نہیں ہو سکوں گا۔ اگر میں نے اسے دیکھا تو میری آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔

آہ! مجھے دانتے کی محبت بھری نظم کا ایک شعر یاد آ گیا۔

تو کس لیے اس خاتون سے محبت کرتا ہے
جب تو اس کے دیدار کا متحمل نہیں ہو سکتا

اس لمحے مجھے عشق حقیقی اور قلب سلیم ایک ہی شکل میں دکھائی دے رہے تھے عشق حقیقی کا مقام قلب سلیم میں ہی ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر دونوں میں سے کسی کا وجود ممکن نہیں۔ یہ میرے اس وقت کے اس چھوٹی عمر کی پاکیزہ محبتوں کے محسوسات تھے۔ ان کے نام اور ان محسوسات کے حدود واربعے سے میں بالکل ناواقف تھا۔ یہ ساری وضاحتیں، یہ ساری تشریحات اب میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔ جب میں ایک زمانہ گزر جانے کے بعد آج ان محسوسات کا تجزیہ کرنے بیٹھا ہوں۔ تجزیہ کرتے وقت عقل اور علم کو شامل حال کرنا پڑتا ہے اور محبت کے دودھ میں علم اور عقل کا پانی شامل ہو جاتا ہے اور پھر محبت کی حقیقی خوشبو تو غائب ہو جاتی ہے اور عقل اور علم کے کاغذی پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کیا خوب فرما گئے ہیں۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

برما رنگون کے بارے میں جب میں نے اپنا پہلا ناول لکھا تھا تو اس میں پھول بیچنے والی اس لڑکی ساتیں کو میں نے بطور ہیروئن پیش کیا تھا اور اس سے اظہار محبت بھی کیا تھا اور بہت باتیں بھی کی تھیں۔ ایسا میں نے ناول کے ادبی تقاضوں کے تحت کیا تھا۔ وہ فکشن تھا۔ وہاں مبالغہ آرائی کی گنجائش تھی مگر یہ میں

فکشن نہیں لکھ رہا۔ یہ حقیقی واقعات پر مشتمل سفر نامہ ہے۔ یہاں میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے سکتا۔ چنانچہ میں واقعات کو اسی پیرائے میں بیان کروں گا جس طرح وہ رونما ہوئے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے اس پھول بیچنے والی برمی لڑکی ساتیں کے معصوم چہرے کو ایک نظر دیکھنا ہی بہت تھا۔ اس ایک نگاہ کے سورج نے میری روح کو اس کی گہرائیوں تک روشن کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ روشنی میری بصارت کی برداشت سے باہر تھی۔ جسم کی روحانیت اور مجازی محبت کا شاید یہ کوئی اعلیٰ درجہ تھا۔ کوئی بلند ترین جذبہ تھا۔ جس نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ جسم نواز مگر بلند پرواز محبت کا جذبہ تھا جس نے میرے کردار کو زندگی کے عام تجربات سے بلند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں محبت کا سوز و گداز نفس انسانی کی اصلاح کرتا ہے اور انسانی سیرت کو بدل دیتا ہے۔ مجھے اس کا علمی شعور نہیں تھا لیکن چونکہ میرے دل کا آئینہ شفاف اور بغیر کدورت کے تھا اس لیے اس پھول بیچنے والی لڑکی کو ایک نظر دیکھنے میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی کے لاطینی شاعر برناڈو نے مشرق کے اسی تصور حسن و عشق سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"ایک بار اپنی محبوبہ کا جلوہ دیکھ لوں تو پھر جنت کی آرزو نہ کروں۔"

اس پھول بیچنے والی کنول کے پھول ایسی لڑکی کی محبت کے شعلے نے اچانک میرے اندر بھڑک کر میرے دل کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا تھا۔ اس وقت میں اپنی نفسیات کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی میں ان کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ آج میں اپنی اس وقت کی جذباتی حالت کا تصور کرتا ہوں تو یہی کچھ میری سمجھ میں آتا ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت میں نے اقبال اور رومی نہیں پڑھا تھا۔ اب پڑھا ہے اور مجھے رومی کا یہ شعر بے اختیار یاد آ رہا ہے۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

میں پیگوڈا کے آخری قطعے کی بھی سیڑھیاں اتر کر وہاں سے واپس اپنے فلیٹ والی لیوس اسٹریٹ کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت میرے قدم اپنے آپ سولی پیگوڈا کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اس قطعے پر آ گیا جہاں دونوں جانب پھول بیچنے والیاں بیٹھتی تھیں۔ میں دل میں فیصلہ کر کے آیا تھا کہ آج میں ساتیں سے کچھ پھول خریدوں گا۔ اس کنول کے پھول ایسی لڑکی کو قریب سے دیکھوں گا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا ساتیں پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں اور بالٹیوں کے پاس بیٹھی پھولوں کے چھوٹے چھوٹے گلدستے بنا رہی تھی۔

جیسے میں اس کی طرف بڑھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی مگر میں نے بہت جلد اپنے جذبات کو سنبھال لیا۔ اب میں ساتیں کے سامنے کھڑا پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی نے برمی زبان میں کچھ کہا۔ ساتیں کے چہرے پر گلابی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید یہ پھولوں کی شبنمی پنکھڑیوں سے طلوع ہونے والی روشنی کا عکس تھا۔ ساتیں نے کچھ ہندوستانی یعنی اردو اور کچھ اپنی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ کون سے پھول پسند کروں گا۔ میں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ لکڑی کی بالٹی میں رکھے ہوئے کنول کے گلابی پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ ساتیں نے بالٹی میں سے کنول کے تین چار پھول نکال کر ان کے گرد دھاگا لپیٹا اور میری طرف بڑھائے۔

میں نے پوچھا۔ "کتنے پیسے......؟"

اس نے کچھ پیسے بتائے۔ میں نے اسے دے دیے۔ ساتیں نے مسکراتے ہوئے ذرا سا سر جھکا کر میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ میں کنول کا گلدستہ لیے پیگوڈا کے پہلے دالان میں آ کر ناریل کے درختوں والی منڈیر کی طرف آ گیا۔ ساتیں کی آواز کا ترنم ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے منڈی پر ایک طرف کر کے پھول رکھ دیے اور کچھ دیر دالان میں پھرتا رہا۔ پھر واپس جاتے ہوئے ساتیں کے قریب سے ہو کر سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ ساتیں کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ ذرا سی مسکرائی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ ذرا سی بجلی چمکی اور پھر بادل چھا گئے۔

میں نے روز پیگوڈا جانا شروع کر دیا اور روز ساتیں سے کنول کے پھول خریدتا اور اس کی آواز سنتا۔ اس کے روشن اور پھولوں کی طرح شگفتہ چہرے کا دیدار کرتا اور اوپر جا کر پیگوڈا کے کبھی دوسرے اور کبھی تیسرے قطعے کے دالان میں ادھر اُدھر پھرتا رہتا۔ معبد میں جا کر پھولوں کا گلدستہ واپس لے جانا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں کبھی کسی منڈیر پر اور کبھی کسی درخت کے پاس پھول رکھ کر واپس چل پڑتا۔

واپسی پر سیڑھیاں اترتے ہوئے ساتیں کے قریب سے گزرتا تو دل کی دھڑکن تیزی ہو جاتی۔ کبھی وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتی اور کبھی اپنے کام میں لگی رہتی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جب میں ساتیں سے پھول خرید رہا ہوتا ہوں تو دوسری پھول بیچنے والیاں مجھے گھور کر دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ شاید انہیں شک پڑ گیا تھا کہ میں ہر روز ساتیں سے ہی پھول خریدتا ہوں تو ضرور میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

اس کے بعد میں ایک دن چھوڑ کر جانے لگا اور دوسری عورتوں سے بھی پھول خرید لیتا تھا لیکن دوسری پھول بیچنے والیوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ سمجھ گئی ہیں کہ میں صرف ساتیں کو دیکھنے وہاں آتا ہوں۔ میری وجہ سے کوئی اس معصوم پھول بیچنے والی لڑکی ساتیں پر اس قسم کا گمان دل میں لائے۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں نے پیگوڈا جانا ترک کر دیا لیکن دل میں پھول بیچنے والی لڑکی ساتیں کا خیال برابر لگا رہا۔ تین دن بڑی کشمکش میں گزارے چوتھے دن قدم اپنے آپ پیگوڈا کی طرف اٹھنے لگے۔

پہلے قطعے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر آیا تو نگاہیں ساتیں کو تلاش کرنے لگیں۔ سب پھول بیچنے والیاں موجود تھیں مگر وہ جس کو میری نظریں تلاش کر رہی تھیں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں خاموشی سے سر جھکائے دوسرے قطعے کی سیڑھیاں چڑھ کر پیگوڈا کے پہلے دالان میں آ کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

آج میں نے کوئی پھول نہیں خریدے تھے۔ جس سے پھول خریدنے تھے، جس کے لیے پھول خریدنے تھے جب وہ ہی نہیں تھی تو پھر پھول کس کے لیے خریدتا؟ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ ساتیں یہیں کہیں ادھر اُدھر ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد آ جائے گی۔ جب مزید انتظار کی طاقت نہ رہی تو اٹھ کر سیڑھیاں اترنے لگا دور سے دیکھا۔ ساتیں دکھائی نہ دی۔ میں نے کسی کو نظر اٹھا کر نہ دیکھا سر جھکائے سیڑھیاں اتر کر سولی پیگوڈا چوک میں آ گیا۔

کس سے پوچھتا کہ پھول بیچنے والی آج کیوں نہیں آئی؟ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ وہ خیریت سے تو ہے؟ سارا دن اداس اداس سا پھرتا رہا۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ رنگون سے باہر تھوڑے فاصلے پر جھیلوں کا سلسلہ تھا جس کی جھیلیں ایک دوسری کے

ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ ان جھیلوں کے کنارے کنارے سفید، زرد اور ہلکے قرمزی رنگ کے کنول کے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں وہاں جا کر جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گیا۔

اس روز ساتیں کا دیدار نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری محبت جو امرتسر میں مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ رنگون میں ساتیں کی شکل میں مجھے دوبارہ مل گئی تھی مگر وہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہوگئی ہے۔ چھوٹی عمر کی محبتوں کے اثر بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ ہر جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے اور وارث شاہ کیا درست کہہ گئے ہیں۔

چھوٹی عمر دیاں یاریاں بہت مشکل
پتر مہراں دے مجھیاں چار دے نی

جب سورج غروب ہونے لگا تو میں اخبار "شیر رنگون" اور "مجاہد برما" کے دفتر میں آ گیا۔ بھائی جان اپنی میز پر بیٹھے تیز تیز قلم چلاتے ہوئے شاید اداریہ یا ادارتی نوٹ لکھ رہے تھے۔ ظہور شاہ جی اپنی میز کے پہلو میں آرام دہ کرسی پر بیٹھے اخبار کی کاپیاں دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ حقہ بھی پی رہے تھے۔ دفتر کا اسٹاف اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ میں شاہ جی کے پاس بیٹھ گیا۔ جب وہ کاپیاں دیکھ چکے تو حقے کے دو ایک کش لگا کر مجھ سے علامہ اقبال کا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میری آواز اچھی تھی۔ موسیقی سے لگاؤ بھی تھا۔ میں علامہ اقبال کا کلام ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ شاہ جی مجھ سے علامہ اقبال کی ایک غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا
عام دیدارِ یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا
وہ راز اب آشکار ہوگا

بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں علامہ اقبال کی ساری غزل جو مجھے زبانی یاد تھی ترنم سے سنائی۔ وہ بڑے انہماک سے حقہ بھی پیتے رہے اور اقبال کا کلام بھی سنتے رہے۔

❀......☆......❀

شاہ جی کے حقے کے لیے سوکھا تمباکو خاص طور پر گجرات سے آیا کرتا تھا۔ اس تمباکو کی مخصوص خوش بو دفتر میں پھیلی رہتی تھی۔ شاہ جی ایک بار جنگ کے حالات پر رنگون ریڈیو کے اردو پروگرام میں تقریر کرنے گئے۔ انہیں ریڈیو پر چھ تقریروں کا ایک سلسلہ پورا کرنا تھا۔ اس روز ان کی پہلی تقریر تھی۔ میں بھی ڈیوٹی روم میں موجود تھا۔ شاہ جی کی تقریر کا دورانیہ پانچ منٹ تھا۔ انہوں نے السلام علیکم سے تقریر شروع کی اور اس جملے پر تقریر ختم کی کہ "اس موضوع پر ان شاء اللہ اگلی بار تفصیل سے بات کی جائے گی۔" ان دنوں پروگرام کی ریکارڈنگ کا رواج نہیں تھا۔ تقریر جوں کی توں براڈ کاسٹ ہوتی تھی۔ اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر میکاؤ نے شاہ جی سے کہا کہ ریڈیو رنگون کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے اس لیے آپ تقریر شروع کرنے سے پہلے السلام علیکم اور آخر میں ان شاء اللہ نہ بولا کریں تو شاہ جی نے کہا۔

"آپ اپنی پالیسی اور پروگرام اپنے پاس ہی رکھیں میں السلام علیکم اور ان شاء اللہ ضرور کہوں گا۔"

اور شاہ جی نے اس کے بعد ریڈیو رنگون کا کبھی رخ نہ کیا۔ اخبار "شیر رنگون" اور "مجاہد برما" کے خوش نویس حضرات کا تعلق بھی زیادہ تر پنجاب کے ضلع گجرات سے تھا۔ اسرائیل احمد اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ جن کا تعلق صوبہ بہار سے تھا اور جو کلکتہ کے اخبار "عصر جدید" میں بھی کام کر چکے تھے۔

عبدل نامی منشی ضلع بدایوں کے رہنے والے

تھے۔ یہ سب لوگ ایک عرصے سے رنگون میں آباد تھے۔ ایک روز انہوں نے بھائی جان سے کہا۔

”جناب! مجھے ایک ماہ کی رخصت عنایت کیجیے وطن کی یاد بہت ستانے لگی ہے۔ کچھ روز وہاں رہ لوں گا تو طبیعت سنبھل جائے گی۔“

عبدل صاحب چھٹی لے کر ایک روز بحری جہاز میں سوار ہو کر اپنے وطن روانہ ہو گئے۔ جس روز وہ گئے اسی روز شام کو شاہ جی نے بھائی جان سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ عبدل میاں کو وطن کی مٹی نے بلایا ہے۔“

اور ان کا کہنا درست ثابت ہوا۔ عبدل کے جانے کے دو ہفتے بعد وطن سے ان کی بڑی بیٹی کا خط آیا کہ ابا میاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کسی آتے جاتے کے ہاتھ ان کا سامان بھجوا دیجیے گا۔ مارچ کے مہینے سے لے کر اکتوبر نومبر تک رنگون میں بڑی بارشیں ہوتی تھیں۔ لمبی لمبی جھڑیاں لگتیں اور سورج کئی کئی دن نظر نہیں آتا تھا۔

بارشوں میں کیلے‘ ناریل‘ آم کے درخت ہرے بھرے ہو جاتے اور باغوں‘ پارکوں کا سبزہ نکھر جاتا تھا۔ بارش میں برمی لڑکے بازاروں اور گلیوں میں بانس کے بنے ہوئے فٹ بال کھیلتے نظر آتے تھے۔ سڑکوں کے کنارے اور باغوں میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جسے سبزے نے نہ ڈھک دیا ہو۔ فٹ پاتھوں پر سایہ کیے ہوئے درخت ہر وقت گیلے گیلے رہتے تھے اور ان میں رکے ہوئے بارش کے پانی کی بوندیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ شہر کے ہر فٹ پاتھ پر گھنے درخت سایہ کیے ہوئے تھے۔ باغوں میں نرم نرم گھاس کے خوشے مرطوب ہوا میں لہرایا کرتے۔ شہر سے باہر نکلتے ہی دریا کی دونوں جانب دھان کے سرسبز کھیتوں‘ بانس‘ سپاری‘ ساگوان اور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے گنجان سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔ یہاں سبز جھیلوں کے آئینے میں کنول کے پھول اپنا حسن و جمال دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر کیلے کے درختوں کے درمیان ہو کر گزرنے والی پگڈنڈیوں کی زمین بارشوں میں شروع ہو جاتی تھی۔ تیز بارشوں میں جھیلوں کی سطح پر ہلکی ہلکی دھند چھا جاتی اور کنول کے پھول سر جھکا کر اپنی مخملیں نازک پنکھڑیاں سمیٹ لیتے۔

بارش...... بارش...... بہت جلد رنگون پر جاپانی بموں کی بارش ہونے والی ہے۔ جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کے خلاف 2 دسمبر 1941ء میں جنگ کا اعلان کیا تھا اور جاپانی فوجیں سیلاب کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے سنگاپور‘ فلپائن اور ملایا پر چھا گئی تھیں۔ اب ان کے سامنے برما کا ملک تھا۔ جاپانیوں نے 24 دسمبر 1941ء کو رنگون پر پمفلٹ گرائے جس پر لکھا تھا کہ ہم آپ کو کرسمس کا ایک خاص تحفہ دینے والے ہیں اور دوسرے دن جاپانی بمبار اور لڑاکا طیارے رنگون کے آسمان پر نمودار ہوئے اور انہوں نے ریڈیو اسٹیشن‘ بندرگاہیں‘ فوجی تنصیبات کے علاوہ شہر پر بھی اندھا دھند بم باری اور فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بم باری سے رنگون شہر کی بیشتر عمارتیں زمیں بوس ہو گئیں اور جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ بندرگاہ پر ایک تیل بردار جہاز کھڑا تھا۔ جاپانی طیاروں نے اسے نشانہ بنایا۔ جہاز میں آگ لگ گئی اور سارے شہر پر کالی گھٹا کی طرح دھواں چھا گیا۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ دوسری یا شاید تیسری بم باری کے بعد شہر سے ہندوستانی آبادی کا انخلا شروع ہو گیا تھا۔ برما رنگون میں مسلمانوں کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ ان میں گجرات کاٹھیاواڑ کے سورتی میمن بھی تھے اور پنجاب کے تاجر پیشہ اور ٹھیکیدار بھی تھے۔ برمی خود تو کاہل لوگ تھے اور زیادہ محنت سے جی

چراتے تھے۔ بڑے آرام طلب تھے لیکن باہر سے آئے جن لوگوں نے خاص طور پر پنجابیوں نے اپنی شبانہ روز محنت سے رنگون میں اپنے کاروبار کو وسیع کیا تھا اور وہاں جائیدادیں بنائی تھیں۔ برمی لوگ ان کے دشمن بن گئے تھے کہ ان لوگوں نے باہر سے آ کر ہمارے کاروبار پر قبضہ کر لیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ برمی خود دست الوجود تھے اور ان کے مقابلے میں پنجاب کے مسلمان جفاکش اور محنتی تھے۔

رنگون سے ان لوگوں کے انخلا کی ایک وجہ تو برمی لوگوں کی ان کے ساتھ دشمنی تھی اور برمیوں نے سورتی میمن اور پنجابی مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رنگون میں انگریزوں کا دفاع اور فوجی طاقت جاپانی یلغار کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ جاپانی لڑاکا طیاروں اور بمبار طیاروں کا مقابلہ کرنے کے لیے رنگون کے ہوائی اڈے سے انگریزوں کی رائل ایئر فورس کا ایک بھی جہاز نہیں چڑھا تھا۔ چنانچہ غیر برمی شہری آبادی اپنی دکانیں‘ گھر اور جائیدادیں چھوڑ کر جنگل کی طرف پیدل چل پڑے تھے۔

یہ سن 47ء سے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی ہجرت تھی۔ یہ لوگ ہزاروں‘ لاکھوں کی تعداد میں اپنے بال بچوں سمیت لٹ پٹ کر کسمپرسی کی حالت میں رنگون سے نکلے تھے۔ ان کے اپنے آپ ہی چھوٹے بڑے قافلے بن گئے تھے۔ ان کی منزل کاکسز بازار اور چٹاگانگ تھی جہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریزوں کی برٹش انڈیا فوج خود بھاگ گئی تھی۔ ان بے یار و مددگار لوگوں کو کون پوچھتا۔

لکھ پتی ایک ہی دن میں مفلس ہو گئے تھے۔ لاکھوں کے مال سے بھری ہوئی ان کی دکانوں اور گوداموں پر برمیوں نے یا قبضہ کر لیا تھا یا لوٹ کر لے گئے تھے۔ انہیں بنکوں سے اپنی رقوم نکلوانے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ جو گھر میں یا پاس (پلے) تھا اسی کو لے کر نکل پڑے تھے۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بھائی جان تھے‘ ہمشیرہ تھیں۔ باری علیگ تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی تھی۔ باری صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ کی گود میں ڈیڑھ سال کی بچی تھی جس کا نام سعیدہ تھا۔ شاہ جی تھے۔ اخبار کے اسٹاف کے کچھ لوگ تھے۔ اللہ توکل یہ قافلے چل پڑے تھے۔ کوئی راہ نما نہیں تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ اس طرف جنگل شروع ہوتا ہے اور اسی جانب بنگال اور کاکسز بازار ہے۔ اپنے آپ قافلے کا ایک راستہ بن گیا تھا۔ ہمارے آگے بھی کئی قافلے پیدل چل رہے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ سب سے آگے جو قافلے تھے انہیں جنگل میں جنگلی پھلوں کے جو درخت اور پانی کے چشمے مل جاتے وہ ان پھلوں اور چشمے کے پانیوں سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی بھوک اور پیاس مٹاتے رہتے۔ جب پچھلے قافلے وہاں پہنچے تو درختوں پر ایک بھی پھل نہیں ملتا اور چشمے سوکھ گئے تھے یا پانی ان کی تہ میں بیٹھ گیا تھا۔ لوگ بھوکے اور پیاسے مرنے لگے۔

بچوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ ہم لوگ گرتے پڑتے برما کے گنجان اور خطرناک جنگلوں میں پندرہ دن تک پیدل سفر کرنے کے بعد جنگل میں ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بھائی جان کے ایک دوست کا جنگلی درختوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ ان کا نام عبدالعزیز مجھے یاد رہ گیا ہے۔ یہاں ان کی جنگلی لکڑی کی چیرائی کی بہت سی آرا مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ عبدالعزیز صاحب بڑے امیر کبیر آدمی تھے اور پنجاب کے ہی رہنے والے تھے۔ جنگل میں انہوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک ڈاک بنگلہ بنا رکھا تھا۔

عبدالعزیز صاحب نے ہماری بہت آؤ بھگت کی۔ بھائی جان چونکہ حکومت برما کے ملازم بھی تھے اور ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے اور ریڈیو رنگون سے جاپانیوں کے خلاف پراپیگنڈا بھی کرتے رہے تھے اس لیے انہوں نے اپنا حلیہ بدلا ہوا تھا اور سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی تاکہ جاپانی انہیں پہچان نہ سکیں اور دیہاتی مزدور ٹائپ آدمی سمجھ کر چھوڑ دیں۔ کیونکہ سارے برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور کوئی پتا نہیں تھا کہ جنگل میں کہاں کہاں جاپانی فوج تعینات ہے۔ جنگلاتی لکڑی کے ٹھیکیدار عبدالعزیز صاحب کے پاس ہم لوگ دس بارہ روز رہے۔ یہاں باری علیگ صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ جب بھائی جان اور عبدالعزیز صاحب نے بتایا کہ آگے ایک دن اور ایک رات کا سمندر کا سفر ہے جو ایک کشتی کے ذریعے کرنا پڑے گا۔ باری علیگ صاحب چھوٹی کشتی میں ایک رات اور ایک دن کا سفر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی بیگم صاحبہ اور بچی کو لے کر ایک دوسرے قافلے میں شامل ہو گئے جو جنگل جنگل خشکی کا ایک بہت لمبا راستا طے کر کے کاکسز بازار جا پہنچا تھا۔

کہنے کو تو ہم لوگ بھی بنگال میں کاکسز بازار کی طرف جا رہے تھے لیکن یہ سفر خطرناک، گنجان اور ہاتھیوں، شیروں اور سانپوں اور مہلک حشرات الارض سے بھرے ہوئے جنگلوں کا سفر تھا اور ہم لوگ پیدل جا رہے تھے۔ عبدالعزیز صاحب کا ارادہ ہجرت کا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں یہیں رہوں گا۔ جاپانی آ گئے تو میں انہیں لکڑی سپلائی کروں گا وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔

انہوں نے ہمیں بھی اپنے ڈاک بنگلے والے مکان میں رک جانے کو کہا لیکن بھائی جان یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ جاپانی انہیں انگریزوں کا سرکاری افسر ہونے اور رنگون ریڈیو پر اپنے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے جرم میں پکڑ بھی سکتے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ عبدالعزیز صاحب کے ڈاک بنگلے سے آگے روانہ ہو گئے۔ ایک دن جنگل میں پیدل سفر کرنے کے بعد سمندر آ گیا۔ یہ خلیج بنگال کے کالے پانی کا سمندر تھا۔ رات ہم نے وہیں آرام کیا۔ صبح ایک ذرا بڑی مگر خطرناک کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں روانہ ہو گئے۔

چاروں طرف سیاہ کالا سمندر، سمندر کی بڑی بڑی موجیں جو اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ سمندر پرسکون تھا مگر اس کی وسعت اور اوپر نیچے ہوتی موجوں کو دیکھ کر خوف طاری ہوتا تھا۔ کشتی بھی سمندری موجوں کے ساتھ ہچکولے کھا رہی تھی۔ سارا دن اور ساری رات سمندر میں ہمارا سفر جاری رہا۔ دوسرے دن طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد کنارا نظر آیا تو جان میں جان آ گئی۔ یہاں سے اکیاب تک چار دن کا پیدل سفر تھا۔

جنگل کے ٹھیکیدار عبدالعزیز نے بہت سا خشک راشن ہمارے ساتھ کر دیا تھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ جنگل میں ایسے گاؤں بھی آئے جہاں برمی لوگوں نے قافلے والوں کو کیلے اور بھنے ہوئے چنے کھانے کو دیے۔ قافلوں کا خود بخود ایک روٹ بن گیا تھا۔ اس روٹ پر ایسا بھی ہوا کہ درختوں میں سے اچانک ڈاکوؤں نے نکل کر قافلے پر حملہ کر دیا اور لوگوں کے پاس جو تھوڑی بہت نقدی رہ گئی تھی وہ لوٹ کر لے گئے۔

بعض جگہوں پر یہ بھی سنا کہ ڈاکو ایک دو عورتیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ قافلہ ایک گاؤں میں سے گزرا تو جنگلی لوگ اور ان کی عورتیں ہاتھوں میں کیلے کے گچھے اور بھنے ہوئے چنوں کے تھیلے پکڑے کھڑے ہیں۔ ستم رسیدہ

قافلے والوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اس طرح ہمیں بھی جنگل میں ایک جگہ ایک نیک دل جنگلی مل گیا۔ وہ ہمیں اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ ہمیں کھانے کو ابلے ہوئے نمکین چاول دیے اور چائے بنا کر لے آیا۔ چائے میں دودھ ملا ہوا تھا۔ بھائی جان بڑے حیران ہوئے کہ وہاں کوئی بکری اور گائے بھینس بھی نظر نہیں آ رہی تھی پھر یہ شخص چائے کے لیے دودھ کہاں سے لایا ہے۔

تم نے چائے میں دودھ ڈالا ہے۔ یہ تم کہاں سے لائے ہو؟ کیونکہ یہ ناریل کا دودھ بھی نہیں تھا۔ جنگلی آدمی کے پاس اس کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا کہ یہ میری بیوی کا دودھ تھا۔ افسوس کہ اس وقت تک ہم چائے پی چکے تھے۔

برما کے گنجان جنگل سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ پہاڑی جنگل بھی تھے اور میل ہا میل تک میدانی جنگل بھی تھے۔ ان جنگلوں میں دریا بہتے تھے۔ ندیاں اور جھیلیں تھیں۔ جان لیوا دلدلی میدان بھی تھے۔ دشوار گزر جنگلی اور پہاڑی راستے تھے۔ ایسے تالاب بھی تھے جن کی سطح کنول کے خوب صورت پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں لیکن ان تالابوں میں آدمی کے جسم سے چمٹ کر خون پی جانے والی جونکیں بھی تھیں۔ ان تالابوں میں اگر کوئی انسان یا جانور گر پڑتا تھا تو لاکھوں جونکیں اس کے جسم سے چمٹ کر دیکھتے دیکھتے ہی اس کا سارا خون پی جاتی تھیں۔ بارشیں اتنی ہوتی تھیں کہ راستے جل تھل ہوجاتے تھے۔ رات کے وقت جھینگروں کے ساتھ سانپوں کی پھنکاریں بھی سنائی دیتی تھیں۔

ایسے دریا اور کشادہ ندی نالے تھے جن کے اوپر کوئی پل نہیں تھا۔ درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر کے بنائی گئی کشتیوں میں بڑے بڑے دریا اور ندی نالے عبور کرنے پڑتے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں سے سبز رنگ کے باریک سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ یہ اتنے گھنے، ڈراؤنے اور دشوار گزار جنگل تھے کہ ان کو دیکھ کر ہی بدن پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم کبھی ان جنگلوں کو پار کر کے بنگال پہنچ سکیں گے۔

جنگلوں کے بارے میں میرا تصور بڑا خوب صورت تھا۔ میں اس سے پہلے یہی جانتا تھا کہ جنگل ایک ایسی جگہ ہے جہاں کنول کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیلیں ہوتی ہیں۔ جنگلی پھولوں سے لدے ہوئے درخت ہوتے ہیں۔ شفاف میٹھے پانیوں کے چشمے بہتے ہیں۔ گنگناتے جھومتے جھرنے ہوتے ہیں۔ درختوں پر چڑھی ہوئی پھولوں بھری بیلیں ہوتی ہیں۔

برما کے جنگلوں نے میرے اس تصور کو خال میں ملا دیا تھا۔ یہ ایسے خوفناک اور قاتل جنگل تھے کہ جہاں میلوں تک پینے کا پانی نہیں ملتا تھا اور آدمی پیاسا مرجاتا تھا۔ کہیں کہیں جنگلی سبز کیلے کے درختوں کے جھنڈ آجاتے تھے۔ اس کے بعد آدمی صرف درختوں کے پتے اور جھاڑیوں کی جڑیں کھا کر ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ جہاں برساتی چھپڑ ہوتے تھے وہاں کنکھجورے بچھو اور سانپ بھی کثرت سے ہوتے تھے۔

ان برساتی پانی کے تالابوں میں لاکھوں جونکیں انسان کا خون پینے کے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ رات کو مکھیوں جتنے بڑے مچھر حملہ آور ہوجاتے تھے۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ ان جنگلوں میں آدم خور پودے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ کانٹے دار پودے ہوتے ہیں۔ آدمی قریب سے گزرے تو یہ کانٹے دار خونی ٹہنیاں اسے دبوچ لیتی ہیں اور اپنے ہزاروں کانٹے اس کے جسم میں چبھو کر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا خون پی کر اور گوشت کھا کر اسے ہڈیوں کا پنجر بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد میرا سری لنکا اور وسطی ہند کے گھنے جنگلوں میں گزرنے کا اتفاق بھی ہوا لیکن ان علاقوں کے جنگل برما کے جنگلوں کے مقابلے میں اتنے خونخوار نہیں تھے۔ برما کے جنگلوں میں پیدل سفر کرتے ہوئے کبھی کبھی ہاتھیوں کے غول ضرور جنگل سے نکل کر دوسری طرف نکل جاتا تھا۔ ایک بار اس راستے میں دو دیوہیکل قسم کے ہاتھی آ کر بیٹھ گئے۔ جس پر سے مہاجرین کا قافلہ گزر رہا تھا۔ قافلے والے ان ہاتھیوں سے بچ کر جنگل کے پہلو سے ہو کر گزرنے لگے۔

رات کو کبھی کبھی شیر کے دہاڑ سنائی دے جاتی لیکن چونکہ جنگل میں انسانوں کے ہجوم در ہجوم گزر رہے تھے اس لیے جنگلی جانور اس طرف نہیں آتے تھے۔ سیکڑوں لوگ بھوک پیاس اور سانپوں کے ڈسنے سے مر گئے۔ پیدل سفر کرتے ہوئے انسانوں کی بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

یہ وہ تھے جن کا کوئی وارث نہیں تھا اور اکیلے ہی قافلے کے ساتھ چل پڑے تھے۔ کسی خاندان کا کوئی آدمی بیماری سے مرجاتا تو اسے وہیں زمین کھود کر دفن کر دیا جاتا تھا۔

کئی دفعہ اوپر سے جاپانی طیارے گزرے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے قافلے والوں پر نہ تو بم باری کی نہ فائرنگ کی۔ شاید اس لیے جاپانیوں کو معلوم تھا کہ یہ لوگ زندہ حالت میں بنگال نہیں پہنچ سکیں گے۔ لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے۔ انسان انسان سے بے زار ہوگیا تھا۔ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے انسان خودغرض بن گیا تھا۔ خودغرضی اور نفسانفسی کے ایسے ایسے عبرت ناک منظر دیکھنے میں آئے کہ یقین نہیں آتا تھا کہ انسان اس حد تک بھی پہنچ سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی ہمدردی کے ایسے مظاہرے بھی دیکھے کہ ایک انسان نے اپنی بوتل میں بچا ہوا پانی ایک پیاسے بچے کو پلایا اور خود خالی بوتل پھینک کر آگے چل پڑا۔

ہم بھی گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح اکیاب پہنچ گئے۔ اکیاب بڑا مختصر مگر صاف ستھرا شہر تھا۔ یہاں کے بعض مخیّر اور انسان دوست لوگوں نے مہاجرین کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اکیاب میں بھائی جان کے ایک دوست رہتے تھے۔ ان کی شہر میں چمڑے کے جوتوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ یہ صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ انہوں نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ ہم ان کے مکان پر چھ سات روز رہے۔ ہماری بگڑی ہوئی صحت کسی حد تک بحال ہوگئی۔ ہم نے نئے کپڑے اور نئے جوتے خرید کر پہنے۔ اکیاب سے آگے ایک بہت بڑا دریا تھا۔

یہ دریا بالکل سمندر کی طرح تھا۔ اس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ دریا ہم نے ایک پرانے سٹیمر میں عبور کیا اور بوتھی ڈانگ پہنچے۔ بوتھی ڈانگ برما کے مغربی ساحل پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جو چاول اور ساگوان کی لکڑی کی بہت بڑی منڈی تھی۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ رنگون پر پہلی بم باری کے بعد میں رنگون کے سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پھول بیچنے والی لڑکی ساتیں کو دیکھنے اور اس کی خیر خیریت معلوم کرنے پیگوڈا گیا تھا تو وہ مجھے وہاں نہیں ملی تھی۔ مگر ایک بوڑھی برمی عورت نے جو شکستہ اردو بول رہی تھی مجھے بتایا تھا کہ ساتیں موسی کے گاؤں چلی گئی ہے جو بوتھی ڈانگ سے تین کوس مشرق میں واقع ہے۔ اس خیال نے جیسے میرے قدم پکڑ لیے۔ اب میرے سر پر محبت کا بھوت پھر سے سوار ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ

یہاں سے میں آگے چٹا گانگ نہیں جاؤں گا۔

بوتھی ڈانگ سے ہر ہفتے ایک اسٹیمر لکڑیاں اور چاول لے کر چٹا گانگ جاتا تھا۔ بھائی جان وہاں بندرگاہ پر ہی ٹھہر گئے تھے اور اسٹیمر کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ اسٹیمر تین یا چار دن میں چٹا گانگ پہنچا تھا۔ اگرچہ بندرگاہ کے آدمیوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جاپانی اوپر آسام تک پہنچ گئے ہیں اور کوئی پتا نہیں چٹا گانگ سے اسٹیمر چاول وغیرہ لینے آئے یا نہ آئے اور اگر آئے تو واپس جانے کے بجائے یہیں رہ جائے کیونکہ جاپانی آبدوزیں اور ان کے تباہ کن چھوٹے جہاز خلیج بنگال میں دیکھے گئے تھے۔ اس کے باوجود بھائی جان ہم کو لے کر وہاں بیٹھ گئے تھے اگر اسٹیمر آ گیا تو اس کے کپتان کو پیسوں کا لالچ دے کر واپس جانے پر آمادہ کرلیں گے۔

میں نے ساتیں کا خیال آتے ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ میں یہاں ان لوگوں سے الگ ہو جاؤں گا اور سب سے پہلے اپنی محبوبہ ساتیں سے ملنے اس کے گاؤں جاؤں گا اور اس سے مل کر اگر واپس جانے کو دل چاہا تو بوتھی ڈانگ آ کر کوئی دوسرا اسٹیمر پکڑ کر چٹا گانگ چلا جاؤں گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو ہی گیا تھا کہ بوتھی ڈانگ سے ہر ہفتے ایک اسٹیمر چٹا گانگ جاتا ہے۔ قسمت میں محبت کے ہاتھوں جو سختیاں اور مصیبتیں اٹھانی لکھی تھی انہیں کون ٹال سکتا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ ان لوگوں سے کس طرح الگ ہونا چاہیے۔ ظاہر تھا کہ اگر میں انہیں کہتا ہوں کہ میں ساتیں سے ملنے جاؤں گا اور ان کے ساتھ چٹا گانگ نہیں جانا چاہتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بھائی جان مجھے اس کی اجازت دیتے۔ بس ایک ہی طریقہ تھا کہ چپکے سے وہاں سے کھسک جاؤں۔

بھریا میلہ چھوڑ کر کھسک جانے کی مجھے شروع ہی سے عادت تھی اور محبت کے معاملے میں تو میں نے ہمیشہ جذبات کا ساتھ دیا تھا۔ عقل سے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ بلکہ میرا تو یہ عقیدہ تھا کہ محبت ہوتی ہی اس وقت ہے جب عقل آدمی کا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ ابھی اسٹیمر کے پہنچنے میں تین چار دن باقی ہیں۔ اگر اس وقت میں بھاگ گیا تو یہ لوگ کسی نہ کسی طرح میرے پیچھے نکل پڑیں گے اور مجھے تلاش کریں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جس روز اسٹیمر آنے والا ہوگا اس روز چپکے سے جنگل کی طرف کھسک جاؤں گا۔

میں برما کے جنگلوں سے خوب واقف ہو چکا تھا اور جس طرف برمی عورت نے ساتیں کا گاؤں بتایا تھا اسی طرف سے رنگون کے مہاجرین کے قافلے آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ علاقہ انسانوں سے خالی نہیں ہوگا اور یہاں جنگلی جانوروں کا بھی ڈر نہیں ہوگا۔

چوتھے روز شام کے وقت چٹا گانگ جانے والا اسٹیمر آ گیا۔ اسے دوسرے دن صبح کے وقت واپس چٹا گانگ جانا تھا۔ ساری رات اسٹیمر پر چاول کی بوریاں اور لکڑیوں کے بڑے بڑے شہتیر لادے جاتے رہے۔ کافی بڑا اسٹیمر تھا۔ مجھے تو وہ جہاز لگ رہا تھا۔ بھائی جان اسی وقت ٹکٹ خریدنا چاہتے تھے لیکن اسٹیمر کے بنگالی کیپٹن نے کہا۔

"ابھی کچھ معلوم نہیں اسٹیمر صرف سامان لے جائے گا یا مسافروں کو بھی لے جائے گا؟"

دوسرے دن اسٹیمر کے کپتان نے بھائی جان سے مل کر کہا کہ وہ کچھ مسافر واپس لے جا رہے ہیں۔ آپ کی فیملی کو بھی لے جائیں گے۔ ٹکٹ آپ کو اسٹیمر پر بیٹھنے کے بعد ایشو کیے جائیں گے۔ اگلے دن میں نے بڑی ہمشیرہ سے کچھ پیسے لے کر اپنے پاس رکھ لیے کہ ساتیں سے مل کر اور اس کی خیریت معلوم کر کے جب واپس بوتھی ڈانگ آؤں گا تو دوسرے شہر کے ٹکٹ کے پیسے میرے پاس ہونے چاہئیں۔ میں کچھ اور پروگرام بنا رہا تھا اور میری تقدیر کچھ اور ہی پروگرام بنا چکی تھی۔

بھائی جان وغیرہ اسٹیمر پر سوار ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ میں موقع پا کر وہاں سے کھسک آیا۔ بوتھی ڈانگ میں ہم تین چار دن رہے تھے۔ اس دوران میں نے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ مشرق کی جانب ایک گاؤں ضرور ہے مگر اس کا فاصلہ وہاں سے تین میل سے زیادہ ہے اور راستے میں ایک دریا پڑتا ہے جس پر کوئی پل وغیرہ نہیں ہے۔ مگر محبت پل کے ذریعے دریا پار نہیں کیا کرتی۔ محبت تو کچے گھڑے کو لے کر دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ میں جب تک بوتھی ڈانگ کے بازار میں رہا وہاں آہستہ آہستہ چلتا رہا لیکن جیسے ہی بازار ایک ویران راستے کو مڑا میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ جب میں نے دیکھا کہ میں دھان کے کھیتوں میں آ گیا ہوں اور ارد گرد کوئی انسان نہیں ہے تو میں نے دوڑنا شروع کردیا۔ میں اتنی دور نکل جانا چاہتا تھا کہ اگر بھائی یا کوئی اور شخص مجھے تلاش کرتا اس طرف نکل آئے تو میں انہیں دکھائی نہ دوں۔ دھان کے کھیت ختم ہوئے تو بانس کے درختوں کے جھنڈ شروع ہو گئے۔ اب میں دوڑنے کے بجائے جتنی تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا۔ چلنے سے پہلے میں نے ایک ٹھنڈی پتلون کی دونوں جیبیں بھنے ہوئے چنے سے بھری تھیں تا کہ راستے میں اگر کھانے کو کچھ نہ ملے تو تھوڑے تھوڑے چنے کھا کر ہی گزارہ ہو جائے۔ پانی کی مجھے فکر نہیں تھی کہ کیونکہ اس علاقے میں ناریل کے درختوں کی بہتات تھی اور میں ناریل کا پانی پی کر زندہ رہ سکتا تھا۔ چلتے چلتے میں بانس کے درختوں میں کافی آگے نکل آیا۔ یہاں دیار اور ساگوان کے درختوں کا جنگل سا شروع ہو گیا۔

ساگوان کے درختوں کا یہ جنگل کوئی اتنا گھنا اور دشوار گزار نہیں تھا جتنے خوفناک اور گنجان جنگلوں میں سے ہم گزر کر آئے تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی اور درختوں کے جھنڈوں کے درمیان فاصلہ تھا۔ جہاں جنگلی جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ جب وقت کافی گزر گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ بھائی جان مجھے تلاش کرتے مایوس ہو چکے ہوں گے اور اسٹیمر میں سوار ہو کر چٹا گانگ روانہ ہو گئے ہوں گے یا اگلے اسٹیمر تک میرے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے ہوں گے تو میں ایک جگہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔

پانی اس جنگل میں بھی دور دور تک نظر نہیں آیا تھا۔ راستے میں بھی کوئی چشمہ یا ندی نالہ نہیں ملا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ ایک طرف مجھے ناریل کے دو تین درختوں کی چھتریاں اوپر کو اٹھی ہوئی دکھائی دیں۔ میں ان درختوں کے پاس چلا گیا۔ درختوں کے نیچے تین چار ناریل گرے پڑے تھے۔ ان میں ایک ناریل تازہ گرا ہوا لگتا تھا۔ میں نے اسے پتھر مار کر توڑا اور اس کا میٹھا پانی پی گیا۔

ناریل ابھی ہرا تھا۔ اس کے اندر ابھی گری نہیں بنی تھی۔ میں نے کچھ چنے کھائے اور تھوڑی دیر آرام کر کے روانہ ہو گیا۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ میرا رخ مشرق کی طرف ہی ہے۔ بوڑھی برمی عورت نے کہا تھا کہ راستے میں دریا بھی آتا ہے اور دریا پار پہلا گاؤں ساتیں کی ماسی کا گاؤں ہے اور ساتیں وہیں گئی ہوئی ہے۔ کیا منہ زور جذبہ محبت تھا' کسی حماقت میں نے کی تھی؟ اب اس حماقت کا خیال آتا ہے تو دل میں بڑی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ کاش مجھے محبت کا وہی احمقانہ جذبہ پھر عطا ہو جائے اور میں بار بار ایسی

حماقت کرسکوں۔ کبھی محبت کے منہ زور جذبات نے میری عقل کو ہنٹر مار مار کر بھگا دیا تھا۔ اس کے باوجود میں سب کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ کبھی عقل بھاگ جاتی اور محبت کے جذبوں کے ساتھ میں جو وقت گزارتا ہوں وہ میری روح کی جنت کے حسین ترین لمحے ہوتے ہیں۔

جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا اور شام آ رہی تھی مجھے یہی خیال پریشان کر رہا تھا کہ ساتیں کا گاؤں تو دریا پار ہے اور ابھی دریا کا دور دور تک نام ونشان نہیں ہے رات کہاں اور کیسے گزاروں گا؟ جب ہم لوگ قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو جنگل میں رات کو آگ جلا لیتے تھے۔ ویسے بھی بہت لوگ ہوتے تھے۔ رات الاؤ کے پاس کبھی سو کر کبھی جاگ کر گزر جاتی تھی۔ میرے پاس ماچس بھی نہیں تھی کہ رات کو کسی جگہ آگ کا الاؤ روشن کروں۔

آگ کی وجہ سے جنگلی جانور اور سانپ وغیرہ قریب نہیں آتے تھے۔ درختوں پر چڑھ کر سونا خطرناک تھا۔ تجربے نے ہمیں بتایا تھا کہ درختوں پر آدم خور سرخ چیونٹیوں اور سانپوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ چلتے چلتے ایک جگہ مجھے رل ترل رل ترل کی ایسی آواز آئی جیسے کسی جگہ پانی گر رہا ہو۔ میں اس آواز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کچھ فاصلے پر مجھے خاستری رنگ کی چٹان نظر آئی جس کے پیچھے سے پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ چٹان کے عقب میں جا کر دیکھا کہ ایک پہاڑی ڈھلان کے پتھروں میں سے پانی کی دھار نیچے چھوٹے سے تالاب میں گر رہی تھی۔

پانی دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں نے نیچے تالاب کے کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں ایک طرف مجھے کپڑوں کی پرانی دھجیاں سی پڑی نظر آئیں۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کسی نے پرانے کپڑے پھینکے ہیں۔ یہ ایک بنیان اور ایک جانگیہ تھا۔ پیچھے ٹین کا ایک خالی ٹرنک بھی پڑا تھا۔ ذرا آگے گیا تو ایک پگڈنڈی دیکھی جس کے اردگرد جھاڑیاں دبی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ پرانے کاغذ، گندے کپڑوں کے ٹکڑے اور ایک دو خالی سوٹ کیس پڑے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ یہاں سے مہاجروں کا کوئی قافلہ گزرا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں صحیح راستے پر جا رہا تھا۔ میں مہاجروں کی پھینکی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ مجھے گھاس پر ماچس کی ڈبیا پڑی نظر آئی۔ میں نے اسے جلدی سے اٹھالیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں صرف دو دیا سلائیاں رہ گئی تھیں۔ میں نے اسے غنیمت جان کر جیب میں رکھ لیا۔ یہ رات کو آگ کا الاؤ جلانے کے کام آ سکتی تھیں۔

ایک ٹوٹے ہوئے ٹرنک کے پاس رسی پڑی تھی۔ شاید اسی رسی سے ٹرنک کو باندھا گیا تھا۔ یہ گز سوا گز لمبی رسی تھی۔ میں نے رسی بھی اپنی کمر کے گرد لپیٹ لی۔ میرا خیال تھا شاید کسی جگہ کوئی چھری یا چاقو گرا پڑا مل جائے مگر یہ نہ ملا۔ میں وہیں پگڈنڈی کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے آگے جانا چاہیے یا اسی جگہ رات گزارنے کے لیے کوئی ٹھکانہ بنانا چاہیے۔ کیونکہ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ قافلے والوں کی گری پڑی چیزیں دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ آدمی نہ سہی مگر ان کی نشانیاں تو یہاں موجود ہیں۔ میں نے اسی جگہ رات گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

سب سے پہلے میں نے چل پھر کر ناریل کا ایک درخت تلاش کرلیا جس کے نیچے بہت سے ناریل

گرے پڑے تھے۔ ان میں تین تازہ ناریل اٹھا کر لے آیا۔ ایک ناریل توڑا اور اس کا پانی پیا۔ دیکھا کہ اس کی گری تیار تھی۔ تھوڑی سی گری اور تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے کھائے۔ سورج غروب ہوگیا اور جنگل میں اندھیرا چھانے لگا۔ میں اٹھ کر چشمے پر آ گیا۔ وہاں دوبارہ تازہ پانی پیا اور واپس آ کر ایک درخت کے نیچے بہت سی سوکھی لکڑیاں گھاس وغیرہ جمع کر کے اسے آگ لگادی۔ الاؤ روشن ہوگیا۔

میں درخت کے دو ایک سوکھے تنے گھسیٹ کر لے آیا اور انہیں الاؤ میں ڈال دیا۔ یہ تنے اتنے بڑے تھے کہ ساری رات جل سکتے تھے۔ وہاں دھواں ہوگیا۔ اوپر درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ رات ہوگئی۔ الاؤ کی روشنی میں مجھے آس پاس کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ آگ کی وجہ سے کسی درندے کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ الاؤ کے دھوئیں نے مچھروں کو بھی بھگا دیا تھا۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں وہیں گھاس پر الاؤ سے ذرا دور ہو کر لیٹ گیا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ خیال آتا کہ میرے اچانک گم ہوجانے سے بھائی جان اور ہمشیرہ کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ وہ امرتسر گھر پہنچ کر والد صاحب اور آپو جی کو کیا بتائیں گی کہ بھائی کو کہاں چھوڑ آئی ہیں۔ یہ سب کچھ مجھے اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب میں انہیں چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اب سوچنے اور پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کسی وقت خیال آتا کہ اگر کہیں سے شیر یا چیتا نکل آیا تو کیا کروں گا؟ کہاں جاؤں گا؟ آگ کے الاؤ میں چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ میں نے اوپر درخت کا جائزہ لیا اس درخت پر دھوئیں کی وجہ سے سانپ اور چیونٹیاں یقیناً غائب ہوگئی ہوں گی۔ میں درخت پر چڑھ سکتا تھا۔ پیدل چل کر سخت تھک گیا تھا۔ نیند کی غنودگی طاری ہوتی تو جلدی سے آنکھیں کھول دیتا کہ کوئی شیر چیتا نہ آ گیا ہو۔

صرف الاؤ میں لکڑیوں کے چٹخنے کی کسی وقت آواز آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جنگل پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بندر بھی آ سکتے تھے۔ جنگلی بندر غول کی شکل میں سفر کرتے ہیں۔ کسی انسان کو دیکھ لیں تو سارے کے سارے اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔ قافلے کے ساتھ پیدل چلتے وقت ایک جگہ بندر ایک بچے کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ اگر ایک آدمی کے پاس بندوق نہ ہوتی اور وہ اوپر تلے دو تین ہوائی فائر نہ کرتا تو بندر بچے کو نوچ نوچ کر ہڑپ کر چکا ہوتا۔ فائرنگ کے دھماکوں سے بندر نے ڈر کر بچہ وہیں پھینک دیا اور خود بھاگ گیا۔

ساری رات اسی طرح سوتے جاگتے گزر گئی۔ صبح اٹھ کر چشمے پر جا کر پہاڑی کے پتھروں کی درز میں سے گرتا پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور بھنے ہوئے چنے کھائے اور مشرق کی جانب جدھر سے سورج طلوع ہوا تھا چل پڑا۔ اب مجھے دریا کا انتظار تھا۔ دوپہر تک چلتا رہا۔ کبھی تھک کر بیٹھ جاتا تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر چل پڑتا۔

دوپہر کے بعد جب سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا مجھے درختوں کے درمیان سے دریا دکھائی دیا۔ بے اختیار دوڑتا ہوا دریا کے کنارے آ گیا۔ کافی بڑا دریا تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ وہاں کوئی پل نہیں تھا۔ کہیں کوئی کشتی بھی نہیں تھی۔ مجھے تیرنا آتا تھا مگر امرتسر کی نہروں میں تیرتا رہا تھا۔ دریا میں کبھی نہیں تیرا تھا۔ دریا کا اتنا چوڑا پاٹ دیکھ کر ویسے ہی دل پر خوف سا طاری ہو رہا تھا۔

میں دریا کے کنارے کنارے ایک طرف چل

پڑا۔ اس خیال سے کہ شاید آگے کوئی گھاٹ ہو جہاں سے دیہاتی لوگ دریا پار کرتے ہوں اور وہاں کوئی کشتی بھی ہو۔ میں کافی دور تک چلا گیا مگر کسی گھاٹ اور کشتی کا نشان نہیں تک نہیں تھا۔ ایک جگہ دریا میں ایک ندی نکل کر جنگل میں چلی گئی تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ شاید اس طرف ماہی گیروں کے جھونپڑے وغیرہ ہوں۔

ندی آگے جا کر پھر ایک دریا کے ساتھ مل گئی تھی۔ اس مقام پر جہاں ندی دریا کے ساتھ ملتی تھی درختوں کے بڑے جھنڈ تھے اور زمین اونچی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید جہاں زمین اونچی ہے اس کی دوسری طرف کوئی آبادی ہو اور وہاں گھاٹ بھی ہو۔ میں چڑھائی چڑھ کر اوپر درختوں کے پاس آیا اور دوسری طرف دیکھا تو مجھے ڈھلوان چھت والی ایک بارک دکھائی دی۔

بارک کے باہر کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہلے تو میں وہیں بیٹھ کر غور سے بارک کا جائزہ لینے لگا۔ کسی طرف سے کسی انسان کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی بڑی خاموشی تھی۔ شاید بارک خالی پڑی تھی۔ کسی انسان کی موجودگی کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

دل میں خیال آیا کہ نیچے اتر کر دیکھنا چاہیے۔ بارک کے اندر کیا ہے؟ ممکن ہے اس کی دوسری طرف کوئی آبادی اور دریا پار کرنے کا کوئی سبب بن جائے۔ میں نشیب میں اتر گیا۔ بارک کا برآمدہ خالی پڑا تھا۔ بارک کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے۔ مجھے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ انسان پر جب کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہوتی ہے تو اس کی چھٹی حس اسے ہلکا سا اشارہ کر دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آدمی کے احساسات پر چربی زیادہ چڑھی ہوئی ہو اور اسے قدرت کے اشارے کا احساس نہ ہو۔

میرے احساسات پر ابھی چربی نہیں چڑھی تھی۔ میں لڑکا سا تھا اور میرے احساسات بڑے نازک اور اتنے تیز تھے کہ دریا دور بھی ہو تو میں اس کے پانی کی مرطوب خوش بو محسوس کر لیتا تھا۔ میں نے آج بھی اپنے احساسات کو چربی چڑھنے سے بچایا ہوا ہے۔ اس کے لیے مجھے صرف ایک ہی پرہیز کرنا پڑتا ہے کہ میں دن میں صرف ایک بار ہلکی سی غذا کھاتا ہوں۔ گوشت نہیں کھاتا اور اتنی غذا بھی جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کھاتا ہوں۔ مجھے کھانا پسند نہیں اگر میرا بس چلے تو میں سوائے چائے اور پانی کے اور کچھ نہ پیوں۔ مگر مجبور ہوں جب تک زندہ ہوں کھانا کھانا ہی پڑے گا۔

چنانچہ مجھے اشارہ مل گیا تھا کہ تم کسی مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ لیکن سرکشی شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ میں نے خطرے کے سگنل کی زیادہ پروا نہ کی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ بارک کے اندر یا اگلی دوسری طرف کیا ہے میں بارک کے اندر چلا گیا۔ بارک کے اندر میں یہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ ہاں لکڑی کے شیلف دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ ان شیلفوں کے خانے ٹن فوڈ، سگریٹ، چائے، چینی اور بیئر کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لمبی سی میز پر بھی میٹھے دودھ، مارجرین، مکھن اور فروٹ کے ہوا بند ڈبے پڑے تھے۔ ایک دم خیال آیا کہ یہاں جاپان کی کوئی پلاٹون تعینات ہے اور یہ اس کی نافی یعنی کھانے پینے کی چیزوں کا اسٹور ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ برٹش انڈیا کی ہندوستان کی فوج کا کوئی اسٹور ہو۔ جاپانیوں کے قبضے کے بعد ہندوستانی فوج یہاں سے بھاگ گئی ہو اور اسٹور خالی پڑا رہ گیا ہو۔ میں نے

آگے بڑھ کر میز پر سے ٹن فروٹ کا ایک ڈبہ اٹھا کر دیکھا۔ یہ دیکھ کر میں خوف زدہ ہوگیا کہ اس پر انگریزی کے بجائے جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

میں نے باقی چیزوں پر نگاہ ڈالی سب پر جاپانی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں غلطی سے جاپانی فوج کے کیمپ میں آ گیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں اس وقت کوئی جاپانی فوجی نہیں تھا ورنہ میں مارا گیا تھا۔ میں نے صرف دودھ کا ایک ڈبہ اٹھایا اور بارک سے نکل کر دوڑ پڑا۔ جیسے ہی میں چڑھائی چڑھ کر درختوں میں آیا سامنے سے تین جاپانی فوجی چلے آ رہے تھے۔ اسٹین گنیں ان کے کندھوں پر لٹک رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو فوراً اسٹین گنیں میری طرف کر لیں اور میری جانب دوڑے۔ میں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ دوڑنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ میرا اور جاپانی فوجیوں کا دس بارہ قدموں کا فاصلہ تھا۔ اگر میں دوڑ بھی پڑتا تو انہوں نے پیچھے سے فائرنگ شروع کر دینی تھی۔ وہ زور زور سے جاپانی زبان میں آپس میں کچھ بول رہے تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور بارک کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میری شکل برمی لوگوں کی طرح نہیں تھی۔ میں شکل صورت سے صاف ہندوستانی لگتا تھا۔ اگرچہ میں کم عمر تھا یعنی اتنا بڑا نہیں تھا کہ انہیں مجھ پر انڈین ہونے کا شبہ ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے بارک میں بند کر دیں گے۔ لیکن وہ مجھے پکڑ کر بارک کی دوسری طرف لے گئے۔ اس طرف زمین نشیبی تھی۔ دریا کے کنارے درختوں میں فوجی کیمپ لگا ہوا تھا اور جاپانی سپاہی اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ وہاں ان کا ایک فوجی افسر کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ جاپانی فوجیوں نے مجھے اس کے آگے زمین پر بٹھا دیا اور اس کو جاپانی زبان میں کچھ کہنے لگے۔ کرسی پر بیٹھا ہوا جاپانی افسر نوجوان تھا۔ وہ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے شکستہ اردو زبان میں مجھ سے پوچھا۔

”تم کو کس نے ادھر کو بھیجا ہے؟“

مجھے اس جاپانی فوجی افسر کے صحیح جملے یاد نہیں۔ اردو وہ اسی قسم کی بولتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اسے شبہ تھا کہ جنگل میں کہیں برٹش آرمی کے انڈین سپاہی چھپے ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھے یہاں جاسوسی کرنے اور یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ میں جاپانی کیمپ میں جا کر جاپانی فوج کی نفری اور فوجی ساز و سامان کے بارے میں سراغ رسانی کر سکوں۔

میں نے اردو زبان میں جواب دیا۔

”میرا ہندوستانی فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں رنگون سے بھاگا ہوا مہاجر ہوں۔ سویلین ہوں۔ قافلے سے بچھڑ کر ادھر آ نکلا ہوں۔“

لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ جاپانی فوجی میری بات پر یقین کرتے۔ انہوں نے وہیں مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ میں رونے لگا اور کیا کرتا۔ میں آٹھویں جماعت کا اسٹوڈنٹ تھا جب امرتسر سے بھائی جان کے ساتھ رنگون آ گیا تھا۔ رونے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ مگر جاپانیوں پر میرے رونے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے تھپڑ مار رہے تھے۔ کمر پر مکے مار رہے تھے۔ میں زمین پر گر پڑا۔ ایک جاپانی سپاہی مجھے ٹھڈے مارنے لگا۔ جاپانی افسر نے اسے روک دیا۔ مجھے پانی پلایا گیا۔ میرا سارا بدن درد کرنے لگا تھا۔ میں نے پانی پی لیا۔ اس کے بعد جاپانی افسر نے بڑے پیار سے مجھ سے پوچھا۔

”اگر تم ہمیں بتا دو کہ یہاں ہندوستانی سپاہی کہاں چھپے ہوئے ہیں تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے بلکہ دریا پار کروا کر بنگال جانے والے اسٹیمر میں بٹھا دیں گے۔“

اس وقت تک جاپانی فوجیں جزائر انڈیمان پر بھی

قابض ہو چکی تھیں اور آسام بنگال کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ بلکہ کلکتے کے شام بازار پر جاپانی طیارے دو تین بم بھی گرا کر چلے گئے تھے۔ میں نے جاپانی فوجی افسر کے جملے سلیس اردو میں لکھے ہیں جب کہ یہ باتیں اس نے شکستہ ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں مجھ سے پوچھی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔

''میں کسی ہندوستانی سپاہی وغیرہ کو نہیں جانتا۔ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ رنگون میں اپنے بھائی کے پاس آیا ہوا تھا۔ رنگون سے لوگ بھاگے تو میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ بھاگ کر قافلے میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر ایک جگہ بدقسمتی سے قافلے سے بچھڑ گیا اور اس طرف نکل آیا۔''

جاپانی افسر نے سپاہیوں کو اپنی زبان میں کوئی آرڈر دیا۔ جاپانی سپاہیوں نے رسی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک خیمے کے اندر لے گئے جہاں لکڑی کے بہت سے بکسے یعنی کریٹ پڑے تھے۔ خیمے کے درمیان لوہے کا ایک کھمبا گڑھا ہوا تھا جس کے سہارے خیمہ کھڑا تھا۔ جاپانی سپاہیوں نے میرے ہاتھ کی رسی کھول دی اور ایک کریٹ میں سے لوہے کی زنجیر نکالی۔ زنجیر کا حلقہ میرے پاؤں میں باندھا۔ دوسرا حلقہ لوہے کے کھمبے میں ڈال کر اسے تالا لگا دیا اور باہر نکل گئے۔

میں جاپانی فوج کا قیدی بن چکا تھا۔

میری لڑکپن کی زندگی کا یہ عجیب و غریب اور بڑا بھیانک تجربہ تھا۔ میں کھمبے کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کافی وقت گزرنے کے بعد مجھے کسی اسٹیمر کے انجن اور اس کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر اسٹیمر کے انجن کی آواز بند ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہی دو جاپانی فوجی خیمے میں آئے۔ انہوں نے میری زنجیر کھول دی اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر خیمے کے باہر لے آئے۔

باہر آ کر میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک اسٹیمر کھڑا تھا جس پر جاپانی فوج کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جاپانی سپاہی مجھے اس اسٹیمر پر لے گئے اور ایک کیبن میں بند کر دیا گیا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ جاپانی سپاہی میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ میں نے رنگون میں بھائی جان کی زبانی سن رکھا تھا کہ جاپانی بڑے سنگ دل ہوتے ہیں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں اور تلوار سے ان کا سر دھڑ سے جدا کر دیتے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ جاپانی اپنے جنگی قیدیوں کا تلوار سے سر کاٹنا بہت پسند کرتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا کہ جاپانی کہیں لے جا کر تلوار سے میرا سر نہ کاٹ ڈالیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا اور جسم خوف سے ٹھنڈا پڑ جاتا۔ مجھے اس سے پہلے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

کبھی اس قسم کے حالات سے پالا ہی نہیں پڑا تھا۔ میں نے ابھی جنگی قیدیوں کے کیمپ سے فرار کی کوئی داستان بھی نہیں پڑھی تھی۔ ابھی تو جنگ ہو رہی تھی اور فرار کی داستانیں جنگ ختم ہونے کے کافی عرصے بعد رسالوں اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود بہ تقاضائے بشری میں نے جاپانیوں کی قید سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنی کر دی تھیں۔ زیادہ پیچیدہ ترکیبیں میرے ذہن میں نہیں آتی تھیں۔

میں یہی سوچتا تھا کہ کسی طرح کیبن سے بھاگ کر دریا میں چھلانگ لگا دوں۔ اس وقت اسٹیمر دریا میں چل پڑا تھا۔ میں کیبن میں بند تھا۔ مجھے دریا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اسٹیمر دریا کے پار جا رہا ہے یا دریا کے آگے کسی طرف جا رہا ہے۔ کیبن میں کوئی روشن دان وغیرہ بھی نہیں تھا۔ کیبن کے اندر مجھے کسی جگہ باندھا نہیں گیا تھا۔ میں کھلا تھا۔ کیبن بڑا چھوٹا سا تھا۔ میں نے بند

دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ کیبن کی دیوار کے ساتھ لکڑی کے بنچ بنے ہوئے تھے۔ میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ جسم درد کر رہا تھا۔ میں بنچ پر لیٹ گیا مجھے جاپانیوں نے بڑے زور زور سے چھتر مارے تھے۔ میرے منہ سے خون تو نہیں نکلا تھا ہونٹ بھی کہیں سے نہیں پھٹا تھا لیکن لگتا تھا کہ میری ایک آنکھ تھوڑی سوج گئی ہے۔

میرے پیٹ میں ٹھڈے مارے گئے تھے جس کی وجہ سے پیٹ میں کسی کسی وقت درد کی لہر اٹھتی تھی۔ اس وقت میں بڑا پچھتا رہا تھا کہ کیوں بھائی جان سے الگ ہو کر ساتیں کی تلاش میں جنگل میں اکیلا نکل آیا۔ میری جیب میں جتنے پیسے تھے وہ جاپانیوں نے نکال لیے تھے۔ بھنے ہوئے چنے پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ اسٹیمر ٹھک ٹھک کی آواز سے دریا میں چل رہا تھا۔ کسی کسی وقت وہ سیٹی بجا دیتا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے جاپانی مجھے قید کر کے جاپان لے جائیں اور وہاں کسی بہت بڑے جیل خانے میں ڈال دیں اور باقی ساری عمر کے لیے جیل میں قید ہو جاؤں۔

غرض کہ میرے ناپختہ ذہن میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات آ رہے تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے اسٹیمر ایک طرف کو گھوم گیا ہے۔ اس کی رفتار ہلکی ہونے لگی تھی۔ انجن کی آواز بھی ہلکی پڑ گئی تھی۔ اسٹیمر بار بار وسل دے رہا تھا۔ پھر اسٹیمر بہت آہستہ ہو گیا اور رک گیا۔ انجن بھی بند ہو گیا تھا۔ جاپانی سپاہیوں کی باہر سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ کیبن کا دروازہ کھلا۔ دو جاپانی سپاہی اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور کیبن سے باہر لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ اسٹیمر دریا کے دوسرے کنارے پر ایک جگہ لگا ہوا تھا۔ سامنے بہت سے فوجی کیمپ نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ جاپانی فوجی ادھر اُدھر چل پھر رہے تھے اور اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک فوجی ٹرک آ کر اسٹیمر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جاپانی فوجیوں نے مجھے کیبن سے اتار کر ٹرک میں بٹھا دیا۔ خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئے اور فوجی ٹرک کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جاپانی فوجی ٹرک دریا پار کے ایک جنگل میں اونچی نیچی سڑک پر اچھلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک جاپانی سپاہی میرے پاس بیٹھا تھا جس کی بیلٹ کے ساتھ میری ہتھکڑی کی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر دو جاپانی سپاہی بیٹھے تھے۔ وہ سگریٹ پی رہے تھے اور اونچی آواز میں ایک دوسرے سے جاپانی زبان مین باتیں کر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا تھا بلکہ دیکھا تھا کہ جاپانی بڑی اونچی آواز میں باتیں کرتے تھے۔ شاید جنوری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس موسم میں امرتسر میں بڑی سردی ہوتی تھی۔ مجھے اپنا شہر یاد آ رہا تھا۔ میں سردی میں پشمینے کی فر اوڑھ کر کمپنی باغ جایا کرتا تھا اور ٹھنڈی کھوئی کے پاس جہاں گلابوں کے تختے تھے وہاں بیٹھ کر چھپ کر سگریٹ بھی پیتا تھا اور گلاب کے پھولوں کو بھی دیکھا کرتا تھا۔ اگر میری بچپن کی پہلی محبت نے رف کاپی کے صفحے پر مجھے کوئی خط لکھا ہوتا تھا تو وہ خط بار بار پڑھا کرتا تھا۔

اس وقت اپنی بچپن کی پہلی محبت کو اور کمپنی باغ کے گلاب کے پھولوں کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ جنہیں میں بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھا۔ کبھی آرٹسٹ بھائی یاد آتا۔ کبھی والدہ یعنی آپو بی کا خیال آتا کہ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں رنگون سے نکل کر جاپانیوں کی قید میں آ گیا ہوں تو وہ

کس قدر پریشان ہوں گی۔ وہ تو سب رونے لگیں گے۔ بس یہی چھوٹے چھوٹے، پریشان کرنے والے، دکھ دینے والے خیالات تھے جو بار بار میرے ذہن میں آرہے تھے اور ٹرک جنگل میں دوڑتا جارہا تھا۔

برسات کا موسم نہیں تھا اس لیے ابھی تک کوئی بارش نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو دفعہ آسمان پر بادل ضرور آئے تھے مگر بغیر بارش برسائے گزر گئے تھے۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ٹرک جنگل میں ایک کھلی جگہ پر آکر رک گیا۔ ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں دونوں جانب بانس کی جھونپڑی نما بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک اونچی جگہ پر لکڑی کا بہت بڑا کیبن بنا ہوا تھا جس کے باہر جاپان کا سرخ گولے والا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ وہاں بہت سی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بارک میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاید وہاں فوج کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ مجھے کافی بھوک لگ رہی تھی۔ دن کافی گزر چکا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور گرمی اور حبس ہو رہا تھا۔ جاپانی مجھے ٹرک سے اتار کر اوپر جو بڑا کیبن تھا وہاں لے آئے۔

کیبن کے دروازے کے باہر ایک بوڑھا برمی برآمدے میں بیٹھا آہستہ آہستہ ایک رسی کھینچ رہا تھا۔ یہ رسی اس دیسی پنکھے کی تھی جو اندر کیبن کے کمرے میں چھت کے ساتھ لگا تھا۔ ایک لمبا بانس تھا جس کے نیچے ناریل یا شاید بانس کے پتوں کو جوڑ کر ایک لمبا پنکھا سا لگا دیا گیا تھا۔ بانس چھت کے ساتھ بندھا تھا۔ پنکھے کے بڑے بانس کے درمیان میں رسی بندھی تھی جس کا سرا کیبن کے باہر برآمدے میں بیٹھے بوڑھے برمی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ آہستہ آہستہ کھینچتا تو اندر پنکھا جھلنے لگتا تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔

پنکھے کے نیچے ایک گول مٹول گنجا جاپانی فوجی وردی پہنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان تھا۔ چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ جاپانی سپاہی نے جس کی بیلٹ کے ساتھ میری ہتھکڑی کی زنجیر بندھی تھی مجھے اس گنجے جاپانی افسر کے سامنے پیش کر دیا اور سیلوٹ مار کر اسے اپنی زبان میں کچھ بتانے لگا۔

جاپانی فوجی افسر نے قلم ایک طرف رکھ دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ نیام میں پڑی ہوئی ایک تلوار اس نے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک مجھے گھورنے کے بعد جاپانی فوجی افسر کرسی پر سے اٹھا۔ اس نے تلوار بڑے آرام سے نیام میں سے نکالی۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جاپانی اپنے قیدیوں کی گردن اڑا دیا کرتے ہیں۔ میرا حلق دہشت کے مارے خشک ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے سارے گھر والے، امرتسر والا گھر، محلہ اور کمپنی باغ میری آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گھومنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔

جاپانی فوجی افسر کے چہرے پر ایک مردہ سنگ دلی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے تلوار کی نوک میرے ماتھے سے لگائی۔ مجھے چکر آ گیا۔ میں نیچے گر پڑا۔ جاپانی فوجی افسر نے چلا کر جاپانی زبان میں جاپانی سپاہی سے کچھ کہا۔ جاپانی سپاہی کو میری ہتھکڑی کی وجہ سے جھٹکا لگا تھا اور وہ بھی میرے گرتے ہی اپنے آپ ایک طرف جھک گیا تھا۔ سپاہی نے مجھے ٹھڈا مار کر اٹھایا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں بڑی مشکل سے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا جاپانی فوجی افسر اس دوران کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے تلوار نیام میں ڈال لی تھی۔ مجھے گویا پھر سے زندگی مل گئی تھی۔ مجھے اپنے اوپر ایک ایسے موت کے قیدی کا گمان ہو رہا تھا جس کی رحم کی اپیل عین وقت پر منظور ہو گئی ہو اور اسے

پھانسی کے تختے سے اتار لیا گیا ہو۔

جاپانی فوجی افسر نے اشارے سے سپاہی کو کوئی حکم دیا۔ جاپانی سپاہی مجھے کھینچتا ہوا کیبن سے باہر لے گیا۔ اس نے مجھے ٹرک میں بٹھایا اور ٹرک ایک بار پھر جنگل میں آگے کی طرف چل پڑا۔ خوف کے مارے میرا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جاپانی فوجی افسر نے خود تو میری گردن نہیں اڑائی لیکن اس فوجی سپاہی کو آرڈر دیا ہے کہ وہ مجھے جنگل میں لے جا کر ہلاک کر دے۔ فوجی ٹرک درختوں کے درمیان جھاڑیوں اور گھاس پودوں کو کاٹ کر بنائی گئی غیر ہموار سڑک پر جا رہا تھا۔

یہ جنگل کا کوئی نیم پہاڑی سلسلہ تھا۔ ٹرک کبھی دائیں طرف مڑ جاتا کبھی بائیں طرف مڑ جاتا۔ راستے میں ایک ندی بھی آئی۔ پھر ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں بہت سے لوگ کلہاڑیوں سے درخت کاٹ رہے تھے۔ ان کے جسم لاغر تھے اور کپڑے گندے چیتھڑوں کی طرح ہو رہے تھے۔ ان آدمیوں کے درمیان جگہ جگہ جاپانی سپاہی اسٹین گن لیے کھڑے ان کے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ جو آدمی ذرا سستی دکھاتا جاپانی سپاہی اسے بے دردی سے اسٹین گنوں کے دستے اور ٹھڈے مارنا شروع کر دیتے۔

ٹرک ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میری ہتھکڑی اتار دی گئی اور مجھے دھکا دے کر درخت کاٹنے والے آدمیوں کی طرف دھکیل دیا گیا جو جنگی قیدی ہی ہو سکتے تھے۔ ان میں ہندوستانی بھی تھے اور کچھ گورے انگریز بھی تھے۔ سب کی بری حالت ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کئی روز سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ جو جاپانی سپاہی اپنی نگرانی میں قیدیوں کو مار مار کر ان سے کام لے رہے تھے ان میں سے ایک نے مجھے گردن سے دبوچ کر دوسرے سپاہی کی طرف دھکیل دیا۔ دوسرے جاپانی سپاہی نے میرے چہرے پر زور سے تھپڑ مارا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

ایک طرف تین چار کلہاڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے ایک کلہاڑی اٹھائی اور ایک درخت پر کلہاڑی چلانے لگا جس پر پہلے ہی سے ایک گورا قیدی کلہاڑی چلا رہا تھا۔ یہ درخت کٹ کر زمین پر گر پڑا تھا اور اس کے دو ٹکڑے کیے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے دو جاپانی سپاہی اسٹین گن لیے کھڑے تھے۔ میں زور زور سے کلہاڑی چلا رہا تھا۔

میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہاں چاروں طرف جاپانی فوجی اسٹین گن لیے موجود تھے۔ جنگل میں جہاں درختوں کی کٹائی ہو رہی تھی وہاں تین طرف مشین گنوں کے مورچے بنے ہوئے تھے۔ جہاں پر ہر مورچے میں دو دو سپاہی بیٹھے تھے۔ مسلح جاپانی فوجی قیدیوں کے درمیان بھی ان کے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمارے قریب کھڑا ایک سپاہی ذرا آگے کو گیا تو مجھے زور زور سے کلہاڑی چلاتے دیکھ کر گورا سپاہی بڑی دھیمی بلکہ مردہ آواز میں کہنے لگا۔

”آہستہ آہستہ کام کرو تھک جاؤ گے پھر کیا کرو گے۔“

وہاں جنگل میں گرمی اور حبس اتنا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں پسینے میں نہا گیا۔ میں نے گورے قیدی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ ذرا نرم کر لیا۔ میں نے اتنی مشقت کبھی نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی میرے بازو تھک گئے۔ پھر میں نے گورے قیدی کو دیکھا وہ اس طرح کلہاڑی چلا رہا تھا کہ ہر ضرب کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ڈال رہا تھا۔ میں بھی ایسا کرنے لگا۔ اس سے مجھے تھوڑا سا آرام مل گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور جنگل میں دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ ایک طرف سے سیٹی بجانے کی

آواز آئی۔ ہندوستانی اور گورے قیدیوں نے کلہاڑے زمین پر رکھ دیے اور وہیں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ میں نے بھی کلہاڑی ایک طرف رکھ دی اور قمیص سے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ ایک بار پھر زور زور سے سیٹی بجنے لگی۔ سیٹی کی دوسری آواز پر سارے قیدی اٹھ کھڑے ہوئے اور دو قطاریں بنانے لگے۔ میں بھی ایک قطار میں شامل ہو گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اگلی قطار میں میری عمر کے تین لڑکے بھی تھے۔ ان سب کے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے بھی قیدیوں والے کپڑے نہیں تھے۔

جاپانی سپاہی قیدیوں کو مارچ کراتے ایک لمبے بارک نما جھونپڑے میں لے گئے جہاں ایک لمبی میز پر ایک قطار میں ٹین کی تھالیاں پڑی تھیں۔

ایک جاپانی سپاہی نے بڑا سا پتیلا اٹھا رکھا تھا۔ دوسرا جاپانی سپاہی اس میں سے کڑچھے کی مدد سے ابلے ہوئے چاولوں کا ایک ایک کڑچھا ڈالتا جاتا تھا۔ قیدیوں کی تعداد چودہ پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ انہیں میز کے دونوں جانب کھڑے کر دیا گیا۔ جب سپاہی ساری تھالیوں میں چاول ڈال چکے تو ایک سپاہی نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی قیدی ابلے ہوئے چاولوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک جاپانی فوجی ٹین کے گلاس میں پانی ڈال کر ہر قیدی کے پاس رکھے جاتا تھا۔ ابلے ہوئے موٹے بد ذائقہ چاول تھے جن میں صرف نمک ڈالا گیا تھا۔ تھوڑے سے چاول تھے۔ سارے قیدی جلدی سے کھا گئے۔ ہماری بھوک نہیں مٹی تھی۔ سپاہی ہمیں کوئیک مارچ کراتے اینٹ گارے سے بنی ہوئی ایک لمبی بارک میں لے آئے جہاں زمین پر گھاس پھونس بچھا ہوا تھا۔ یہ قیدیوں کا بستر تھا۔ بارک کی ڈھلواں چھت اونچی تھی اور چاروں کونوں میں گیس کے ہنڈولے روشن تھے جن کی روشنی کافی تھی۔ بارک میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس میں سے گزار کر قیدیوں کو اندر لایا گیا تھا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ قیدی گھاس پھونس کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ان پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ کوئی بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بارک بند تھی جس کی وجہ سے اندر سخت حبس ہو رہا تھا۔ مچھروں نے بھی بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ میرے قریب ہی ایک ہندوستانی قیدی سپاہی گھاس پر آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور اردو میں پوچھا۔

"تم پنجابی ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں، میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔"

میں نے اسے ساری کہانی مختصر کر کے سنا دی وہ بولا۔

"میں آٹھ پنجاب انفنٹری کا رجمنٹ کا حوال دار خداداد خان ہوں۔ تمہیں اپنے بھائی بہن سے الگ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"جاپانی ہمارے سر تو نہیں کاٹیں گے؟"

حوال دار خداداد خان نے پنجابی میں آہستہ سے کہا۔

"اگر ہم نے بھاگنے کی کوشش کی تو جاپانی ہمیں دو زانو بٹھا کر ہمارا سر کاٹ دیں گے۔ میرے سامنے چار گوروں کے سر کاٹے گئے ہیں۔ اب کوئی قیدی بھاگنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بھاگ کر ہم جائیں گے بھی کہاں؟ بنگال یہاں سے ہزاروں میل دور ہے۔ یہاں کے جنگلی برمی لوگ بھی ہندوستانیوں کے دشمن ہیں۔ ہمیں پکڑ کر جاپانیوں کے حوالے کر دیں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہاں ہمیں کتنی دیر تک قید رکھا جائے گا؟"

"جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔ سونے کی کوشش کرو۔" حوال دار نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "صبح صبح پھر درخت کاٹنے ہوں گے۔"

مجھے مچھر کاٹ رہے تھے۔ میں حیران ہوں کہ تھوڑی دیر بعد حوال دار خراٹے لے رہا تھا۔ باقی قیدی بھی تقریباً سو گئے تھے۔ اصل میں سارے دن کی مشقت سے اس قدر تھک ٹوٹ گئے تھے کہ گھاس پھونس کے بستر پر گرتے ہی سو گئے تھے۔ مچھروں کے کاٹنے کے شاید وہ عادی ہو گئے تھے۔ خدا جانے کب تک میں مچھروں سے جنگ کرتا رہا اور کب مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔

اس جنگل میں؛ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ صبح سے شام تک دس بارہ دنوں تک درخت کاٹتا رہا۔ میرے کپڑے بھی چیتھڑے بن گئے تھے۔ ہمیں دوسرے دن گرم پانی سے نہلایا جاتا تھا۔ نہلانے کا طریقہ یہ تھا کہ جنگل میں ایک جگہ کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ ہمارے کپڑے نہیں اتارے جاتے تھے۔ پانی سے بھرے ہوئے ٹینک والا ایک ٹرک آ کر کھڑا ہو جاتا تھا اور پائپوں کی مدد سے ہم پر تھوڑی دیر بعد نیم گرم پانی ڈالا جاتا اور ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ اپنے کپڑوں کو ہاتھ سے مل مل کر نہائیں۔ اس طرح سے کپڑوں اور جسم دونوں کا میل کسی حد تک صاف ہو جاتا تھا۔ پانی میں جراثیم کش دوائی ملائی ہوتی تھی جس کی باقاعدہ بو آتی تھی۔

دس بارہ دنوں کے بعد ہم سے چھ سات قیدیوں کو نکال کر وہاں سے تھوڑی دور ایک ایسی جگہ پر لایا گیا جہاں ایک سڑک بن رہی تھی اور وہاں پہلے سے کچھ قیدی کدالوں سے زمین کھود رہے تھے اور کچھ قیدی ٹوکریوں میں ملبہ ڈھو رہے تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہمیں بھی ٹوکریاں دے دی گئیں۔ ہم زیر تعمیر سڑک پر سے ملبہ اٹھا کر دوسری طرف ایک کھائی میں پھینک آتے تھے۔ یہ کام درخت کاٹنے کے مقابلے میں کم مشقت کا تھا۔ قیدی آرام آرام سے کھونچوں اور کھپیوں سے ٹوکری میں ملبہ ڈالتے، ٹوکری سر پر اٹھا کر دوسری طرف کھائی کے کنارے تک جاتے اور دوسرے طرف ملبہ پھینک دیتے۔ میں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے قیدی کو چھوڑ کر جاپانی سپاہی نگرانی پر کھڑے تھے۔ جو ذرا سستی دکھاتا اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیتے تھے۔ دوپہر کے وقت ہمیں درختوں کے نیچے ایک طرف بٹھا کر کھانے کو نمکین چاول اور پانی وغیرہ دے دیا جاتا۔ اس کے بعد پھر ہماری مشقت شروع ہو جاتی۔ روز و شب کا سلسلہ بڑا اذیت ناک تھا۔ ہم میں سے کئی قیدی بیمار تھے جو قیدی زیادہ بیمار ہو جاتے انہیں جاپانی سب کے سامنے ایک طرف دو زانو بٹھا کر تلوار کے ایک ہی وار سے ان کی گردن اڑا دیتے۔ اس عبرت ناک انجام کو دیکھ کر بیمار بھی مستعدی سے کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مشقت کرتے کرتے زمین پر گرتے اور مر جاتے۔ اس طرح اپنے آپ مرنے کو وہ گردن کٹوا کر مرنے سے بہتر سمجھتے تھے۔

میرا نوجوان خون تھا۔ بدن میں طاقت تھی۔ میں باسی اور ناکافی غذا کھا کر بھی مشقت کرتا رہا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہم میں سے تین قیدیوں کو زیر تعمیر سڑک کے ایک ایسے مقام پر روڑی ڈالنے کے لیے لگا دیا گیا جہاں نیچے چھوٹی سی کھائی تھی اور چھوٹا سا تالاب بھی تھا۔ وہاں روڑی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہمیں وہاں سے روڑی ٹوکریاں بھی بھر کر لا کر سڑک پر ڈالنی پڑتی تھی۔ میرے ساتھ جو قیدی کام پر لگا تھا وہ حوال

دار خدا داد تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس وقت ہم ٹوکریوں میں روڑی ڈال رہے ہوتے تھے تو اوپر سڑک کے کنارے ایک جاپانی سپاہی اسٹین گن کا رخ ہماری طرف کیے ہماری نگرانی کر رہا ہوتا تھا۔

ہمیں یہاں کام کرتے دو دن گزرے تھے۔ تیسرے دن جب ٹوکری لے کر روڑی لینے کھائی میں اترا تو میں نے دیکھا کہ تالاب کے کنارے جھاڑیوں کے پاس دو برمی عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہاں جنگل میں کہیں کہیں کوئی دیہاتی عورت یا مرد کام کرتے نظر آجایا کرتے تھے۔ جاپانی انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق ٹوکری میں پتھر کی روڑی ڈالی اور اسے سر پر اٹھا کر اوپر سڑک پر جا کر سڑک پر بکھیر دی۔ خالی ٹوکری لے کر دوبارہ نیچے کھائی میں اتر گیا۔ تالاب پر جو برمی عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں ان کی پیٹھ ہماری طرف تھی اور وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں تھیں۔ میں اپنے کام میں لگا رہا۔ میرا تیسرا یا چوتھا پھیرا تھا کہ دو عورتوں میں سے ایک عورت اٹھی اور جھاڑیوں پر کپڑے جھاڑ کر ڈالنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے کا ایک رخ میری طرف مڑ گیا۔

اس کو دیکھ کر میں ٹھٹک سا گیا۔ جیسے اس عورت کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کب دیکھا تھا' کہاں دیکھا تھا یاد نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں اس عورت کی بھی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی ٹھٹک سی گئی ہے۔ میں بیلچے سے ٹوکری میں روڑی بھر رہا تھا اور برمی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ یہ برمی عورت یا لڑکی رنگون کے سول پیگوڈا کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پھول بیچنے والی لڑکی ساتین ہی تھی۔ میری نظریں بالکل دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ وہ لڑکی ساتین بھی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے ٹوکری میں روڑی ڈالتے ہوئے اوپر سڑک کے کنارے نگاہ ڈالی۔ جاپانی سپاہی وہاں موجود تھا مگر اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے ساتین کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ ساتین ذرا سا مسکرائی۔ اس نے بھی تھوڑا سا ہاتھ اٹھا کر میرے سلام کا جواب دیا۔

میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر حیران تھا کہ اس نے ہم دونوں کو ملایا بھی تو ایسے حالات میں کہ ہم ایک دوسرے سے کوئی بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ساتین نے مجھے ایک اور اشارہ تین بار کیا۔ میں اس کے اشارے کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے دور سے اشارہ کر کے سمجھا رہی تھی کہ میں کل اسی وقت پھر آؤں گی۔ اس کے فوراً بعد وہ دوسری برمی عورت کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے جھاڑیوں پر پھیلائے ہوئے دو تین گیلے کپڑے اٹھا لیے تھے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ اس نے خاص طور پر کل اس وقت آنے کا اشارہ کیوں کیا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات تو کر نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی میں اس سے کوئی بات کر سکتا تھا۔ اوپر سڑک کنارے جاپانی سپاہی موجود تھا اتفاق سے اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔ کبھی دل میں خیال آتا کہ ساتین کوئی ایسی غلطی نہ کر بیٹھے کہ جس کی وجہ سے میرے ساتھ وہ بھی کسی مصیبت میں پھنس جائے۔ اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے کل اسی وقت آنے کا اشارہ یونہی نہیں کیا۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں جاپانیوں کی قید میں ہوں اور وہ مجھ سے مشقت لے رہے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ساتین نے اپنے ذہن میں کوئی پروگرام بنا لیا ہو۔ میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

دن گزر گیا۔ رات کو میں تھک ٹوٹ کر گھاس کے بستر پر لیٹا تو آٹھ انفنٹری کا حوالدار خدا داد خان میرے قریب نہیں تھا ورنہ میں اس سے ضرور کوئی مشورہ کرتا کیونکہ لڑکی کو میری طرف اشارہ کرتے اس نے بھی دیکھا تھا۔ حوالدار خدا داد مجھ سے کافی دور دوسرے قیدیوں کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ سب قیدی دن بھر کی جفاکشی کے بعد اس قدر تھک جاتے تھے کہ گرتے ہی سو جاتے تھے۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا ذہن بار بار ساتین کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کل اسی وقت آنے کا اشارہ کیوں کیا تھا؟ اشارہ بڑا واضح تھا۔ میں بھی بہت تھکا ہوا تھا۔ آخر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ دوسرے دن مجھے یہ فکر لگ گئی کہ کہیں جاپانی میری ڈیوٹی کسی دوسری جگہ پر نہ لگا دیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ میری ڈیوٹی اسی گھاٹی میں لگائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ابھی کافی روڑی ڈھونے والی پڑی ہوئی تھی۔ ~~میں دل میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ~~ جس وقت ساتین آئے اس وقت جاپانی سپاہی کا منہ دوسری طرف ہو۔ میں اپنے کام لگ گیا۔ میں روڑی اٹھا اٹھا کر اوپر سڑک پر ڈالتا رہا۔ اس دوران جاپانی سپاہی سر پر مگر سڑک کے اوپر ہی کھڑا ہماری نگرانی کرتا رہا۔ ہمیں صبح کام پر لگا دیا جاتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ ساتین ابھی نہیں آئی تھی۔ ایک بار میں خالی ٹوکری اور بیلچہ اٹھائے گھاٹی میں اترا تو اچانک میں نے ساتین کو دیکھا۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی اور مجھے اشارے سے بلا رہی تھی۔ وہ اکیلی آئی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا جاپانی سپاہی کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں ٹوکری میں روڑی ڈالنے لگا۔ ساتین کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے جیسے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بھی اوپر جاپانی کو دیکھ رہی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جاپانی سپاہی سڑک سے ہٹ گیا۔ اب وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسے ہی جاپانی سڑک پر سے غائب ہوا ساتین دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لے کر ایک طرف کود پڑی۔

ساتین نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اپنے ساتھ مجھے بھی دوڑا رہی تھی۔ میں فرار ہونے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ اب واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس انتظار میں تھا کہ کب جاپانی سپاہی کی اسٹین گن کے فائر کی بوچھاڑ ہمارے جسموں کو چھلنی کرتی ہے۔ کیونکہ جاپانی سپاہی ایک منٹ کے لیے بھی ہمیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں فرار ہو جانا بھی چاہتا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ یہ معصوم سی دیہاتی لڑکی مجھے کہاں چھپا سکے گی؟ میرے فرار کا علم ہوتے ہی جاپانی ساتین کے گاؤں پہنچ جائیں گے اور نہ صرف مجھے پکڑ کر تلوار سے میری گردن اڑا دیں گے بلکہ گاؤں کی عورتوں مردوں سے بھی عبرت ناک انتقام لیں گے۔ کسی وقت خیال آتا کہ ساتین کا ہاتھ چھڑا کر واپس بھاگ جاؤں کسی وقت خیال آتا کہ ہو سکتا ہے یہ برمی لڑکی ساتین واقعی مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔ ہم نشیب میں پتھروں جھاڑیوں پر سے کودتے تیزی سے دوڑتے چلے جا رہے تھے

خدا جانے اس کا گاؤں وہاں سے کتنی دور تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے گاؤں لے جا رہی ہے یا کسی دوسری جگہ لے جا رہی ہے۔ اس معصوم سی برمی لڑکی نے مجھے اپنے خیال میں موت کے منہ سے ضرور نکال لیا تھا لیکن موت اب ہم دونوں کا پیچھا کر رہی تھی۔ میں ایک خطرے سے نکل کر اس سے زیادہ بھیانک خطرے کی طرف جا رہا تھا۔ دوڑتے

دوڑتے ہم ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پاس آ گئے۔ ہم دونوں کے سانس پھول گئے تھے۔ پھول بیچنے والی معصوم سی برمی لڑکی ساتین کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے اس بات احساس ہے کہ اس نے میری خاطر کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ یہ کون سا جذبہ تھا جس نے ساتین کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے موت کے منہ سے نکال کر لے جائے؟ کیا یہ محبت تھی؟ لیکن ہم نے کبھی ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی تھی۔ کیا یہ انسانی ہمدردی تھی؟ انسانی ہمدردی ہی ہو سکتی تھی۔ میں محبت کے معاملے میں کبھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوا۔ نہ اس زمانے میں شکار ہوا تھا۔ نہ آج کبھی اس خوش فہمی کا شکار ہوا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مجھے بہت محبت ملی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صرف عورت ہی میری محبت کا مرکز کبھی نہیں رہی۔ میری محبت کے ہزاروں مرکز ہیں۔ ہزاروں مقامات ہیں۔ یہ مقامات جنگلوں میں بھی ہیں۔ بارشوں میں بھی ہیں۔ چائے کی خیال افروز خوش بوؤں میں بھی ہیں۔ چیت و ساکھ کے مہینوں میں بھی خزاں کی ہواؤں میں درختوں سے جدا ہوتے زرد پتوں میں بھی ہیں اور بارش میں بھیگتی دوڑتی ریل گاڑی میں بھی ہیں اور حسن ابدال کے سرخ گلابوں اور پوٹھوہار کی دھریکوں کے کاسنی پھولوں اور پاک فوج کے شیر دلیر جوانوں کے جذبہ حب الوطنی میں بھی ہیں؛ جن کے میدان جنگ میں گرجتے نعرہ تکبیر اور یا علی کے نعروں سے دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

عورت کی محبت کے مقامات تو بدلتے رہتے ہیں لیکن میری محبت کے مقامات کبھی نہیں بدلے۔ وہ جیسے میرے بچپن، میری جوانی میں تھے ویسے ہی میرے بڑھاپے میں رہیں گے۔

ساتین مجھے ٹیلے کے پیچھے لے گئی۔ وہاں ایک جگہ لکڑیوں کا بہت بڑا انبار لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک جگہ سے لکڑیاں پیچھے ہٹائیں تو نیچے لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہوا تھا جس پر ناریل کی چھال پڑی ہوئی تھی۔ ساتین نے ناریل کی چھال ایک طرف کی اور تختہ اوپر اٹھا دیا۔ تختہ کے نیچے زینہ اترتا تھا۔ ساتین نیچے اتر گئی۔ اس نے شکستہ ہندوستانی زبان میں مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں نے پہلی بار اس کی زبان سے بڑی مشکل سے سمجھ میں آنے والی اردو میں ایک جملہ سنا تھا میں بھی نیچے اتر گیا۔ آگے ایک سرنگ لگتی تھی۔ اس کی چھت اونچی اور چوڑی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ساتین میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔ دس بارہ قدم چلنے کے بعد دھندلی سی روشنی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی سرنگ کی دیوار میں بنے ہوئے ایک دروازے سے آ رہی تھی۔ یہ ایک دالان نما کشادہ کوٹھری تھی جہاں زمین پر ناریل کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ دھندلی سی روشنی اوپر دیوار میں بنے ہوئے ایک گول روشن دان میں سے آ رہی تھی جس کی شاخیں کوٹھری میں آ رہی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لکڑی کے گول ڈرم پڑے تھے۔ ساتین نے مجھے بتایا کہ ان ڈرموں میں چاول اور ناریل کے کھوپے رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے ناریل کی چھال پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس لڑکی نے بڑی دلیری اور جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے کچھ اشاروں اور کچھ اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں سمجھایا کہ اس جگہ میں اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھوں۔ وہاں جاپانی نہیں آ سکتے۔ میں ساتین سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ایسے ٹوٹے پھوٹے شکستہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جو اس کی سمجھ میں آتے۔ پھر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ شکریے کے الفاظ نہ سمجھ سکی۔ اس نے اٹھتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا مفہوم میں یہی سمجھا کہ میں وہاں بے فکر

ہو کر بیٹھوں وہ تھوڑی دیر میں واپس آ رہی ہے۔ وہ چلی گئی۔

ساتین کے جانے کے بعد مجھے طرح طرح کے خدشات نے گھیر لیا۔ اس وقت تک جاپانیوں کو میرے فرار کا یقیناً علم ہو گیا ہوگا۔ وہ میری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔

قریب کا گاؤں پپی ہے جہاں ساتین اپنے گھر والوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ جاپانی اتنے بے وقوف نہیں۔ لکڑیوں کے ڈھیر پر اگر انہیں ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ اس کے نیچے کوئی تہہ خانہ نہ ہو تو پھر میرا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ میں نے اس نا سمجھ بھولی بھالی لڑکی کے پیچھے لگ کر اپنی زندگی انتہائی خطرے میں ڈال لی ہے۔ مجھے ایسی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کسی وقت خیال آتا کہ میں نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ جاپانیوں کی قید میں رہ کر سسک سسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔ اب اگر قسمت نے ساتھ دیا تو یہاں سے نکل بھی سکتا ہوں۔

میں ٹیلے کی سرنگ کی کوٹھری میں اکیلا بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر جاپانی مجھے نہ پکڑ سکے تو مجھے کس طرف جانا چاہیے۔ میں اس علاقے سے واقف نہیں تھا۔ اس سلسلے میں یہ برمی لڑکی ساتین ہی میری رہنمائی کر سکتی تھی۔ مگر ابھی تک خطرہ میرے سر سے ٹلا نہیں تھا۔ موت میرے سر پر برابر منڈلا رہی تھی۔ روشن دان میں سے دن کی جو روشنی آ رہی تھی وہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دن کافی گزر گیا ہے۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ ساتین مجھے وہاں چھپا کر چلی گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا۔ اٹھ کر کوٹھری میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے جی گھبرایا تو بیٹھ گیا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وقت کتنا گزر گیا ہے۔ روشن دان کی روشنی بھی دھیمی پڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد روشن دان میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی بھی غائب ہو گئی اور کوٹھری میں اندھیرا چھا گیا۔ اس روشن دان کا دم غنیمت تھا اس میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ یہی تازہ ہوا مجھے جینے کا حوصلہ عطا کر رہی تھی۔

باہر رات کا سماں تھا بڑی خاموشی تھی۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساتین کا گاؤں وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ خدا جانے جاپانی جب میری تلاش میں ساتین کے گاؤں میں آئے ہوں گے تو انہوں نے گاؤں والوں کے ساتھ کس قدر وحشیانہ سلوک نہیں کیا ہوگا لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے دل میں افسوس ضرور ہو رہا تھا۔ خدا جانے رات کتنی گزر چکی تھی کہ مجھے کوٹھری کے باہر سرنگ کے اندھیرے میں روشنی کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ میں جلدی سے دروازے کے پاس آ گیا۔ دروازے کے کواڑ نہیں تھے۔ میں نے سر تھوڑا سا باہر نکال کر دیکھا۔ سرنگ کے دہانے کی طرف سے ساتین موم بتی ہاتھ میں پکڑے چلی آ رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ میرے پاس آ کر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس نے موم بتی ایک پتھر کے اوپر لگا دی۔ تھیلا کھول کر اس میں سے رومال میں بندھی ہوئی سلور کی چھوٹی پتیلی نکالی اس میں ابلے ہوئے چاول اور مچھلی کا اچار تھا۔ مچھلی کا اچار برما میں گھروں میں بڑے شوق سے کھایا جاتا تھا۔ عورتیں اس کا اچار گھروں میں اس طرح ڈالتی ہیں جس طرح ہمارے ہاں خواتین گھروں میں آم کا اچار ڈالتی ہیں یا کبھی ڈالا کرتی تھیں۔ شیشے کی نسواری بوتل میں وہ میرے لیے پانی

لائی تھی۔ میں نے اچار کے ساتھ چاول کھائے' پانی پیا تو جان میں جان آ گئی۔ کئی دنوں کے بعد اس قسم کا کھانا کھانے کو ملا تھا۔

ساتیں خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے کچھ کہا جو میں سمجھ نہ سکا۔ اس کو ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بہت کم آتی تھی۔ تھوڑا سا بول کر باقی اشاروں سے وہ اپنا مطلب مجھے سمجھا دیتی تھی۔ اس نے مجھے تھوڑا تھوڑا بول کر اور زیادہ اشاروں سے بتایا کہ جاپانی اس کے گاؤں بھی آئے تھے۔ میں انہیں نہ مل سکا تو انہوں نے آدمیوں کو مارا پیٹا۔ جوان لڑکیوں کو گاؤں والوں نے پہلے ہی محفوظ جگہوں پر چھپا دیا تھا۔ گاؤں میں صرف بوڑھی عورتیں ہی تھیں۔ جاپانیوں نے انہیں زد و کوب کیا اور گاؤں میں جتنا چاول اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں اور بکریاں تھیں اٹھا کر لے گئے۔

میں نے ساتیں سے پوچھا۔

''ساتیں! میں ادھر کب تک پڑا رہوں گا؟''

وہ ہندوستانی ضرور سمجھ لیتی تھی مگر زیادہ بول نہیں سکتی تھی۔ کہنے لگی۔

''ابھی تھوڑا دیر اور رہے گا' ابھی تھوڑا دیر اور رہنا سکتا ہوگا۔''

اس کا یہ جملہ مجھے آج بھی پورا یاد ہے۔ میں چپ ہو گیا ساتیں نے برتن اٹھا کر کپڑے میں لپیٹے۔ پھر انہیں باندھ کر تھیلے میں ڈالا اور اشاروں سے کچھ بول کر بتایا کہ کل کسی وقت آئے گی لہٰذا اب تم آرام سے سو جاؤ۔ کچھ دیر میں اکیلا بیٹھا خدا جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو میں پسینے میں شرابور تھا۔ کوٹھری میں گرمی اور حبس تھا۔ مچھر الگ تنگ کر رہے تھے۔ اس گرمی حبس اور مچھروں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ میں ایک حساب سے میدان جنگ میں تھا اور وہاں اگر آدمی ان چیزوں کے بارے میں سوچنے لگے یا ان چیزوں کا خیال کرنے لگے تو لڑ نہیں سکتا۔ روشن دان میں سے ستاروں کی بہت ہی دھیمی دھیمی روشنی کا نیلا نیلا غبار سا اندر آ رہا تھا۔

خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ مچھر کاٹتے تو ایک دم سے آنکھ کھل جاتی۔ اسی طرح رات گزرتی چلی گئی۔ کسی وقت نظریں اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھ لیا۔ پھر روشن دان میں صبح سے پہلے کا ہلکا ہلکا نور سا جھلکنے لگا۔ صبح ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد کوٹھری میں دن کی دھیمی دھیمی سی روشنی ہو گئی۔ دھوپ کوٹھی میں نہیں آتی تھی۔ چھت والا روشن دان کسی خفیہ جگہ پر بنایا گیا تھا۔ دن کی روشنی ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ساتیں آ گئی۔ وہ میرے لیے تھیلے میں چاول اور کالی سیاہ کیتلی میں پانی کی بوتل لائی تھی۔ میں نے اس سے باہر کا حال پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ مجھے کتنے دن اور چھپے رہنا ہوگا۔ ساتیں نے مجھے سمجھایا۔ میں یہی سمجھا کہ مجھے دو ایک دن اور اس کوٹھڑی میں گزارنے ہوں گے۔ یہ اپنی طبیعت پر بڑا جبر کرنے والی بات تھی مگر مجھے ہر حالت میں ساتیں کی ہدایت کے مطابق چلنا تھا۔

اس تنگ و تاریک حبس آلود کال کوٹھری میں میں نے مزید دو دن کس طرح گزارے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ بہر حال ایک دن ساتیں میرے لیے کھانے کو سبزی اور ابلے ہوئے چاول لائی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ میں آج رات یہاں سے نکلنے کے لیے تیار رہوں۔ وہ اس رات مجھے وہاں سے نکالنے والی تھی۔ وہ چلی گئی تھی۔ جب رات ہو گئی اور کوٹھری کے روشن

دان میں دن کی روشنی بجھ گئی تھی تو ساتیں آ گئی۔ اس نے آتے ہی موم بتی روشن کر دی۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا تھیلا لائی تھی۔ اس نے تھیلے میں سے ایک میل خورے رنگ کی لنگی' ایک پوری آستینوں والی قمیص نکال کر دی اور کہا کہ میں اسے پہن لوں۔ میں نے پتلون اتار کر لنگی پہنی۔ اس نے خود میری قمیص کو جس طرح برما میں لوگوں کا پہناوا ہوتا ہے لنگی کے اندر کر دی۔ میرے سر پر زرد رنگ کا رومال باندھا۔ پاؤں میں پہننے کے لیے ربڑ کی ایک چپل دی۔ خدا جانے یہ اس کے گھر کے کس فرد کے کپڑے تھے۔ چپل میرے پاؤں میں کھلی تھی مگر میں نے پہن لی۔ اس نے مجھے کچھ اپنی اور کچھ شکستہ ہندوستانی میں کہا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آ جاؤں۔ میرے کپڑے اور برتن وغیرہ اس نے وہیں کوٹھری میں ہی رہنے دیے اور موم بتی ہاتھ میں لے کر میرے آگے آگے چلنے لگی۔

سرنگ سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے موم بتی بجھا کر وہیں پھینک دی۔ ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر مجھے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلے خود سرنگ میں سے باہر نکلی۔ اس کے بعد مجھے باہر آنے کو کہا۔ تین چار دنوں کے بعد تازہ ہوا میں سانس لیا تو ایسا لگا جیسے میں پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔ باہر رات کی ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ ساتیں میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف آگے کو دوڑ پڑی۔ برمی لوگوں کی طرح بندھی ہوئی لنگی میں مجھ سے دوڑا نہیں جا رہا تھا۔ میں گر پڑا۔ ساتیں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے لنگی گھٹنوں سے اوپر اٹھا لی اور چپل جو کھلی تھی پاؤں سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اب میں خوب تیز دوڑ سکتا تھا۔

ہم دوڑتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ اونچی نیچی زمین تھی۔ ہم ایک تنگ سی گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں ہم دوڑ نہیں سکتے تھے۔ میرے پاؤں میں نوکیلی شمینی گھاس چبھ رہی تھی۔ میں نے کھلی چپل دوبارہ پہن لی۔ ربر کی چپل کے اندر میرے پاؤں دو تین بار پھسلے پھر مجھے اس کے ساتھ چلنا آ گیا اور میں پاؤں دبا دبا کر رکھنے اور اٹھانے لگا۔ ساتیں مجھ سے دو ایک قدم آگے آگے چل رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رک کر مجھے دیکھتی اور ہاتھ سے جلدی چلنے کا اشارہ کر کے پھر تیز تیز چلنے لگتی۔ ہم کئی گھاٹیوں' برساتی نالوں اور کھڈوں میں سے گزرنے کے بعد ایک جگہ باہر نکلے تو سامنے ستاروں کی دھندلی روشنی میں دریا دکھائی دیا۔ ایک چھوٹی سی سمپان یعنی کشتی دریا کنارے کھڑی تھی۔ اس میں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے قریب جا کر ساتیں نے برمی زبان میں اسے کچھ کہا۔ اس آدمی نے برمی زبان میں ہی کوئی جواب دیا۔ اندھیرے میں سے ایک اور عورت نکل کر ساتیں کے پاس آ گئی۔ دونوں برمی زبان میں آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ اس عورت کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ ساتیں نے وہ تھیلا مجھے دے کر کچھ کہا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس تھیلے میں میرے لیے کچھ چیزیں ہیں۔ اس نے کشتی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ تھیلا میں نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ بوڑھا برمی ملاح کشتی کی رسی کھولنے لگا۔ میں نے ستاروں کی روشنی میں دیکھا کہ ساتیں ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اب نہ وہ مجھے کبھی دیکھ سکے گی نہ میں اسے کبھی دیکھ سکوں گا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ برمی ملاح نے کشتی کھولی اور اس میں بیٹھ کر چپو چلاتے ہوئے کشتی کو کنارے سے دور لے جانے لگا۔ کشتی پھول بیچنے والی معصوم برمی لڑکی ساتیں سے دور ہو رہی تھی۔

ساتیں مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ کروڑوں اربوں نظام ہائے شمسی کے روشن اور تاریک خلاؤں میں کروڑوں اربوں سالوں سے گردش کرتے ہوئے دو روشن ذرے تھوڑی دیر کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے اور ایک بار پھر کروڑوں اربوں سالوں کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ یہ جدائی کی اداس گھڑی تھی۔ ایک دوسرے کو جتنی دیر تک جتنی دور تک دیکھ سکتے ہو دیکھ لو۔ اس کے بعد نہ جانے کون سے خلاؤں میں کس نظام شمسی کے کون سے کرۂ ارض کی ارضی جنت میں ملاقات ہو۔ پھر نہ جانے ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی سکیں یا نہ پہچان سکیں۔ کوئی اور چہرہ ہو کوئی اور زبان ہو۔ کوئی اور خیال ہو۔

میں وی جھوک رانجھن دی جانا
نال میرے کوئی چلے
پیراں پوندی منتاں کر دی
جانا پیا ہن کلے
کہے حسین فقیر نمانا
سائیں سنہڑے گھلے

کشتی دریا میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ ساتیں کا چہرہ ستاروں کی دھند اور تاریکی میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہو گیا تھا۔ نہ میں اسے نظر آ رہا تھا نہ وہ مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ دریا کی سطح شیشے کی طرح ساکن تھی۔ اس شیشے میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک آسمان دریا کے اوپر تھا۔ ایک آسمان دریا کے اندر تھا۔ نہ کوئی دریا تھا نہ کوئی آسمان تھا۔ نہ کوئی کشتی تھی نہ میں تھا۔ محبت، محبت صرف محبت کا ایک خیال تھا جو ان گنت مسرتوں، لاکھوں اداسیوں، جدائیوں، وصالوں کی ایک نورانی لہر کی طرح کرہ ارض کے گرد جاری و ساری تھا۔ میں آنکھیں بند کیے سر جھکائے کشتی میں نہ جانے کب سے بیٹھا تھا کہ کشتی کو ایک دھچکا سا لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔ کشتی دریا کے دوسرے کنارے پر جا لگی تھی۔ میں ساتیں کا دیا ہوا تھیلا اٹھا کر کشتی سے اتر کر کنارے پر آ گیا۔ میرے سامنے کنارے کے ساتھ اونچے اونچے درختوں کی قطار رات کے اندھیرے میں سیاہ دیوار کی طرح کھڑی تھی۔ بوڑھے ملاح نے کشتی کو کنارے پر کھینچ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہیں سے واپس چلا جائے گا لیکن معلوم ہوا کہ ساتیں نے اسے بطور گائیڈ میرے ساتھ کر دیا تھا تاکہ وہ مجھے خطرناک علاقے سے نکال دے۔ مصیبت یہ تھی کہ بوڑھا برمی سوائے برمی زبان کے اور کوئی زبان نہیں بول سکتا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آ جاؤں۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اس سارے علاقے کا بھیدی تھا۔ رات کا وقت تھا۔ یہ جنگل اتنا دشوار گزار اور گھنا نہیں تھا۔ بوڑھا برمی بڑی روانی سے چلا جا رہا تھا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ہم نے ایک کھلا میدان عبور کیا جہاں قد آدم گھاس اگی ہوئی تھی۔

ایک برساتی نالے کو پار کیا۔ چھوٹے چھوٹے جنگلاتی ٹیلوں کے درمیان ہم دو ڈھائی گھنٹے چلتے رہے۔ بوڑھا بڑا سخت جان ثابت ہوا۔ آخر وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے میرے تھیلے کی طرف اشارہ کر کے برمی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے تھیلا کھولا تو اس کے اندر ایک بوتل بھی تھی۔ میں نے بوتل کا کارک کھول کر اسے سونگھا۔ برمی بوڑھا بار بار کچھ بولنے لگا۔ شاید وہ اپنی زبان میں کہہ رہا تھا کہ اس میں پانی ہے۔ میں نے ایک گھونٹ پیا وہ پانی ہی تھا۔ دو چار گھونٹ بوڑھے نے

بھی پیے۔ میں نے بوتل بند کر کے تھیلے میں رکھ دی۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ چلتے چلتے ہم ایک ٹیلے کے پاس آ گئے۔ میرا بوڑھا گائیڈ چڑھائی چڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد بوڑھے برمی گائیڈ نے ٹیلے کی دوسری طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا ٹیلے کی دوسری طرف رات کے اندھیرے میں ایک میدان سا دکھائی دیا جس میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ بوڑھا گائیڈ اپنی زبان میں کچھ کہہ بھی رہا تھا اور میدان کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔ تین چار بار اشارے کرنے اور میری سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں کچھ کہنے کے بعد وہ بڑے آرام سے مجھے چھوڑ کر ٹیلے کی ڈھلان پر نیچے اترنے لگا میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنی طرف سے وہ مجھے بتا گیا تھا کہ آگے مجھے کس طرف جانا ہے اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آگے مجھے کس طرف جانا ہے۔ اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے جاپانیوں کا خطرہ نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو بوڑھا برمی مجھے چھوڑ کر نہ جاتا لیکن معاملہ اس کے الٹ بھی ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سامنے نشیب میں دور تک پھیلے میدان کو تکتا رہا پھر اٹھا اور اللہ کا نام لے کر چلنا شروع کر دیا۔

میرا کام اس وقت صرف چلنا تھا۔

چلتے چلتے کہاں کہاں سے گزرا؟ کیسے کیسے گھاس کے میدان آئے۔ پتھریلے میدان آئے، جہاں نوکیلی چٹانیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کئی کئی سو گز لمبی پتھروں کی سلیں آئیں جو ترچھی ہو کر زمین پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اور جن کی تاریک تہوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ جنگل آئے جن کے درختوں کی چھتریاں آسمان تک چلی گئی تھیں۔ کہیں کوئی جھونپڑیوں والا چھوٹا سا گاؤں آ جاتا۔ نیم عریاں جنگلی مرد اور عورتیں اور ان کے بچے باہر نکل کر مجھے حیرت سے دیکھتے۔ ان سے مجھے تھوڑا بہت کھانے کو مل جاتا۔ میرا لباس گندا ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مجھ میں اور جنگلی آدمیوں میں تھوڑا سا فرق ہی رہ گیا تھا۔ حبس اور دھوپ کی گرمی سے میرا رنگ گہرا سانولا ہو گیا تھا۔ پاؤں چلتے چلتے سوج گئے تھے۔ جوتے کا ایک پاؤں پھٹ گیا تھا۔ میں نے کرتے کی لیر پھاڑ کر اس کو پاؤں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ یہی خوش قسمتی کم نہیں تھی کہ میں زندہ بچ گیا تھا۔ کسی سانپ نے مجھے ڈسا نہیں تھا۔ راستے میں کسی قاتل ڈاکو سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ قسمت میں ابھی زندہ رہنا تھا اس لیے زندہ تھا۔ آخر رنگون سے نکلتے ہوئے مہاجروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مل گیا۔ قافلے میں بوڑھے، عورتیں اور بچے بیل گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے۔ مجھ میں چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک مسلمان سورتی میمن نے مجھے گاڑی پر بٹھا دیا۔ دو راتوں اور دو دنوں کے سفر کے بعد یہ قافلہ بنگال کے سرحدی شہر کا کسز بازار پہنچ گیا۔ یہاں سے تمام مہاجرین کو ٹرکوں اور لاریوں میں بٹھا کر چٹا گانگ پہنچایا گیا۔ چٹا گانگ میں تین چار انگریز افسر مہاجرین کی خود نگہداشت کر رہے تھے۔ یہاں بہت بڑا کیمپ لگا دیا گیا تھا۔ یہاں مہاجرین کے لیے کھانے پینے کو بہت کچھ تھا۔ چٹا گانگ سے ریل گاڑیوں کے ذریعے مہاجرین کو کلکتے کے اسٹیشن ہوڑہ پہنچایا جا رہا تھا۔ جہاں سے ریل گاڑیاں مہاجرین کو لے کر ہندوستان کے مختلف شہروں کو جاتی تھیں اور مہاجرین کو ان کی منزل تک پہنچاتی تھیں۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے نے کرایہ معاف کر دیا تھا۔ مہاجرین جس شہر تک چاہیں بغیر ٹکٹ سفر کر سکتے تھے۔

میں بھی ایک ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر امرتسر پہنچ

گیا۔ بھائی جان کیپٹن ملک اور ہمشیرہ کب امرتسر اور کس حال میں پہنچیں اور راستے میں انہیں کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں یہ ایک الگ داستان ہے۔ امرتسر کی آب وہوا نے مجھے پھر سے زندہ کردیا۔ صحت مند کردیا۔ اس قابل کردیا کہ میں ایک بار پھر گھر سے بھاگ کر اپنی آوارہ گردیاں شروع کرسکتا تھا۔ اس بار مجھ پر مس نسیم بانو کے عشق کا بھوت سوار ہوگیا۔ مس نسیم بانو اس زمانے کی مشہور فلم ایکٹریس تھی اور فلم ''میں ہاری'' کی ہیروئن تھی۔ اسے اس فلم میں دیکھا اور میں اپنا دل ہار بیٹھا۔ بچپن کے عشق شتر بے مہار کی طرح ہوتے ہیں۔ ایسے اونٹ کا کوئی پتا نہیں ہوتا کہ کس طرف منہ اٹھا چل پڑے گا کہاں بیٹھ جائے اور بیٹھا بیٹھا اٹھ کر کس طرف کو چل پڑے گا۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ پہلی نظر میں عشق ہوگیا۔ نہ میں نے یہ سوچا کہ عشق کیا ہے جو مجھ پر سوار ہوگیا ہے اور نہ عشق نے سوچا کہ میں بھوت بن کر کس کے سر پر سوار ہو رہا ہوں۔ میں نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ بمبئی جا کر مس نسیم کے دربار میں محبت کی عرض داشت پیش کی جائے۔ نہ یہ سوچا کہ اتنے بڑے اجنبی شہر میں جا کر کہاں ٹھہروں گا؟ نہ یہ سوچا کہ بمبئی جانے کا کرایہ اور وہاں ٹھہرنے کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ جیب میں ایک پیسا بھی نہیں تھا۔ سوچا گھر سے کچھ پیسے چوری کیے جائیں۔ چوری کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ شیطان نے دل ودماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ کیوں کہ والد صاحب کے کسی دوست سے والد صاحب کا نام لے کر کچھ روپے حاصل کیے جائیں۔

یہ خیال بڑا اچھا لگا۔ ہمارے محلے میں دو بھائی کشمیری شالوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے نام شمس دین اور قمر دین تھے۔ ذات ان کی ترنبو تھی۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں بھائیوں نے انارکلی میں ایک دکان الاٹ کروا کر ترنبو ہاؤس اس کا نام رکھا تھا اور کشمیری شالوں کا بزنس شروع کردیا تھا۔ اس وقت دونوں بھائی ہمارے محلے میں کاروبار کرتے تھے۔ قمر دین ہمارے والد صاحب کا بڑا دوست تھا۔ میں نے اس سے فراڈ کرنے کا فیصلہ کرلیا چنانچہ جس روز مجھے امرتسر سے بمبئی بھاگ کر جانا تھا اس روز دن کے آٹھ بجے کے قریب میں قمر دین کے گھر گیا۔ اس وقت قمر دین مسواک کر رہا تھا۔ میں نے سلام کیا اور کہا۔

''ابا جی کے پاس کچھ کاروباری آدمی بیٹھے ہوئے ہیں وہ انہیں کچھ رقم دے رہے تھے کہ سو روپیہ کم پڑ گیا ہے۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ باؤ قمر دین صاحب سے جا کر سو روپیہ لے آؤ۔''

قمر دین بڑا سادہ دل انسان تھا۔ اس نے بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر الماری میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دے دیا۔ میں نوٹ جیب میں ڈال کر قمر دین کے مکان سے باہر نکلا تو قمر دین کے دل میں خیال آ گیا کہ یہ لڑکا حمید کہیں اپنی طرف سے سو روپیہ لے کر تو نہیں جا رہا۔ چنانچہ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر مسواک کرتا میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے بھی اسے دیکھ لیا کہ یہ شخص میرا پیچھا کر رہا ہے کہ دیکھتا ہوں سو روپیہ اپنے والد صاحب کو جا کر دیتا ہے یا نہیں۔ میں نے سو روپے کا نوٹ لے کر اپنے والد صاحب کے پاس تو جانا نہیں تھا۔ قمر دین کو اپنا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ نسیم بانو کے عشق نے جہاں میری عقل پر پردہ ڈالا ہوا تھا وہاں میرے اندر ایک طاقت بھی بھر دی تھی۔

جس بازار سے آہستہ آہستہ اپنی طرف سے بڑی بے فکری کے ساتھ گزر رہا تھا وہ ہماری گلی کے عقب میں واقع تھا اور اسے چیل منڈی کہتے تھے کیونکہ یہاں چیڑھ کے درختوں کے شہتیر فروخت ہوتے

تھے اور پنجابی میں چیڑھ کو چیل کہتے ہیں۔

آگے جا کر بازار کی شاخیں ہو جاتی تھیں۔ ایک شاخ دائیں جانب ہمارے والد صاحب کے پاس جاتی تھی اور دوسری شاخ پیلے اسپتال کی طرف جاتی تھی۔ بازار کے دوراہے پر آ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا قمر دین برابر میرا تعاقب کر رہا تھا۔ بس پتا نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں نے وہیں سے چھوٹ لگائی اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑتا ہوا پیلے اسپتال کے آگے سے ہوتا ہوا مہان سنگھ کے دروازے سے باہر آ کر شریف پورے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔ مجھے یاد ہے میری قمیص کی جیب میں بڑی خوب صورت پنسل تھی جو اچھل کر نیچے گر پڑی مگر میں اسے اٹھانے کے لیے بالکل نہ رکا۔

میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ قمر دین بھی میرے پیچھے دوڑ پڑا ہے یا نہیں۔ دوڑتے دوڑتے میں جی ٹی روڈ پر آ گیا اور شریف پورے کے سامنے سے ہوتا ہوا مسلم ہائی اسکول سے بھی آگے نکل کر نندہ بس سروس کے اڈے پر آ گیا۔ رک کر پیچھے دیکھا۔ قمر دین میرا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ نندہ بس سروس کے اڈے سے لاہور کو لاریاں چلا کرتی تھیں۔

لاہور میں کراؤن بس سروس اور امرتسر میں نندہ بس سروس اس زمانے کی بڑی مشہور بس سروسز تھیں۔ امرتسر میں اس کے مقابلے میں امرتسر پٹھان کوٹ بس سروس تھی جو مسلمانوں کی بس سروس تھی۔ ان کی لاریاں امرتسر سے پٹھان کوٹ، ڈلہوزی اور سری نگر کی طرف چلا کرتی تھیں۔ اس بس سروس کو ایک سوسائٹی چلاتی تھی جس میں ہمارے محلے کے حاجی حسن کی دو لاریاں تھیں۔

حاجی صاحب کا مکان چیل منڈی میں تھا۔ حاجی صاحب کی بیوی کو ہم آپو جی کہا کرتے تھے۔ سرخ و سپید بڑے باوقار چہرے والی خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ ایک المیہ ہوگیا۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام اختر تھا۔ اختر بڑا خوب صورت گورا چٹا کشمیری لڑکا تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی آٹھ دس سال کی ہوگی کہ جی ٹی روڈ پر ایک لاری کے نیچے آ کر اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اس کے ماتھے پر ایک سرخ لاٹ ہوا کرتی تھی جس کو بعض لوگ منحوس اور بعض بڑی خوش نصیبی کی علامت کہا کرتے تھے۔ اختر کی موت کے صدمے سے آپو جی ذہنی توازن کھو بیٹھیں۔ میں نے اس جلالی چہرے والی باوقار کشمیری خاتون کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ سفید برقع پہنے، برقعے کا نقاب الٹے، محلے کی گلیوں بازاروں میں پھرا کرتی تھیں اور ہر ایک سے پوچھتی تھیں کہ

''وے میرا اختر تو تم نے نہیں دیکھا؟''

حاجی حسن صاحب گرمیوں میں اپنی لاری محلے میں لا کر کھڑی کر دیتے اور محلے کے لوگ اس میں سوار ہو جاتے۔ کوئی روغنی روٹیاں لگوا کر اور کوئی آلو گوشت کی دیگ پکوا کر اور کوئی لنگڑے آموں کی ٹوکریاں موٹر میں رکھوا لیتا اور حاجی حسن خود لاری چلاتے۔ بڑی نہر جسے ہم بجلی والی نہر کہا کرتے تھے پر لے جاتے اور وہاں سارا دن باغ کی سیر ہوتی۔

بڑے لوگ بڑی نہر میں نہاتے۔ ہم چھوٹی نہر یعنی سوئے میں پل پر سے چھلانگیں لگاتے تھے۔ میں بھی اپنے پہلوان والد صاحب کے ساتھ نہر پر باغ کی سیر کرنے جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہمارے سب گھر والے لاری میں بیٹھے تھے۔ والد صاحب سائیکل پر لاری کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ اتنی زور سے سائیکل چلاتے تھے کہ آگے بڑھ کر چلتی لاری کے پیچھے دروازے سے لٹکتی ہوئی رسی کو پکڑ لیتے اور پھر سرکس کے کرتب دکھانے والوں کی طرح ایک

ہاتھ چھوڑ دیتے اور سائیکل اپنے آپ کو لاری کی رفتار کے ساتھ پیچھے پیچھے آتی تھی۔

والد صاحب کا بدن بڑا خوب صورت اور باڈی بلڈروں کی طرح تھا۔ بڑی نہر کے کنارے آم کے درختوں کے نیچے دریاں بچھ جاتیں۔ آموں کی ٹوکریاں رسیوں سے باندھ کر نہر کے ٹھنڈے پانی میں لٹا دی جاتیں۔ والد صاحب بڑی نہر کے جی ٹی روڈ والے پل سے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور پھر بہاؤ کے مخالف تیرتے ہوئے دور ریل کے پل تک نکل جاتے اور اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے تیرتے ہوئے واپس آتے۔ ایک بار میں نے نہر کے کنارے ایک سکھ کی لاش دیکھی۔ اس کی آدھی گردن کٹی ہوئی تھی۔ لاش کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ پولیس نے لاش کو نہر سے نکال کر آم کے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر رکھا ہوا تھا اور ایک سپاہی لاش کی تصویریں اتار رہا تھا۔

میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ چھوٹی نہر کے چھوٹے پل اور پلکے مینار کے اوپر سے چھلانگیں لگاتا تھا اور نہر میں تیرتا ہوا آگے چلا جاتا۔ جہاں نہر کی دونوں جانب ناشپاتیوں کے چمکیلے پتوں والے درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ میرے خدا! کیا درخت تھے کیا رنگ تھا ان کا۔ دھوپ میں جب ہَوا چلتی تو پتے جھل مل جھل مل کرتے تھے۔ کئی درختوں کی شاخوں پر چھوٹی اور بڑی لمبوتری سبز سبز ناشپاتیاں لگی ہوتی تھیں۔

ناشپاتی کے یہ باغات نہر کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلے گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نہر اور اس کے درخت آگے کمپنی باغ کی طرف نکل جاتے ہیں مگر میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ یہ نہر اور اس کے درخت بہشت بریں کے کسی باغ کی طرف جاتے ہیں جس باغ کو سوائے ان درختوں اور اس نہر کے اور کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔

خدا جانے کیا یاد آ گیا کہ میں نندہ بس کے لاریوں کے اڈے سے امرتسر کی بڑی نہر اور ناشپاتیوں اور آموں کے باغ کی طرف نکل آیا۔ جہاں برسات کی بھیگی ہوئی راتوں میں کوئلیں بولا کرتی تھیں اور اس زمانے کی راتیں اتنی خاموش ہوتی تھیں کہ ان کوئلوں کی آواز ہمارے مکان کی چھت تک سنائی دیا کرتی تھیں۔ خواب کی دنیا سے نکل کردہ نہریں اور باغ امرتسر کی سرزمین پر آئے تھے مسلمانوں کے وہاں سے ہجرت کر کے آنے کے بعد واپس خواب کی دنیا میں چلے گئے تھے۔

میں نندہ بس سروس کے اڈے پر واپس آتا ہوں میں گھر سے بھاگ کر ایک سو روپے لے کر بمبئی جا رہا تھا۔ سو روپے کا چرایا ہوا نوٹ میری جیب میں تھا۔ اگر قمر دین میرے پیچھے نہ لگتا تو میں وہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن جاتا اور ساڑھے نو بجے والی فرنٹیئر میں سوار ہو کر سیدھا بمبئی کی طرف بھاگ جاتا لیکن قمر دین صاحب نے میرا پیچھا کر کے مجھے بے راہ کر دیا۔ نندہ بس کے اڈے پر لاہور جانے والی لاری بالکل تیار تھی۔ لاری مسافروں سے بھر چکی تھی اور آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی اور ایک آدمی بس کے پیچھے لٹکا ہوا آواز لگا رہا تھا۔

”چلو کوئی سواری لاہور......؟“

اس زمانے میں لاریوں کی سیٹیں آمنے سامنے ہوا کرتی تھیں اور دروازے لاریوں کے پیچھے ہوا کرتے تھے میں دوڑ کر لاری کے دروازے کو پکڑنے لگا تو آوازیں لگانے والے آدمی نے کہا۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)